حرفِ معتبر

(اکیسویں صدی میں ادبی اداریہ نویسی کی نئی جہت)

سیّد منصور عاقل

پروفیسر ڈاکٹر محمد معز الدین

‘‘منجملہ دیگر محاسن، عاقل صاحب کا تحریر کردہ ہر اداریہ ادبی اداریہ نویسی کی تاریخ کا سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ وہ نہایت سلیقے اور شائستگی کے ساتھ خوبصورت زبان اور دلپذیر اُسلوب میں عصرِ حاضر کے ادبی میلانات، مسائل و افکار اور بسا اوقات خود اہل قلم کے حوالے سے بعض تنقیدی نکات کو اپنے مخصوص فکر انگیز اور منفرد طرز بیان میں پیش کر دیتے ہیں۔’’ (ماخوذ)

حرفِ معتبر

(اکیسویں صدی میں ادبی اداریہ نویسی کی نئی جہت)

سیّد منصور عاقل

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ

نام کتاب	حرفِ معتبر
موضوع	ادبی اداریہ نویسی (۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۳ء سہ ماہی 'الاقرباء' میں مطبوعہ اداریوں کا مجموعہ)
مصنف	سیّد منصور عاقل
سال اشاعت	۲۰۱۳ء
مطبع	فیض الاسلام پرنٹنگ پریس۔ راولپنڈی
ناشر	مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
سرِ ورق	ظفر محمود
قیمت	۶۰۰ روپے

رابطہ
مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن
۱۰۲۔ سٹریٹ ۱۱۰ سیکٹر جی۔ ۱۱/۳۔ اسلام آباد
ٹیلیفون: ۲۲۲۱۶۷۰ (۰۵۱)
سیل: ۰۳۰۰۔ ۵۱۰۰۱۴۵

انتساب

اپنے والدین کے نام جن کے فیضانِ تربیت نے مجھے
قرطاس وقلم کی عظمت کا شعور بخشا

فہرست

نمبر شمار	ترتیب		صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	جناب امین راحت چغتائی	۸
۲	الاقرباء کے اداریے	جناب محمود اختر سعید	۲۲
۳	تعارف مصنف	جناب افتخار عارف	۳۷
۴	گزارشِ احوالِ واقعی	سیّد منصور عاقل	۴۰
۵	تمنا کا پہلا قدم		۴۵
۶	قرطاس وقلم کی آزمائش		۴۷
۷	قومی ورثہ کا تحفظ		۵۰
۸	قومیت کے اجزائے ترکیبی میں اُردو زبان کی اہمیت		۵۳
۹	تصنیف واشاعت کے مسائل		۵۶
۱۰	ادب میں سرقہ وخیانت کے مسائل		۵۹
۱۱	اردو میں غیر ملکی زبانوں سے تراجم		۶۲
۱۲	ادب میں تطہیر کا عمل		۶۵
۱۳	’ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے‘		۶۸
۱۴	ادب اور ’’نظریہ ضرورت‘‘		۷۱
۱۵	’ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں‘		۷۳
۱۶	پڑیئے گر بیمار۔۔۔		۷۶
۱۷	قلم کشانِ ادب وصحافت		۷۹
۱۸	بین المملکتی ادب		۸۲

۱۹ مغرب میں اُردو زبان و ادب کے امکانات ۸۵
۲۰ مافیا ۸۹
۲۱ ‘ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا’ ۹۲
۲۲ بین الاقوامی اردو کانفرس۔۔ افسوں بھی افسانہ بھی ۹۵
۲۳ اہلِ قلم اور ذرائع ابلاغ ۱۰۲
۲۴ عالم کی موت ۱۰۵
۲۵ ‘کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار’ ۱۰۸
۲۶ معاصر ادب میں فکری و نظریاتی اعتدال کی ضرورت ۱۱۱
۲۷ تعلیم اور قومی تشخص۔۔ نظام و نصاب کے مسائل ۱۱۴
۲۸ ‘غزالاں تم تو واقف ہو۔۔۔!’ ۱۲۰
۲۹ ادب کا نوبل انعام۔۔۔ معیار و ملحوظات ۱۲۴
۳۰ ‘ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے’ ۱۲۸
۳۱ اُردو۔۔۔ مخالفوں اور منافقوں کے درمیان ۱۳۰
۳۲ ادب اور اظہارِ رائے کی آزادی ۱۳۵
۳۳ ‘چراغ تیز ہوا نے بجھا دیئے کیا کیا’ ۱۳۹
۳۴ ۲۰۰۸ء۔۔۔ زبانوں کا بین الاقوامی سال ۱۴۴
۳۵ پاکستان میں اُردو ادبی تحقیق کا مستقبل ۱۴۹
۳۶ نظامِ تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات ۱۵۴
۳۷ ‘چو کفر از کعبہ برخیزد۔۔۔!’ ۱۵۸
۳۸ عظیم مستشرق اور مبلّغِ اردو رلف رسل کی رحلت ۱۶۱
۳۹ رسم الخط کے مباحث اور اردو کی تہذیبی شناخت ۱۶۴

۴۰ اہلِ قلم کانفرنس اور صاحبانِ قلم ۱۶۸
۴۱ فکر اقبال کی عصری معنویت ۱۷۰
۴۲ سائنس اور ادب۔۔۔ تعاون و تصادم کے عوامل ۱۷۸
۴۳ قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء۔۔ اہداف و ترجیحات ۱۸۲
۴۴ فیض میزانِ عصر میں ۱۸۷
۴۵ عبدالعزیز خالد کا سانحۂ رحلت ۱۹۲
۴۶ اقبال کا تصور پاکستان اور فرزندِ اقبال کے ارشادات ۱۹۳
۴۷ وطنِ عزیز میں تعلیم اور نظامِ تعلیم کی زبوں حالی ۲۰۵
۴۸ ذریعۂ تعلیم اور قومی تشخص ۲۱۰
۴۹ جنوبی ایشیا میں ادبی میلوں کی یلغار ۲۱۵
۵۰ پاکستان میں تعلیم و تحقیق کی شکست و ریخت ۲۱۹
۵۱ قومی زبان کی تذلیل۔۔ حمیّت باختہ سفارت کاری ۲۲۳
۵۲ جامعہ کراچی کی غلط بخشی ۲۲۶
۵۳ ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔۔۔ عقل و تدبّر کی آزمائش ۲۲۷
۵۴ مرحبا! عدالتِ عظمیٰ پاکستان ۲۳۳
۵۵ گنجینۂ معارف۔۔ احساسِ زیاں ہے کہ نہیں! ۲۳۷
۵۶ قندیلِ علم۔۔ ظلمت و جہالت کے حصار میں ۲۴۲
۵۷ تحریم و تکریم۔۔ بنام۔۔ تحقیر و تذلیل ۲۴۸
۵۸ مشاہیر ادب اور قارئین کے مراسلات سے اقتباسات ۲۵۴

امین راحت چغتائی

پیش لفظ

سہ ماہی الاقرباء کا پہلا شمارہ جنوری ۲۰۰۱ میں شائع ہوا تھا اور اس کے اداریے ’’تمنا کا پہلا قدم‘‘ میں جن مقاصد کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا گیا تھا ان میں اعتدال و توازن کا حصول، مادی ترقی کے شانہ بہ شانہ فنون لطیفہ کا فروغ، تہذیب و معاشرت کی اعلیٰ اقدار کی پاسداری، ادبی اجتہاد و تجربات نو بہ نو کی تائید اور زبان کے علمی وقار کا تحفظ شامل تھے۔ اداریے کا عنوان ’’تمنا کا پہلا قدم‘‘ بذات خود ایک خلّاق ذہن کی اُپج ہے۔ اور اس اُپج کا تسلسل کہ ’’آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں‘‘ سے وابستہ ہے۔ مذکورہ مقاصد کا احاطہ کسی ایک لفظ کے ذریعے کرنا مقصود ہو تو آپ بلا تامل ’’ادبی بصیرت‘‘ کہہ دیجیے۔ یعنی الاقرباء کا اجرا بصیرت کا فروغ چاہتا ہے اور بصیرت کو شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاریؒ پیر ہرات بصیرتِ عقل سے تعبیر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس سے سود و زیاں کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ سلامتی نیز انسان کی فضلیت و عظمت کا سبب بنتی ہے۔ اور اس بصیرت کو عام کرنیوالے کا نام ہے سید منصور عاقل جو مجلّہ الاقرباء کے صدر نشین تو ہیں ہی۔ آپ یہ دیکھئے کہ وہ کس خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ گلاوٹھی، ایک مردم خیز قصبہ ہے ضلع بلند شہر کا اور جو دہلی سے صرف سینتالیس میل جنوب میں واقع ہے۔ اسے قصبۂ سادات بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کا ہر سید زادہ گلشن علم و سخن کا گل سر سبد ہی کہلایا۔ عاقل صاحب کے نانا سید عبدالوحید فدا، تلمیذِ داغ تھے اور اپنے عہد کے بڑے سخنوروں میں شمار ہوتے تھے۔ والدہ سیدہ تلمیذ فاطمہ بھی شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ والد قاضی سید حبیب اللہ وسیع المطالعہ عربی و فارسی علوم کی آبرو تھے اور بڑے بھائی علامہ قابل گلاؤٹھوی کا شہرۂ سخن تو اس عہد میں ’’کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے‘‘ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان دنوں عاقل صاحب کے ننھیالی بزرگ ناطق گاؤٹھوی کا شہرۂ سخن تو پورے برصغیر کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اردو اور فارسی دونوں میں رواں تھے اور اس مزاج کے شعر کہتے تھے

اوچہ داند شاعری ناطق ز افلاطوں مجو   شعر اندر رمزِ حکمت خود فلاطوں زیرِ پاست

افلاطون نے شعر کو فنونِ لطیفہ میں شامل نہیں کیا تھا۔ ۔ ۔ یہ اس کا جواب تھا

اب اندازہ لگا لیجئے کہ اس عقدِ پروین میں منصور عاقل پیدا نہ ہوتا تو اور کون ہوتا۔ ادب میں فتوے جاری نہیں کئے جاتے کہ اقلیمِ سخن میں حرفِ آخر کس نے لکھا لیکن یہ کہنے کی گنجائش تو نکالی جا سکتی ہے کہ منصور عاقل جیسے سجا کر شعر کہتے ہیں ویسے ہی سجا کر نثر لکھتے ہیں۔ اور ادبی مجلّات کی اداریہ نویسی میں انہوں نے رجحان ساز اداریے لکھنے کی طرح نو ڈالی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آنے والے ادبی رسائل کے مدیروں کے لیے کچھ مشکلات بھی پیدا کی ہیں۔ پاکستان میں رجحان ساز اداریوں کے حامل وقیع ادبی رسائل کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ان میں ادبی دنیا، سویرا، نقوش، فنون اور اوراق کے نام بطورِ خاص لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اوراق کے سوا کسی اور مجلّے نے تواتر کے ساتھ رجحان ساز اداریے نہیں لکھے۔ اوراق کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف یورپ اور امریکہ میں نشوونما پانے والی نئی نئی ادبی تحریکوں سے اپنے قارئین کو متعارف کرایا بلکہ نئی تحریکوں میں حصہ لینے کے لیے اوراق سے وابستہ ادیبوں کو بھی اکسایا اور یوں اربابِ علم و ادب میں ایک فکری ارتعاش پیدا کیا۔ لیکن اوراق کے اداریوں کی زبان خالصاً ناقدانہ و محققانہ رہی۔ اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا۔ اوراق کے اداریوں کے موضوعات کا تقاضا تھا کہ وہاں تنقید و تحقیق کے اسلوب میں مافی الضمیر بیان کیا جائے۔

اس کے برعکس الاقرباء کے اداریاتی موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان میں ادب، ادیب، تعلیم، زبان، تراجم، ثقافت، اشاعت و طباعت، سائنس اور نوکلیائی آویزش، علمی و اخلاقی مسلّمات کی بے توقیری، بین المملکتی ادب اور انسانی وحدت ایسے مسائل شامل ہیں۔ اور جب زبان کے علمی وقار کا تحفظ بھی ملحوظِ خاطر ہو تو پھر قلم میں اک رنگ کے مضموں کو سو ڈھنگ سے باندھنے کی خوبی ہی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اسلوب میں وہ سحر بھی ہونا چاہئے کہ قاری کو جگ بیتی بھی آپ بیتی لگے۔ اس میلان کو ادب کی جدید ترین اصطلاح میں "انشائی تنقید" کا نام دیا گیا ہے اور

بحمد اللہ عاقل صاحب کی تحریر میں یہ ہنروری بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں ان کے اداریوں میں تحقیق و تفکر بھی ہے اور استناد بھی۔ وہ تمام تر علمی، ادبی اور تہذیبی مسائل کو اجتماعی تناظر میں پرکھتے ہیں اور زبان و بیان میں وہ شائستگی اور شستگی ہے کہ بسا اوقات اس پر لمس پرنیاں کا گمان ہوتا ہے اور بلاشبہ یہ ایسی خصوصیت ہے جو معاصر ادبی مجلّات کے اداریوں میں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ منصور عاقل اداریہ لکھتے نہیں تخلیق کرتے ہیں۔ صحافت ادب کی ہو یا اخبار کی اس کا بنیادی اُصول کفایت الفاظ ہے۔ الاقرباء کا کوئی اداریہ پڑھ جائیے۔ اس میں فالتو لفظ نہیں ملے گا۔ عبارت وقار و تمکنت اور استدلال سے آراستہ ہوگی۔ ہر اداریہ اپنی انفرادی حیثیت میں ایک مکمل مگر مختصر ناقدانہ یا محققانہ مضمون نظر آئے گا لیکن تمام اداریوں میں ایک نظریاتی ارتباط کا اہتمام بھی محسوس ہوگا۔

عاقل صاحب کی اجتماعی فکر کا یہ عالم ہے کہ حکومت پاکستان نے ۱۹۸۱ء کے اوائل میں ڈاکٹر محمد افضل کی سربراہی میں تحفظِ آثار و نوادر کے لیے ایک مجلس مشاورت تشکیل دی تھی۔ جس نے قومی اہمیت کے نوادر کے تحفظ کی خاطر کچھ رہنما اصولوں پر مبنی ایک رپورٹ بھی مرتب کی تھی جو حکومت وقت کی بھول بھلیوں میں کہیں کھوگئی اور آج کسی کے حافظے میں محفوظ بھی نہیں لیکن عاقل صاحب نے پہلی بار اپنے اداریے میں اس طرف توجہ دلائی۔ اس کے باوصف کسی بڑے ادبی مجلّے کی ہمنوائی سے انحراف پر بھی ارباب بست و کشاد کو کبھی کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ اور اب تو اسے بے وقت کی راگنی تصور کیا جاتا ہے لیکن یہاں بھی عاقل صاحب تن تنہا اپنی قومی حمیت کا ثبوت دیتے ہوئے حکام بالا سے پوچھ رہے ہیں کہ ''سکھ تو نصف صدی (۱۷۹۹ء۔ ۱۸۴۹ء) تک پنجاب میں اپنے عہد حکومت میں فارسی کو اپنی سرکاری زبان قرار دے سکتے ہیں اور ہم نصف صدی گزر جانے کے باوجود انگریزی کی جگہ اردو کو دفاتر میں رائج نہیں کر سکے۔'' (اداریہ الاقرباء اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۱ء)

عاقل صاحب کے پیش نظر اکیسویں صدی کے ادبی مسائل بھی ہیں۔ وہ اس لرزہ براندام صدی کے ادباء و عقلا کو پہلے تو آئن سٹائن کا قول فیصل یاد دلاتے ہیں۔ جس سے پوچھا گیا تھا کہ ''ماضی کی دو جنگوں کے پیش نظر اسے تیسری عالمگیر جنگ میں کس قسم کے اسلحہ کے استعمال کے

امکانات نظر آتے ہیں'' اور اس نے جواب دیا تھا کہ ''وہ تیسری نہیں بلکہ چوتھی عالمگیر جنگ کے بارے میں پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ عالم انسانیت کو اگر اس جنگ کا سامنا ہوا تو مخالفین ایک دوسرے پر تیر کمان اور اینٹ پتھر سے حملہ آور ہوں گے۔'' (الاقرباء اداریہ جنوری، مارچ ۲۰۰۳ء) اس کے بعد وہ (عاقل صاحب) ارباب دانش سے پوچھتے ہیں کہ آخر عالمی ادب اس قدر بے تاثیر و بے توقیر کیوں ہو گیا کہ وہ ارباب سیف و سناں کو حیات انسانی کے تحفظ پر آمادہ نہیں کر پایا۔ پھر وہ اسی پس منظر میں پاکستانی ادبا کی زر کم عیار کی ہوس پر بھی نوحہ خواں ہیں۔ میں عاقل صاحب کے اداریے پڑھتا چلا گیا اور مجھے بیشتر ادبی مجلّات کے اداریہ نویس ادباء کے قد پہلے سے بھی چھوٹے نظر آنے لگے۔

الاقرباء کا ایک اور اداریہ ''ادب اور نظریہ ضرورت'' ہے۔ اس میں بھی آج کے ادبی افلاس ہی کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور ادیب سے استفسار کیا گیا ہے کہ فکر و نظر کی وہ صداقت کہاں گئی جو عالمگیریت اور وحدت انسانی کے رشتوں میں پیوست تھی اور کیوں کتابوں کی رونمائی ہی کو ادب اور ادیب کی قدآوری کا معیار بنا لیا گیا ہے۔ (اداریہ اپریل۔ جون ۲۰۰۳ء)

''بین المملکتی ادب'' الاقرباء کا ایک اور فکر انگیز اداریہ ہے۔ اس موضوع پر شاید کسی اور ادبی مجلّے کے مدیر کو لکھنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ اس اداریے نے نیا ادب (بمبئی) سویرا اور نقوش (لاہور) کے ابتدائی دور کے اداریوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ یوں تو یہ اداریہ مارچ ۲۰۰۴ء میں پاکستان میں منعقدہ ہونیوالی سارک ممالک کے اہل قلم کی کانفرنس کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اصل تقاضا یہ کیا گیا ہے کہ اگر ہمارے ادیب، انسانی حقوق کی نوید سنانے والا انقلاب پیدا نہیں کر سکتے تو بھی وہ ایسا ادب تو تخلیق کریں جو بین المملکتی سطح پر فکری ارتعاش پیدا کرنے کا باعث بن سکے اور خطے کی اُن مشترک اقدار کے فروغ میں مدد دے سکے جو غربت و جہالت سے نبرد آزما ہیں۔ اداریے میں ''دولت کی ناواجب تقسیم کے بے رحمانہ نظام'' کے خلاف ادب کی اجتماعی آواز بلند کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان غیر متوازن تحریروں سے بھی اجتناب کی تلقین کی گئی ہے جن پر ادب کے ارفع مقاصد کے فروغ کی بجائے سیاسی ترغیبات کی چھاپ

لگ جانے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ سارک ادبی کانفرنس کے بارے میں الاقرباء کے صدر نشین کی رائے یہ ہے کہ یہ یرغمالی کانفرنس کوئی جامع چارٹر دینے سے قاصر رہی۔

ایک اور اداریہ ہے ”مغرب میں اردو زبان وادب کے امکانات“ یہ ایسا موضوع ہے جس کی طرف ہمارے علمی وادبی مجلّات نے عہد حاضر کے تناظر میں یکسر توجہ نہیں دی لیکن الاقرباء کی نظر اس طرف بھی گئی۔ اور اس نے ان پاکستانی تارکین کی مساعی کو سراہا جو دیار غیر میں رہتے تو ہیں اپنی مادّی مجبوریوں کے باعث لیکن اردو زبان وادب کے چراغ بھی روشن کئے بیٹھے ہیں۔ تاہم اداریے میں اس استحصال کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو فنی طور پر ناپختہ ادباء وشعراء ڈالری تفریظوں کے بل پر ژاژ خائی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ (الاقرباء اداریہ۔ اپریل، جون ۲۰۰۶ء)

منصور عاقل صاحب کو ہمہ وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار علمی وادبی مجلّے کے صدر نشیں ہیں چنانچہ وہ علم وادب ہی کی حدود کا احاطہ کئے رکھتے ہیں۔ زیر نظر اداریے کا عنوان ہے ”معاصر ادب میں فکری ونظریاتی اعتدال کی ضرورت“ (اپریل، جون ۲۰۰۶ء) اسے بھی گذشتہ موضوع کا تسلسل ہی کہہ لیجئے۔ کیونکہ اس میں بھی علمی وادبی معیار کا جائزہ لیا گیا ہے اور قارئین ادب کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ موضوعات جو متانت ومعنویت سے عبارت تھے اب نوک قلم پر کیوں کم کم آتے ہیں۔ یہ اداریہ یوں بھی بروقت ہے کہ اس میں بڑا اہم بنیادی سوال اٹھایا گیا ہے کہ پریم چند سے آغاز کرنے والا ناول بانو قدسیہ پر آ کر کیوں رک گیا ہے۔ مزاح مشتاق یوسفی سے آگے کیوں نہیں بڑھا۔ شاعری ناصر کاظمی پر آ کر کیوں خاموش ہو گئی۔ معاصرینِ ادب، انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ ارباب ذوق متنوع روایات کو آگے بڑھانے میں کیوں ناکام رہے اور پھر الاقرباء نے ممتاز دانش ور صاحبزادہ یعقوب خاں کے ایک خطبے کا حوالہ دے کر خود ہی جواب بھی فراہم کر دیا ہے کہ۔۔۔۔ ”حقیقی ادب کی بنیاد ہمیشہ انسانی وحدت پر قائم ہوتی ہے لیکن عالمی وسعتوں نے جغرافیائی، لسانی، معاشرتی اور تہذیبی وثقافتی اکائیوں میں بانٹ دیا ہے (جبکہ) ادب انسانی وحدت کے حوالے سے ان تمام اکائیوں کا ترجمان ہوتا ہے“ یعنی اگر ترجمانی ہوتی رہے تو صحت مند ادب فروغ پاتا رہتا ہے۔

مطلوبہ معیار ادب دستیاب نہ ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ آج کے ادیب نے اپنے مطالعے کی کم مائیگی کو چھپانے کے لیے سفرناموں اور خودنوشت سوانح میں پناہ ڈھونڈ لی ہے۔ اور غزلیات کے ڈی لکس ایڈیشن چھپوانا شروع کر دیئے ہیں جن کے کاغذ میں بھی دلاویز ڈیزائن بنے ہوتے ہیں اور آخر میں خط و کتابت کے لیے عمدہ کاغذ پر مبنی لفافے اور پیڈ لگے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں کلام شاعر بزبان شاعر پر مبنی سی ڈیز بھی کتاب کے آخری صفحے میں ملفوف ملتی ہیں۔ گویا عیوب کلام کو لباس فاخرہ میں چھپا دیا جاتا ہے۔

''تعلیم اور قومی تشخص۔۔۔ نظام و نصاب کے مسائل'' (جولائی، ستمبر ۲۰۰۶ء) الاقرباء کا ایک اور عمدہ تحقیقی انداز کا اداریہ ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ منصور عاقل کس دل سوزی اور عمیق نظری سے تعلیمی مسائل کا جائزہ لے رہے ہیں اور حل بھی پیش کر رہے ہیں۔ وہ پہلی تعلیمی کانفرنس منعقدہ نومبر ۱۹۴۷ء کے نام حضرت قائداعظم کے اس پیغام سے ابتدا کرتے ہیں جس میں انہوں نے اپنی تہذیب و تاریخ سے ہم آہنگ اور جدید تقاضوں سے مطابقت رکھنے والے نظام تعلیم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر عاقل صاحب ۱۹۹۸ء کی قومی تعلیمی کانفرنس کا حوالہ دیتے ہیں جس کی سفارشات ۲۰۱۰ء تک کی مدت کا احاطہ کرتی ہیں اور جب ۲۰۰۶ء کی قومی تعلیمی کانفرنس تک آتے ہیں تو انکشاف کرتے ہیں کہ اس میں تعلیم کی قومی ترجیحات کو پس پشت ڈال کر تجارتی و کاروباری پالیسی کا رنگ دے دیا گیا اور اس طرح طبقاتی رویوں کو پروان چڑھانے والا منظر نامہ مرتب ہو گیا۔ اور اب صورت حال یہ ہے کہ ملک میں دس سال سے متجاوز عمر رکھنے والے ناخواندہ افراد کی تعداد تقریبا پانچ کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ عاقل صاحب ایک بار پھر قوم کو یاد دلاتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۲۰ء میں مسلمان قوم کے لیے نظام تعلیم کا ایک خاکہ کتابی صورت میں مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب بعد میں نایاب ہو گئی مگر ۱۹۸۱ء میں دوبارہ چھپ گئی۔ عاقل صاحب نے اس کتاب کے حوالے سے نیز مولانا جوہر کے ۱۹۲۴ء کے مضمون ''قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام'' کے پس منظر میں استفسار کیا ہے کہ جب مسلمان زعما اٹھاسی سال پہلے سائنس کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور دیگر علوم کے ساتھ طبیعیات، حیاتیات پر زور دیتے تھے تو اس سے اندازہ لگا لینا چاہئے کہ وہ طلبا

کی کردار سازی کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے۔ عاقل صاحب نے ثبوت کے طور پر سرسید کا یہ منشور بھی یاد دلایا ہے کہ ''سائنس ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگی اور فلسفہ ہمارے بائیں ہاتھ میں اور ہمارے سر پر ایک تاج ہوگا جس پر لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ لکھا ہوگا۔''

اب ڈھونڈیئے آج کا کوئی اور علمی و ادبی مجلّہ جس کے اداریہ نویس نے اس قدر تحقیق و دلسوزی کے ساتھ ایسے نظام تعلیم کی آرزو کی ہو اور جس نے جذبات سے نہیں دلائل سے ارباب بست و کشاد پر اپنے نظام تعلیم کے نئے افق روشن کرنے کی سعی کی ہو۔

قرۃ العین حیدر ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء کو انتقال کر گئیں۔ عاقل صاحب نے الاقرباء کے اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷ء کے شمارے میں جو تعزیتی اداریہ لکھا اس میں اردو کی بہت بڑی ناول نگار کی وفات کا شدید قلق تو ہے ہی مگر مرحومہ کی عظمت کو جس ادبی وجاہت سے خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے وہ بذات خود ایک اعلیٰ معیار کے تجزیاتی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرۃ العین کی وفات پر پورے برصغیر کے ادبا نے انتہائی خلوص و مودت سے اظہار تعزیت کیا مگر مرحومہ کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایسے تحقیقی و تجزیاتی مقالے کم کم لکھے گئے ہوں گے۔ میں نے بھی ابھی جس ادبی وجاہت کا ذکر کیا تھا اس کے ثبوت میں عاقل صاحب کا صرف ایک جملہ لیجئے۔ فرماتے ہیں ''ان (قرۃ العینؔ) کی فکری گہرائی، حسیاتی ترفع، تہذیبی و تاریخی شعور، علم و آگہی اور ذوق جمال ان کی تخلیقات کے نمایاں خطوط ہیں۔''

الاقرباء کے اداریوں میں ایک اور قابل صد تحسین اداریہ ''۲۰۰۸ء زبانوں کا بین الاقوامی سال'' (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء) ہے اور دکھ یہ ہے کہ یہ موضوع اپنی غیر معمولی اہمیت کے باوصف اخبارات و جرائد کے مدیروں کے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے ۲۰۰۸ء کو زبانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا تھا اور عاقل صاحب کی بالغ نظری نے اصل مسئلہ فوراً بھانپ لیا اور بتایا کہ ''عالمگیریت کا عفریت یک لسانی سامراجیت کو اس کرۂ ارض کے چپہ چپہ پر مسلط کر دینے پر کمربستہ نظر آتا ہے۔'' عاقل صاحب نے زور اس بات پر دیا کہ آج کے بدلے ہوئے تناظر میں جب کہ ''ہندوستانی'' نام کی زبان کہیں موجود ہی

نہیں تو یونیسکو کے ریکارڈ کی تصحیح کر کے ’’ہندوستانی‘‘ کی جگہ ’’اردو زبان‘‘ کا اندراج کرایا جائے۔ کیونکہ یہ اب بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کی قومی زبان کا نام ’’ہندی‘‘ ہے۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر میں انگریزی راج کے دوران ایک خاص مصلحت کے تحت اردو زبان کو ’’ہندوستانی‘‘ کا سیاسی نام دیا گیا تھا۔ ۲۰۰۸ء بھی اب اپنے اختتام کے قریب ہے اور مدیران والا کرام کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آسکی کہ موجودہ سال کے آغاز میں الاقرباء نے اس نکتے پر کیوں زور دیا تھا۔ قصہ طولانی ہے تاہم یہی کیا کم ہے کہ صحرا میں کسی نے اذان دی تو سہی۔

عاقل صاحب کی دل سوزی کا ایک اور ثبوت ان کا وہ اداریہ ہے جو اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں ’جو کفر از کعبہ برخیزد‘ کے عنوان سے قومی غیرت کو للکار رہا ہے۔ اسلام آباد کی عدالتِ عالیہ نے حکومت پاکستان کے غیر معمولی گزٹ مجریہ ۲۹ مئی ۲۰۰۸ء کے ذریعے یہ حکم صادر کر رکھا ہے کہ مذکورہ عدالت میں داخل کی جانے والی تمام دستاویزات (جو بالعموم اُردو میں تحریر شدہ ہوتی ہیں) انگریزی زبان میں پیش کی جائیں۔ نیز یہ کہ کسی دوسری زبان کی حامل دستاویزات کا مصدقہ انگریزی ترجمہ پیش کرنا لازم ہوگا۔ بصورت دیگر وہ قابل قبول نہیں ہوں گی۔ حالانکہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے جسے بہرحال آئینی تحفظ حاصل ہے۔ مگر حسب سابق کسی قومی اخبار یا ادبی مجلّے کے مدیر یا قوم کے سیاسی راہنما نے تادم تحریر اس سلسلے میں کوئی صدائے احتجاج بلند کی نہ اس کے مضمرات پر غور کیا۔ عین ممکن ہے کہ ان باخبر اداروں، مدیروں اور راہنماؤں کو اس بارے میں کوئی خبر ہی نہ ہو۔ یہاں بھی پہل الاقرباء نے ہی کی ہے اور محولہ بالا فرمان کی نہ صرف سخت لہجے میں مذمت کی ہے بلکہ اس تدبر باختگی پر پوری قوم کے ضمیر کو جھنجوڑا ہے۔

بہرکیف اس اقدام سے تین باتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ پہلی یہ کہ پاکستان کی ایک ایسی حکومت بھی قومی زبان کی تحقیر میں فریق بنی ہوئی ہے جو عوامی قیادت کا دعویٰ رکھتی ہے جب کہ یہاں کے ستاسی فیصد عوام انگریزی زبان سے نا آشنا ہیں۔ اگر کسی مقدمے میں ان کی دستاویزات براہ راست انگریزی میں یا انگریزی میں ترجمہ ہو کر عدالتِ عالیہ میں پیش کی جاتی ہیں تو فریقین کے رسمی اتفاق کے باوصف وہ اپنے اپنے موقف کے کلیدی نکات سے بے خبر رہتے ہیں۔ وکلا کے

انگریزی زبان میں عدالت سے خطابات میں بھی یہی قباحت ہے۔ تو کیا ہماری عدالتِ عالیہ کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ فریقین مقدمہ اگر انگریزی زبان سے ناآشنا ہیں تو ان کے لیے مقدمے کی سماعت یا مباحث کا فہم ضروری نہیں ہے؟

دوسری بات یہ کہ بیشتر دستاویزات اردو میں وثیقہ نویس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں یا انہیں کمپیوٹر کے ذریعے اردو میں تحریر کر دیا جاتا ہے۔ ایسی دستاویزات کے انگریزی تراجم کرنے والے افراد کے صحیح مترجم ہونے کا تعین کون کرے گا۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان سے نابلد یا کم بلد فریقین مقدمہ ترجمہ شدہ دستاویزات کے صحیح ہونے پر کس طرح متفق ہوں گے۔ جب قانونی زبان کی صحت پر تو عام انگریزی دان طبقہ بھی رائے دینے کا مجاز نہیں ہوتا۔ عدالتِ عالیہ کی طرف سے انصاف کے حصول کو اتنے مشکل مراحل سے گزارنا بذات خود انصاف کے حصول کو ناممکن بنا دینے کے مترادف ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ جب ماتحت عدالتوں میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے اور مقدمات ماتحت عدالتوں سے عدالتِ عالیہ میں جاتے ہیں تو پھر دوہرا معیار کیوں قائم کیا جائے جب کہ ایسا اقدام آئین کی روح کے بھی منافی ہے۔ لیکن جس قوم کے راہنما، عدالتیں، قانونی و آئینی ماہرین اور ادباء اپنی قومی زبان کو اچھوت بنانے پر تُلے ہوئے ہوں وہاں قومی غیرت دیومالائی کتھا بن ہی جایا کرتی ہے۔

الاقرباء کے اداریوں کی علمی، ادبی اور تحقیقی خصوصیات پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے پروفیسر اسلوب احمد انصاری اکثر یاد آجاتے ہیں جنھوں نے علی گڑھ کے ششماہی مجلّے ''نقد و نظر'' کی بائیس سال (۱۹۷۹ء۔ ۲۰۰۰ء) ادارت کی اور ہر اداریہ علم و ادب کے مختلف مسائل یا ادبی شخصیات کے حوالے اس طرح لکھا کہ اُس میں منفرد فکر، تحقیق، تجزیہ اور دل آویز اسلوب بیاں کے تمام محاسن یکجا ہو گئے۔ ''نقد و نظر'' کے بعد ایسے اداریے پھر کسی اور ادبی رسالے کو نصیب نہیں ہوئے۔ الاقرباء کے اداریوں میں ویسی ہی فکر اور حسنِ بیاں کا احیا ملتا ہے بلکہ الاقرباء کے صدر نشیں اور اداریہ نویس جناب منصور عاقل نے تو ملک کے درپیش تعلیمی مسائل کا بھی فکر انگیز تجزیہ کیا ہے۔ ان

اداریوں میں معلومات کا بھی اتنا بڑا خزانہ فراہم کر دیا گیا ہے کہ آنے والے دور میں ان کے حوالے دیے جائیں گے۔

علم و ادب کے قارئین کو یاد ہوگا کہ اقوام متحدہ نے ۲۰۰۸ء کو زبانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا تھا جس کا بالواسطہ مطلب یہ تھا کہ عالمی ادارے نے دنیا میں بولی جانے والی کم و بیش سات ہزار زبانوں کی حوصلہ افزائی کی تھی مگر غور طلب بات یہ ہے کہ 'الاقرباء' کے اداریہ نویس کے سوا پورے پاکستان میں کسی ادبی رسالے کے مدیر کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ اقوام متحدہ کا رویہ بھی چند کروڑ نفوس کی مادری زبان انگریزی کی طرف ہی مائل رہا اور اُس نے تقریباً ساڑھے چھ ارب نفوس کی آبادی کی زبانوں پر خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ چنانچہ الاقرباء کے اداریے (جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء) میں بتایا گیا کہ اردو عالمی سطح پر کم و بیش ایک ارب افراد کی زبان ہے مگر اِسے اقوام متحدہ کا ادارہ ''ہندوستانی'' کا نام دیتا ہے اور یونیسکو کا ریکارڈ بوجوہ ابھی تک درست نہیں کیا گیا غالباً برصغیر کے ادبی رسائل میں الاقرباء پہلا رسالہ ہے جس نے عالمی ادارے کے داخلی رویّے ہی کو منکشف نہیں کیا بلکہ بڑے دکھ سے اِسے اربابِ دانش کی ''خرد باختگی'' قرار دیا۔

الاقرباء کے ایک اور اداریے ''سائنس اور ادب۔۔۔ تعاون و تصادم کے عوامل'' (جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۹ء) میں بھی ایک انوکھی فکر پیش کی گی ہے اور بڑی دردمندی سے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ''بیم و رجا کے عصری تناظر میں ادب و سائنس دونوں بے لگام ہو چکے ہیں۔ ایک طرف ادب میں پستہ قد کو سرو قامت ثابت کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف سائنس نے دنیا کو امن سے ہمکنار کرنے کے بجائے بے یقینی کی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے۔''

۲۰۱۰ء کے چاروں شماروں کے اداریے ایک بار پھر دردمندی، دل سوزی، فکری بیداری اور تجزیاتی اسلوب کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ پہلا اداریہ (جنوری۔ مارچ ۲۰۱۰ء) فیض کے ۹۹ ویں سالِ ولادت کے حوالے سے قلمبند کیا گیا ہے جس میں فیض کے ایک انٹرویو کا ذکر ہے۔ اس انٹرویو کے ایک ہی جملے میں اُن کی ساری شخصیت سمٹ آئی ہے۔ اُن سے پوچھا گیا کہ ''آپ صوفی اور کامرید کا موازنہ کس طرح کریں گے''؟ جواب ملا ''صوفی حقیقی کامریڈ ہیں'' اس میں کوئی

شک نہیں کہ فیض کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا۔ اُن کی تمام شاعری اس نصب العین کی جدوجہد سے عبارت ہے لیکن بھرپور جمالیاتی رچاؤ کے ساتھ۔ اُنھوں نے دارورسن، سحر، ظلمت، زنداں، لوح وقلم ایسی قدیم علامتوں کو جدید حرکیاتی مفاہیم عطا کئے اور شعروادب کو ''مشاہدہ'' اور ''مجاہدہ'' کا نیا تصور دیا۔ اور اداریے میں بجا طور پر لکھا گیا ہے کہ فیض اپنی زندگی میں ہی ایک روایت بن چکے تھے۔ اور یہ بات بھی قارئین ادب کو کم کم معلوم ہوگی کہ راقم الحروف کو فیض پر پہلی نظم لکھنے کا شرف حاصل ہے۔ یہ نظم بہ عنوان 'دستِ صبا کے نام'' ۱۶۔ فروری ۱۹۵۴ء کو روزنامہ ''امروز'' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ فیض اُن دنوں نذرِ زنداں تھے۔

زیرِ نظر سال کا دوسرا اہم اداریہ (اپریل تا جون ۲۰۱۰ء) ''اقبال کا تصورِ پاکستان اور فرزندِ اقبال کے ارشادات'' سے متعلق ہے۔ یہ اداریہ کیا ایک محققانہ بصیرت پر مشتمل مقالہ ہے جس میں دلائل بھی ہیں اور شائستہ اسلوب بیان بھی۔ دردمندی بھی ہے اور دل سوزی بھی۔ وجہ تالیف یہ ہے کہ اُن دنوں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسلام آباد کی دو دانش گاہوں میں دو خطبات دیے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو ایک ایسی اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے جس میں سیکولر خصوصیات بھی ہوں اور یہ کہ حضرت علامہؒ کا نظریۂ اجتہاد اِس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مسلم معاشرے میں کسی بھی دوسرے معاشرے کے تصورِ حیات کو حسبِ ضرورت اپنایا جاسکتا ہے۔

اِس پر الاقرباء کے اداریہ نویس جناب منصور عاقل نے شرحِ صدر کے ساتھ ڈاکٹر جاوید اقبال سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن ایک معیار قائم رکھا۔ دلائل کا جواب دلائل سے دیا ہے۔ نیز یہ تسلیم کیا ہے کہ فرزندِ اقبال کو اپنے عالی مرتبت والد کے نظریات کی تشریح وتوضیح اپنے طور پر کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ اداریہ جناب منصور عاقل کے اِس شعر کی روشنی میں پڑھا جائے تو کئی فکری مسائل ازخود حل ہو سکتے ہیں۔

عطا ہوئی ہے مجھے وسعتِ نگاہ تو مَیں خود اپنی تابِ نظارہ نہ ہو کے رہ جاؤں

الاقرباء کے اداریوں میں نظامِ تعلیم کی زبوں حالی بطورِ خاص توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ چنانچہ

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱ء کے شمارے میں بھی اسی موضوع پر قلم اُٹھایا گیا ہے۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ برائے ۲۰۱۰ء میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں ۱۰-۲۰۰۹ء کے دوران تعلیم پر مجموعی قومی آمدن کا ۵ء ۶ فیصد خرچ ہوا۔ اور اس سے پہلے کے سالوں میں بھی صورت حال کچھ زیادہ قابلِ رشک نہیں رہی۔ اس سلسلے میں اداریے میں بتایا گیا ہے کہ دستورِ پاکستان کی ایک نئی دفعہ ''۲۵ اے'' کے اضافے کے باوجود پانچ سے سولہ سال کے بچوں کی مفت تعلیم کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ لیکن ایک بار پھر غور طلب بات یہ ہے کہ الاقرباء کے سوا کسی اور علمی و ادبی مجلّے کے فاضل مدیر کی نظر سے اِس نوع کی رپورٹیں کیوں نہیں گزرتیں۔

الاقرباء کے قارئین کو بجا طور پر یہ بات غیر معمولی محسوس ہوتی ہو کہ اِس کے اداریوں کا تحقیقی و تجزیاتی مزاج ہمہ وقت برقرار رہتا ہے اور وہ علم و ادب کے ایسے ایسے گوشے تلاش کرتا رہتا ہے جہاں دوسروں کی نظروں کی رسائی ممکن نہیں۔ ایسا ہی ایک گوشہ جنوری تا جون ۲۰۱۲ء کے شمارے میں ''ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔ عقل وتدبر کی آزمائش'' کی صورت میں منکشف ہوتا ہے۔ یہ دور رس نتائج کا حامل اداریہ ہے جس پر اب تک کسی سیاست دان کو کجا کسی ادیب، نقاد یا ماہرِ لسانیات نے بھی توجہ نہیں فرمائی۔ مجملاً عرض ہے کہ گزشتہ حکومت کے دور میں سرکاری بنچوں پر بیٹھنے والے قومی اسمبلی کے بائیس ارکان نے دستورِ پاکستان کی دفعہ ۲۵۱ میں ترمیم کا مسودہ ایوان میں پیش کیا جو بعد میں قائمہ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ بلوچی، پنجابی، پشتو، شینا/بلتی، سندھی، سرائیکی اور اردو پاکستان کی قومی زبانیں ہیں تاہم جب تک یہ دفتری زبان کی سطح پر نہ آجائیں۔ انگریزی کو بدستور دفتری زبان برقرار رکھا جائے۔ جب کہ دستورِ پاکستان کی اصل دفعہ ۲۵۱ میں درج ہے کہ ''پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور اسے سرکاری و دیگر مقاصد کے لیے استعمال میں لانے کی خاطر یومِ آغاز سے پندرہ سال کی مدت کے دوران اقدامات کیے جائیں گے۔''

''الاقرباء نے بروقت قومی اسمبلی کے مذکورہ عاقبت نااندیش ارکان پر واضح کیا کہ قومی زبان تو وہ ہوتی ہے جو سارے ملک میں رابطے کی صلاحیت رکھتی ہو اور وہ نہ صرف پورے ملک میں

ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے بلکہ دنیا کی ڈیڑھ ارب آبادی اِسی زبان میں ایک دوسرے سے رابطہ رکھتی ہے"الاقرباء" نے مزید لکھا کہ ایسا کون "تدبر باختہ" شخص ہوسکتا ہے جو اپنے ملک میں اردو کے علاوہ مزید سات زبانوں کو قومی زبانیں قرار دلوانے کا عزم رکھتا ہو اور ایک مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کرنا چاہتا ہو۔ بہر حال مقام شکر ہے کہ یہ ترمیمی بل گزشتہ حکومت کے ساتھ ہی آنجہانی ہو چکا ہے۔

"الاقرباء" کی باخبری اور عمدہ کارکردگی کی ایک اور مثال دیکھیے۔ پاکستان کے سپریم کورٹ نے ۳ جولائی ۲۰۱۲ء کو قومی اسمبلی کی سپیکر اور سپریم کورٹ کے اختیارات سے متعلق ایک فیصلہ پاکستان کی قومی زبان اردو میں تحریر کیا تھا۔ فاضل اداریہ نویس نے بلا تاخیر اسے تاریخ ساز فیصلہ قرار دیا کہ یہ اردو میں لکھا گیا تھا۔ اور جولائی تا دسمبر کے شمارے میں بڑی فراخدلی سے سپریم کورٹ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ہماری حالیہ تاریخ میں پاکستان کی سب سے بڑی عدالت نے پہلی بار اپنا کوئی فیصلہ اردو میں تحریر کیا تھا اور پاکستان ہی کی تاریخ میں الاقرباء اردو اخبارات و رسائل میں پہلا رسالہ ہے جس نے قومی زبان میں لکھے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے پر تحسین و تشکر آمیز اداریہ لکھا۔

جنوری تا جون ۲۰۱۳ء کے الاقرباء میں جو مقالہ افتتاحیہ بہ عنوان "قندیل علم ۔۔ ظلمت و جہالت کے حصار میں" تحریر کیا گیا ہے وہ بھی اعلیٰ تعلیم کی حالتِ زار پر ایک تحقیقی کام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بھی مستند اعداد و شمار کے ذریعے اربابِ حکومت کی کم اندیشانہ روش کو بے نقاب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملک کے مایۂ ناز ماہرِ تعلیم ڈاکٹر عطاالرحمٰن کی سربراہی میں جس سترہ رکنی ٹاسک فورس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اُس کی تمام تجاویز کو علاقائی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ ملک بھر میں تدریس کے لیے اکتالیس علاقائی زبانیں استعمال کی جا رہی ہیں۔ اور نظام تعلیم کو قومی وحدت میں پرونے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اب پاکستان اپنے بوسیدہ و شکستہ نظامِ تعلیم کے باعث دنیا کے دس بدترین ممالک میں شمار ہونے لگا ہے۔

اب آیئے آخر میں یہ اقرار کرتے چلیں کہ الاقرباء کے اداریوں نے اردو زبان و ادب کی اہمیت اجاگر کرنے اور ادبی مجلّات کے اداریہ نویسوں کو تنقید و تحقیق کا ایک دلآویز اسلوب عطا کرنے کی جو طرح نو ڈالی ہے وہ بلاشبہ عصر حاضر میں ناپید تھی ایسے میں منصور عاقل صاحب کے لیے دل کی گہرائیوں سے دلّی والوں کے لب ولہجہ میں یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ انہیں بنائے سجائے رکھے۔ (آمین)

محمود اختر سعید

‘الاقرباء’ کے اداریے

اسلام آباد سے شائع ہونیوالے ادبی رسائل و جرائد میں سہ ماہی ''الاقرباء'' نمایاں اور معروف نام ہے۔ خوش قسمتی سے اس مجلّہ کو آغاز کار ہی سے معروف اہلِ قلم حضرات کا تعاون ملا جنہوں نے اپنی نگارشات نظم ونثر سے اس مجلّہ کو توانائی بخشی۔ مزید خوش قسمتی کہیئے کہ اسے مجلسِ ادارت کے صدر نشین سید منصور عاقل جیسے بے لوث اور مشاق اہل قلم کی سرپرستی حاصل ہے۔ مزید برآن اس مجلّہ نے اداریہ نویسی کے باب میں جو تمام تر جناب منصور عاقل کے فکرونظر اور خامہ ٔ جدّت طراز کا مرہونِ منت ہے ایک کہنہ روایت کو نئی جہت عطا کی ہے۔ آغاز کار ہی سے اس کے ہر شمارہ کا اداریہ نفس مضمون اور اندازِ بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہر اداریہ کو بلا تامل A Piece of Literature, کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ قبل اس کے کہ ''الاقرباء'' کے اداریوں کے سلسلے میں کوئی بات کریں، ہمیں ادبی صحافت کے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک کے رسائل و جرائد کی اداریہ نویسی کا جائزہ لینا ہوگا۔ کہ اداریہ نویسی کی روایت قدم بقدم کیسے آگے بڑھی اور یہ احساس کب پیدا ہوا کہ اخبارات کے اداریوں کی طرح ادبی رسالوں میں بھی اداریوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ روداد ہے ''آغازِ کار'' سے لے کر 'الاقرباء' کے اولین اداریہ 'تمنا کا پہلا قدم' تک کی۔ جس میں دور اوّل سے لے کر دور جدید تک کے مختلف رسائل وجرائد کے اداریوں کے رنگِ تحریر اور اندازِ فکر ونظر کا طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے تا کہ اس تقابل سے قارئین کرام ''الاقرباء'' کے اداریوں کے فکر انگیز تبصروں اور ادبی اُسلوبِ نگارش سے بیک وقت لطف اندوز ہوسکیں۔

برصغیر پاک وہند میں علمی وادبی صحافت کا آغاز ہفت روزہ جرائد ورسائل سے ہوا۔ اُس دور کی صحافت میں تجارت اور مفاد پرستی کو دخل حاصل نہیں تھا۔ ان کا مقصد ماضی کی اعلیٰ روایات اور اسلاف کے کارناموں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کی بیداری بھی تھا۔ صحافت کے دورِ اول میں اخباری اور مجلّاتی صحافت کے اغراض ومقاصد یکساں دکھائی دیتے ہین۔ لیکن تقاضائے

وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے دائرہ کار میں نمایاں فرق ہوتا چلا گیا۔ اخباری صحافت کا تعلق روزمرہ کے حالات و واقعات سے ہونے کے سبب اس میں تازگی کے عنصر کو اولیت حاصل رہی، جب کہ اس کے برعکس رسائل و جرائد کے مواد کا حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ادب تخلیقی مراحل میں دائمی اقدار کو موضوع بناتا ہے، جب کہ اس کے برعکس اخباری صحافت کو ایک محدود وقت میں واقعات و اطلاعات کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے ہنگامی حالات کی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ صحافت کے دوراول میں اخباری اور مجلّاتی صحافت کے اغراض و مقاصد میں بہت یکسانیت تھی۔ لہٰذا اداریئے جو موجودہ دور میں اخبار یا مجلّہ کی روح خیال کئے جاتے ہیں دوراول کے رسائل میں جو عموماً ہفت روزہ ہوتے تھے، ان میں اداریوں کا ہونا ضروری خیال نہیں کیا جاتا تھا اور جو اداریئے ہوتے بھی تھے، ان میں ادبی عنصر کی جگہ اخباری انداز نمایاں ہوتا تھا جس میں اپنے ادارے کی مشکلات کا ذکر معاونین کرام کی خدمت میں گزارشات کچھ رفتگاں کا تذکرہ چند تلخ و شیریں حالات و واقعات اور اشاعت میں تاخیر پر معذرت اور چندے کی اپیلیں ‘ایسی خبریں چھوٹے چھوٹے پیراگراف بنا کر لکھی جاتی تھیں۔

رسالہ ‘نیرنگِ خیال’ میں ‘لمعات’ کے زیرِ عنوان منیجر رسالہ، ضروری حالات و کوائف لکھتے تھے جب کہ ایڈیٹر حکیم یوسف حسن عموماً بعنوان ‘شذرات’ حالات و واقعات اور رسالہ کے مضامین کے متعلق ضروری باتیں تحریر کرتے تھے۔ اختر شیرانی کے ماہنامہ ‘رومان’ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کی فائلیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان شماروں میں باقاعدہ ‘اداریہ’ نہیں ہے، بلکہ ان میں ‘ادارہ رومان’ کے عنوان سے مختلف رائٹروں کا تعارف اور مراسلات ملتے ہیں جب کہ کبھی کبھار ‘حالات حاضرہ’ پر نوٹ بھی ہوتے تھے۔ یہی حال ‘نگار’ لکھنؤ کے عہد اوّل کے شماروں کا ہے، ان شماروں میں باقاعدہ ‘اداریہ’ کی جگہ چھوٹے چھوٹے اعلانات ہوتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں سر سید احمد خاں نے ’’تہذیب الاخلاق‘‘ جاری کیا جس میں اس وقت کی روایت کے مطابق ادبی حصہ کم تھا۔ تعلیم و تدریس اور اصلاح معاشرہ کی خبریں زیادہ ہوتی تھیں تاہم پہلے شمارے کے اداریہ میں تحریک کے مقاصد بیان کئے گئے۔ اسی دور میں کئی رسائل شروع ہوئے، جن میں علمی و ادبی اور سیاسی باتیں مختصر نوٹ کے

ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ایسے رسائل و جرائد میں مولانا عبدالحلیم شرر کا ماہنامہ 'دلگداز'، منشی دیا نرائن نگم کا رسالہ 'زمانہ'۔ اعظم گڑھ سے سید سلیمان ندوی کا رسالہ 'معارف' وغیرہ شامل تھے۔ بعد میں مولانا حسرت موہانی کے جاری کردہ مجلّہ 'اردوئے معلیٰ' میں بھی ادبی اور سیاسی اعلانات ہوتے تھے۔ باقاعدہ 'اداریہ' نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ۱۹۰۹ء میں حسرت موہانی جب جیل سے لوٹے تو لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ 'اردوئے معلیٰ' کو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔ اس پر انہوں نے نومبر ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں ''اردوئے معلیٰ'' کی پالیسی کے عنوان سے اپنے اداریہ میں دوستوں کے مشورے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا

> ''مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو محض کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے، جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔۔۔''

اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا دور آتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب 'الہلال' کی پہلی ضمانت ضبط ہونے کے بعد مزید ضمانت طلب کی گئی تو مولانا نے ضمانت داخل کرنے سے بہتر یہی جانا کہ 'الہلال' کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۵ء سے 'البلاغ' کے نام سے ایک نیا ہفت روزہ جاری کیا۔ جہاں تک 'البلاغ' کے مقاصد کا تعلق تھا اس کے پہلے شمارے کے پہلے صفحہ پر علامہ اقبال کی یہ نظم تحریر تھی۔

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے   تصدّق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

* * *

پرچہ بند ہونے کے ایک مہینہ بعد جب جنوری ۱۹۱۶ء کا شمارہ چھپا تو اس میں ''عہد التوا و انتظار'' کے عنوان سے آپ نے ایک اداریہ لکھا، جس میں ایک بار پھر تجارت اور دعوت کے فرق کو واضح کیا۔

''۔۔۔ بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا لیکن یہ صرف اس

لیے کیا کہ اظہارِ خیال اور تبلیغِ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا۔ اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں مفت چھاپ کر تقسیم کیا کرتا۔ پس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت۔ میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیونکہ میں نے اسے ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصلی کام نہیں ہے۔ میں نے اگر اسے اختیار کیا تو یہ ہندوستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعت کے لیے بہتر ہوا اور اس کے لیے ترقی کی ایک بالکل نئی راہ کھلی مگر خود میرے لیے اس میں کوئی شرف نہیں، کیونکہ میرے کاموں کے لیے اصل راہیں دوسری تھیں۔“

اسی طرح 'الہلال' کے ایک اداریہ میں رسالہ کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”۔۔۔ میں نے داعی کی حیثیت سے جو کام کیا اس نے جو مجھے ذہنی اطمینان عطا کیا وہ ہزار لعل و جواہر سے بہتر ہے۔ اس لیے اس سرزمین میں سب سے بڑا دولت مند آدمی میرے سوا اور کوئی نہیں۔۔۔“

اس دور کے رسالوں میں سنجیدہ اداریوں کی جگہ احوال و کوائف شذرات میں نیم ادبی اور سیاسی باتیں لکھی جاتی تھیں۔ مولانا آزاد بھی ”الہلال“ میں کبھی کبھی ”افکار و حوادث“ کے عنوان سے ایک ہلکا پھلکا کالم لکھا کرتے تھے۔ جو موجودہ دور کی اداریہ نویسی سے قطعی مختلف اندازِ تحریر تھا۔ بعدازاں ایک دو بار 'البلاغ' میں بھی یہ کالم لکھا اور کبھی کبھار باقاعدہ اداریہ بھی ہوتا تھا۔ انھیں دنوں شیخ عبدالقادر کی ادارت میں لاہور سے ”مخزن اور لاہور ہی سے میاں بشیر احمد کی ”ادارت“ میں 'ہمایوں' جاری ہوئے۔ یہ دنوں خالص ادبی مجلّے تھے۔ رسالہ 'ہمایوں' لاہور کے دو شمارے۔۔۔ اپریل ۱۹۵۳ء 'اقبال نمبر' اور مئی ۱۹۵۳ء 'فلک پیما نمبر'۔۔۔ جو اس وقت زیر نظر ہیں' ان دونوں شماروں میں 'بزم ہمایوں' کے زیر عنوان علامہ اقبال اور فلک پیما کے بارے میں ایڈیٹر میاں بشیر احمد کی طرف سے ادارتی نوٹ ہیں۔ عالم نسواں کے رسائل کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان رسائل نے خواتین میں احساس عزت نفس اور ادائے ذمہ داری کے فرائض کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان رسائل میں مولوی سید احمد کا 'اخبار النساء' مولانا راشد الخیری کا'

عصمت' (دہلی) رازق الخیری کا 'بنات' (دہلی) جیسے مشہور و معروف نام تھے۔ ماہوار، 'بنات' (دہلی) علامہ راشد الخیری کی زیرِ سرپرستی اور رزاق الخیری کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے مندرجات میں راشد الخیری کا شروع میں کوئی مضمون ہوتا تھا یا پھر اعلانات ہوتے تھے۔ رسالہ 'عصمت' (دہلی) کے شمارہ جنوری ۱۹۳۷ء میں 'چند باتیں' کے زیرِ عنوان ایڈیٹر رزاق الخیری اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتے ہیں۔

> "۔۔۔۱۹۳۶ء جس نے حضرت علامہ راشد الخیریؒ کی رحلت سے عالمِ اسلام اور عالمِ نسواں، دنیائے ادب اور ہندستان کو بالعموم اور "عصمت" کو بالخصوص نہایت زبردست نقصان پہنچایا ختم ہوگیا۔ اور اب ۱۹۳۷ء کا آغاز ہے ۱۹۳۶ء 'عصمت' کی تاریخ کا سب سے اہم اور سب زیادہ آزمائشی سال تھا۔۔۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں 'عصمت' کی سالگرہ نہیں منائی گئی اس لیے مضمون نگاروں کو انعامات بھی نہیں دیئے گئے۔۔۔ جولائی میں حسب معمول 'عصمت' کا خاص نمبر دوسو صفحوں پر غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگا۔۔۔"

رسالہ "تہذیبِ نسواں (دارالاشاعت پنجاب لاہور) بھی خواتین کے حقوق کا علمبردار تھا۔ ۱۹۱۸ء میں سید امتیاز علی تاج کی ادارت میں لاہور سے ایک علمی و ادبی مجلّہ "کہکشاں" کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے پہلے شمارہ میں مولوی سید ممتاز علی نے ادارتی نوٹ میں رسالہ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا۔

> "ہمارا مقصد وہی ہے جو اور بہت سے صحائف و جرائد کا ہوگا، یعنی اردو زبان کو اعلیٰ ترقی پر پہنچانے کے لیے سعی بلیغ کرنا اور اس باب میں کامیابی کے موثر ذرائع اور وسائل بہم پہنچانا۔ اُردو زبان کی ترقی کی رفتار بے انتہا دھیمی پڑ گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی نے 'جو بالکل کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی، اچھی متعدبہ ترقی کر لی ہے، اگر خدانخواستہ چندے یہی حال رہا اور اُردو کی روانی بالکل رُک گئی تو اس کا حال کھڑے پانی کا سا ہوگا جو ایک جگہ رکے رہنے سے سڑ کر گندا ہو جاتا ہے۔ اگر اُردو زبان کی توسیع و تہذیب کی خواہش

ہے، تو ہمیں ذخیرۂ الفاظ فراہم کرنے اور اردو کو ہر قسم کے خیالات کے اظہار پر قادر کر دینے میں کوشش کرنی چاہیئے۔ چانچہ اسی مقصد کے لیے ''کہکشاں'' جاری کیا گیا ہے۔''

''کہکشاں'' کے پہلے شمارے میں سید امتیاز علی تاج نے بھی ادارتی نوٹ میں اپنے خیالات کا اضافہ کرتے ہوئے لکھا :

''اُمید تو ہے کہ ہندوستان کے نامور ادبائے کرام کے رشحاتِ قلم بروئے کار آئیں گے اور 'کہکشاں' چل نکلے گا۔ ہم نے بڑی بڑی اُمیدیں گرہ میں باندھ کر یہ کام شروع کیا ہے۔۔ اردو ادب کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ اہل ملک کی قدر دانی، حوصلہ افزائی پر منحصر ہے۔ ورنہ ابھی تو

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ   دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

رسالہ محشرِ خیال (دہلی) کے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۵ء کی فائلیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر شمارہ میں ایڈیٹر عبداللہ فاروقی اپنے ادارتی نوٹ میں 'خیالات' کے زیر عنوان حالات حاضرہ اور خبروں پر حسب ضرورت دو چار سطروں کا اضافہ کرتے تھے۔ اداریہ کی کوئی مخصوص شکل وصورت نہ تھی۔

رسالہ 'عالمگیر' بھی اپنے دور کا مشہور و معروف ادبی مجلّہ تھا جو حافظ محمد عالم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے نومبر ۱۹۳۳ء کے شمارہ کے اداریہ بعنوان 'ملاحظات' کی چند سطور ملاحظہ ہوں۔

''مئی ۱۹۳۴ء میں 'عالمگیر' اپنی عمر کی دس منزلیں طے کرلے گا۔۔۔ مجھے اس حقیقت نفس الامری کے اظہار میں مطلقاً باک وتامل نہیں کہ میری یہی خواہش رہی ہے کہ میں 'عالمگیر' کو زیادہ سے زیادہ کامیاب وکثیر الاشاعت دیکھوں، اس سلسلہ میں، میں ان تمام کوششوں کو بروئے کار لاتا رہا، جو میرے حیطۂ امکاں میں تھیں۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے میری حقیر کوششیں مقبول وکامیاب ہوئیں۔ ناظرین کرام و معاونین نظام نے ہمیشہ ان کے متعلق اظہار استحسان وآفریں کیا۔۔۔''

اسی طرح ماہنامہ ''نگار (لکھنؤ) میں اس کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری باقاعدہ اداریہ بعنوان

’ملاحظات‘ میں مضامین اور مضمون نگار کے بارے میں اپنے گرانقدر تاثرات کا اظہار کرتے تھے ایک اداریہ میں لکھتے ہیں:

’’نگار کا ابتدائی دور میرے لیے بلحاظ تحریر بہت مصروفیت کا تھا کہ بسا اوقات خود مجھ کو تنہا تمام مضامین لکھنے پڑے کیونکہ دست سوال پھیلانے کی عادت نہیں اور یوں کسی کو کیا غرض ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے افکار و دماغ میرے حوالے کر دیتا۔ لیکن رفتہ رفتہ ارباب قلم نے خود (بغیر کسی استدعا کے) ’نگار‘ کو توجہ کے قابل سمجھا اور اپنے مضمون بھیجنے شروع کیے۔‘‘

(ماہنامہ نگار۔۔ ستمبر ۱۹۲۷ء)

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ’نیرنگ خیال‘ کے ایڈیٹر عموماً ’شذرات‘‘ کے زیرعنوان، حالات و واقعات نیز مضامین کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے ’نیرنگِ خیال‘ کے شمارہ نومبر ۱۹۲۶ء میں ’لمعات‘ کے زیرعنوان تحریر کردہ اداریہ کا انداز ملاحظہ ہو۔

’’الحمدللہ‘‘ نیرنگ خیال، کا اجراء جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر عمل میں آیا تھا۔ وہ سوا دو سال کی محنت شاقہ اور اپنے مطب کی تمام آمدنی کو ’نیرنگِ خیال‘ کی بھینٹ چڑھا دینے کے بعد پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ سب سے اوّل ’نیرنگ خیال‘ کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی نظیر اُردو رسائل کی تاریخ میں عنقا ہے۔۔۔ ’نیرنگِ خیال‘ کے اجراء سے پبلک میں اردو رسائل کے مطالعہ کا ایک خاص مذاق پیدا ہو گیا ہے۔۔۔ مضامین کے لحاظ سے نیرنگِ خیال‘ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں بعض ایسے اعلیٰ پایہ کے ادیب مضامین لکھتے ہیں جو دوسرے رسائل کو میسر نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ’نیرنگ خیال‘ کی حقیقی ترقی کا باعث ہے۔۔۔‘‘

’’نیرنگ خیال‘‘ کے ایک اور شمارہ (تاثیر نمبر۔ ۱۹۶۷ء) کا اداریہ جو ’تعارف‘ کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے کچھ یوں بھی زیادہ ہے کہ یہ خود حکیم یوسف حسن صاحب کا تحریر کردہ ہے اور اس میں رسالہ کے بارے میں ایک دو اہم حوالے بھی ہیں۔

’’نیرنگِ خیال‘ کا اجراء جولائی ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا اور ۱۹۲۵ء میں ’نیرنگ خیال‘ نے پہلا عید

نمبر شائع کیا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ۴۸ سال میں نیرنگِ خیال نے مختلف موضوعات پر قریباً ایک سو نمبر شائع کیئے ہونگے۔ ہر سال ایک سالنامہ شائع ہوتا تھا جس کی بڑی دھوم دھام ہوتی تھی بلکہ Annual کے لیے ’سالنامہ‘ کا لفظ بھی ’نیرنگ خیال‘ کی ایجاد ہے۔۔۔ اگر زندگی نے وفا کی اور مجھے ہمت اور توفیق ہوئی تو اردو ادب کا سب سے بڑا ’شاہکار‘ نیزنگِ خیال کا ’جوبلی نمبر شائع ہوگا۔ ’نیرنگ خیال نے اپنی زندگی کے ابتدائی بیس سالوں میں بڑے معرکے کے نمبر شائع کیے ہیں اور انشاء اللہ ’نیرنگ خیال‘ کا یہ نمبر ’نیرنگ خیال‘ کے تمام سابقہ نمبروں سے یقیناً افضل ہوگا۔۔‘‘

رسائل و جرائد کا دورِ اوّل گزر جانے کے بعد ایک سے بڑھ کر ایک علمی و ادبی مجلّے میدان میں آگئے۔ ان ادبی رسائل کے لیے حالات بھی قدرے ساز گار ہوتے چلے گئے۔ اُردو زبان و ادب نے بھی ادبیات و لسانیات کی دنیا میں ایک مقام حاصل کر لیا۔ یوں تقسیم برصغیر سے چند سال پہلے اور بعد میں جو قابل ذکر رسائل و جرائد نمایاں نظر آئے ان میں ماہنامہ ’افکار‘ کا نام ادبی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جو ۱۹۴۵ء میں ’دارالاقبال‘ بھوپال سے جاری ہوا اور تا حال پاکستان (کراچی) سے اس کا ادبی سفر جاری و ساری ہے۔ ’افکار‘ کے پہلے شمارہ کے اداریہ بعنوان ’’آغازِ کار‘ میں اس رسالہ کے جاری کرنے کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی گئی۔

’’مال و دولت کی تمنا اور شہرت و نمود کی ہوس ہمارے ارادوں کی بلندی کو نہیں چھو سکتی۔ جس قوت نے ہمارے دامن کو جھٹکا دیا، وہ اردو کی خدمت کا جذبہ بے پایاں ہے۔‘‘

ماہنامہ ’افکار‘ کے اس پہلے اداریہ میں غرض و غایت اور عزم و ہمت کے اظہار کا انداز بعینہ وہی ہے جو سہ ماہی ’الاقرباء‘ کے پہلے شمارہ (برائے سہ ماہی جنوری۔ مارچ ۲۰۰۱ء) کے اداریہ بعنوان ’’تمنا کا پہلا قدم‘‘ میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ سید منصور عاقل ’الاقرباء‘ کے لیے اپنے مخصوص انداز اداریہ نویسی کا آغاز غالب کے خوبصورت شعری حوالے سے یوں کرتے ہیں:

’’غالب کے لیے تو دشت امکاں کی تمام وسعتیں سمٹ کر نقش پا بن گئی تھیں لیکن ہم نے جس دشتِ خار میں تمنا کا پہلا قدم رکھا ہے وہاں پہلے ہی بہت سے سودا صرف برہنہ پا ہی نہیں بلکہ

پاشکستہ ولہولہان نظر آتے ہیں۔۔ چنانچہ ہم نے۔۔ اس ادراک کے باوجود کہ ماحول ادبی صحافت کے لیے سخت ناساز گار ہے ”رختِ سفر باندھ لیا ہے۔“ (شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء)

موجودہ دور کے چند اہم رسائل و جرائد میں جنہیں تاریخ اردو ادب میں سنگ میل کی سی اہمیت حاصل ہے، ان میں 'ادبی دنیا (لاہور)، نیا دور (کراچی)، فنون (لاہور)، اوراق (لاہور) اور نقوش (لاہور) کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ ان علمی و ادبی مجلوں نے ادب کے باب میں نئے نئے تجربات کر کے اردو زبان میں عالمی ادب کا ہم پلہ ادب تخلیق کیا اور قارئین کے ادبی ذوق و شوق کی تسکین کے اسباب فراہم کیے۔ لیکن ان رسائل کے اپنے مسائل بھی ہیں۔ تاہم 'الاقرباء' کے اداریوں میں کئی ایک مشکلات کے باوجود نجی مسائل کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ صرف علمی و ادبی اور قومی و ملی مسائل نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قارئین 'الاقرباء' کے اداریوں کے اندازِ تحریر اور زبان و بیان میں انفرادی شان محسوس کرینگے اور یہ انفرادیت ہی ان اداریوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ جناب عاقل 'قرطاس و قلم' کی آزمائش کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

> ”اردو زبان میں جو ادب تخلیق ہوا ہے وہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ وہ ایک حسین و دلپذیر کثیر اللسانی پس منظر سے مالا مال ہے۔۔۔ قیام پاکستان سے قبل اور ایک مدت بعد تک نثری و شعری تخلیقات میں یہ رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے لیکن معاشرتی ڈھانچے میں تیزی سے رونما ہونیوالی تبدیلیوں کا عمل جس کو مادّی ترجیحات اور مقصود بذات خواہشات نے بنیاد فراہم کی ادب میں ایک ایسے زوال آمادہ رجحان اور فکر و نظر کی بے بضاعتی پر منتج ہوا ہے جس نے معیار و مقدار کے امتیاز و تناسب کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔“

ادبی رسائل میں 'ادبِ لطیف (لاہور)، بھی بڑی شہرت کا حامل مجلّہ رہا ہے۔ اس کے سالنامہ ۱۹۶۸ء کے اداریہ کا اقتباس نذر قارئین ہے۔ تاکہ اداریوں کے باب میں اس کے اندازِ تحریر کا بھی اندازہ ہو جائے۔

> ”ادب لطیف کا یہ ضخیم سالنامہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، تکمیل کی آخری منزل

تک پہنچتے پہنچتے جن جن دشوار گزار مرحلوں سے گزرا، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ادبی رسالوں سے وابستہ ہیں یا رہے ہیں۔۔۔ آپ بخوبی واقف ہونگے کہ 'ادب لطیف' شروع سے اس ادب کا قائل رہا ہے جس کے سوتے براہ راست زندگی سے پھوٹتے ہیں اور زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔''

اس وقت 'فنون (لاہور) کے دو شمارے زیر نظر ہیں۔ ان کے اداریوں کے رنگِ تحریر کے نمونے بھی نذرِ قارئین ہیں۔ اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارہ کا اداریہ 'حروف اوّل' کے عنوان سے تحریر ہے۔

''ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُردو علم وفن میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا، جسے ہم نے دریافت کیا۔۔۔ ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہمیں اپنے ذوقِ علم وفن کو دوسروں سے متعارف کرانے کا حق کیسے پہنچا۔ تو عرض یہ ہے کہ فن ہو یا ذوقِ فن، ہمیشہ تشنہ اظہار رہتا ہے۔ اور 'فنون' اس کے مرتبین کے ذوق کا اظہار ہے۔۔۔

مجلّہ 'فنون' کے ساتھ ہی ادبی رسائل کا ایک اور معروف نام ذہن میں آتا ہے۔ اور وہ ہے 'اوراق (لاہور)، جس کے عملہ ادارت میں ادبی دنیا کی دو اہم شخصیات کی محنت بھی شامل رہی ہے۔ 'اوراق' جولائی ۱۹۶۸ء کا ایک شمارہ اس وقت زیر نظر ہے۔ اس شمارہ کا اداریہ بعنوان 'پہلا ورق' انہی دونوں شخصیات کا تحریر کردہ ہے۔ پہلا حصہ ڈاکٹر وزیر آغا نے دوسرا حصہ عارف عبدالمتین نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے حصہ کے اداریہ میں تحریر کرتے ہیں۔

''۔۔۔ اوراق نے ابتداء ہی میں یہ پالیسی اختیار کر لی تھی کہ وہ اپنے متن میں ادبی موضوعات کے علاوہ ان علمی موضوعات کو بھی جگہ دے گا، جن کے ڈانڈے ادب سے ملتے ہیں تا کہ ادب کی حدود کشادہ ہوں اور اس میں طول 'عرض' گہرائی اور وقت کی سطحیں نمودار ہو سکیں۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کے اس پالیسی بیان کے بعد اداریہ کے دوسرے حصہ میں عارف عبدالمتین تحریر کرتے ہیں:

''۔۔۔ ہم نے 'اوراق' کی تدوین وترتیب کے دوران زندگی کے اس مسلک کو ہمیشہ اپنے لیے

مشعل راہ بنایا ہے، جس کے تحت 'اوراق' کے مندرجات ہمیشہ ایسے ادب عالیہ کی پیشکش کا شرف حاصل کرتے رہے ہیں۔ جو روح عصر کا بھرپور نمائندہ ہونے کے باوصف 'عصریت' کے کسی پہلو کا حامل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خصوصیت صحافت کی ہے، ادب کی نہیں ہے۔''

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ اداریئے اخبار و رسائل کی روح سمجھے جاتے ہیں۔ ان اداریوں کا مقصد جہاں قارئین کو اپنے جاری کردہ اخبار و رسائل کی پالیسی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے' وہیں اس کے ساتھ ہی شائع شدہ مضامین، مضمون نگار، ادبی و معاشرتی مسائل کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ قارئین کی ذہنی قوتوں کے فروغ اور ان کی رہنمائی کا مقصد بھی ہوتا ہے۔ لٰہذا اداریہ نویس کو گزرتے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے تاکہ ادب و سیاست میں تیزی سے رونما ہونیوالی تحریکوں اور تبدیلیوں سے آگاہی رہے اور یوں بروقت قارئین کی رہنمائی ہوسکے۔

'الاقرباء' کے قارئین 'الاقرباء' کے اداریوں کو پڑھ کر یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان اداریوں کا تانا بانا تازگی، شگفتگی اور معلوماتی پیرایۂ اظہار سے مزین ہے، کہیں بھی چندے کی اپیلیں اور ذاتی عناد و فساد کی باتیں نہیں ہیں بلکہ خالص علمی و ادبی مسائل پر فکر انگیز اور خرد افروز تبصرے شامل ہیں ملاحظہ ہو ایک اقتباس بعنوان 'ادب میں سرقہ و خیانت کے مسائل''۔ (مطبوعہ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء)

''ادب اور فنون لطیفہ تقدیس و تکریم کے اس لیے مستحق قرار پاتے ہیں کہ انسانی ذہن کی بہترین تخلیقی، ایجادی اور اختراعی صلاحیتیں ان شعبوں میں نہ صرف نشوونما پاتی ہیں بلکہ ان کے اظہار و ابلاغ کے نتیجہ میں ایک مہذب 'متمدن اور شائستہ معاشرہ کے خدوخال بھی مرتب ہوتے ہیں ایسے تمام ادیب، شاعر و فن کار جو اپنے رشحاتِ فکر کی انفرادیت کا اختصاص و امتیاز رکھتے ہیں ان کا یہ حق تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی تمام نمو پذیر کاوشوں کے تخلیقی نتائج کے بلا شرکت غیرے مالک و مختار ہیں اور ان کی ذہانت و بصیرت کے تراشیدہ حروف ہوں کہ نقش ان کا اثاثۂ دانش قرار پاتے ہیں سرقہ و خیانت کے خلاف ان کا تحفظ ہر مہذب معاشرہ کا فرض ہونا چاہیئے۔''

منصور عاقل صاحب اپنے قلم زرنگار سے صفحہ قرطاس پر الفاظ کی شکل میں جو لعل و جواہر بکھیرتے ہیں وہ ہر شمارہ کے اداریہ کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ مشہور دانشور، شاعر اور محقق عبدالعزیز خالد صاحب نے سید منصور عاقل کو اپنے ایک مکتوب میں لکھا۔۔۔

”اردو کا ادبی رسالہ شائع کرنا ایک عبادت ہے اور جو دیوانے یہ عبادت کر رہے ہیں، میں انہیں سلام کرتا ہوں۔۔۔“

فی الحقیقت صورت احوال بھی یہی ہے، بار دوش کو اٹھانے کا یہ کام عالم شوق و سرمستی میں انجام دیا جا رہا ہے۔ ادارہ کا کل اثاثہ صرف فرد واحد کے پائے استقامت میں سمٹ آیا ہے جو ستائش کی پروا اور صلے کی تمنا سے بے نیاز ہو کر اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنا دھن من حتیٰ کہ اپنی صحت بھی داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

ایک اداریہ ’قرطاس وقلم کی آزمائش‘ (شمارہ۔ اپریل تا جون ۲۰۰۱ء) میں مصنوعی دانشوری کا ذکر کرتے ہوئے نہایت چابکدستی سے نشتر چلائے ہیں۔ اسی طرح ہر اداریہ کا انداز بیاں بہت منفرد ہے صرف چند اداریوں سے مختصر اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ ادبی اداریہ نویسی میں منصور عاقل کے انداز نگارش کی انفرادیت اور اداریوں کے عنوانات میں حسن انتخاب کا اندازہ کیا جا سکے۔

اداریہ بعنوان ”ادب میں تطہیر کا عمل“ (مطبوعہ شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء)

”۔۔۔اس معنوی و نظریاتی سیاق و سباق میں جب ہم آزادی کے بعد نصف صدی سے زیادہ مُدت پر محیط اپنے ملک میں ادب کے ارتقاء اور رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ادب عصری تقاضوں سے تو یقیناً ہم آہنگ رہا اور تند و تیز انداز میں مزاحمتی کردار بھی ادا کرتا رہا مگر نہ صرف قدر و مقدار کا تناسب درہم برہم ہوتا گیا بلکہ معاشرتی تطہیر و اصلاح کا عمل بھی جو ادب کا ایک اہم فریضہ ہے ایک حد تک منفی رجحانات کے زیر اثر چلا گیا۔“

اداریہ بعنوان ”ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے“ (مطبوعہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء)

”اکیسویں صدی اپنے آغاز ہی سے کچھ اس انداز سے محوِ خرام ہے کہ تمام کائنات ارضی لرزہ براندام نظر آتی ہے۔ آثار و قرائن وسوسوں اور نت نئے اندیشوں کو جنم دے رہے ہیں۔ دنیا

دو عالمگیر جنگوں کے وحشتناک تجربات سے گزر چکی ہے اور اب مزید کسی ایسے تجربے سے دو چار ہونے کے تصور سے بھی مبہوت و سراسیمہ دکھائی دیتی ہے۔۔۔ ایسے ہی تمام خدشات نے عالمِ انسانیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔۔۔ عالمی ادب آخر اس قدر بے بضاعت و بے اثر کیوں ہو گیا کہ عالمی مسائل کے حل کے لیے صرف اور صرف طاقت و تشدد پر انحصار کیا جانے لگا۔۔ پاکستان بھی اس تناظر سے باہر کوئی خطۂ ارضی نہیں لیکن یہاں قرطاس و قلم جس طرح ایک انبوہ ناسزا کے ہاتھوں یرغمال ہو کر رہ گئے ہیں اس المیہ کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے ان لوگوں کے لیے عالمی مسائل تو بعید از فکر موضوعات ہیں ہی لیکن انہوں نے مروجہ اصنافِ ادب کی جدیدیت کے نام پر جو مٹی پلید کی ہے وہ بذات خود ایک حادثہ جانکاہ ہے۔۔۔ ہئیت و اسلوب کو فن کی نئی جہتوں سے روشناس کرانے کی بجائے ایسے کھردرے، نامانوس اور قبیح طرز کلام کو اختیار کیا ہے جس نے ہماری شاعرانہ روایت کے تسلسل کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ ناول کی صنف قریب قریب بوجوہ معدوم ہو چکی ہے جبکہ افسانہ فنی ارتقاء اور موضوعاتی وسعت سے محروم نظر آتا ہے۔ مزاح جو ایک باقاعدہ فن تھا اور جس کی آبیاری ذہانت، شعور اور علمیت کے مرہون منت تھی اب ایک جنس بازاری بن کر رہ گیا ہے بلکہ یہ استہزا نگار خود کو مزاح نگار سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں''۔

اداریہ بعنوان ''اہل قلم اور ذرائع ابلاغ'' (مطبوعہ شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۵ء)

''اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن صرف کثیر الجہت ہی نہیں ہو چکے ہیں بلکہ تحریص و ترغیب کا منبع و محور بھی بن چکے ہیں جس کے نتیجہ میں ہمارے دانشور طبقے بالخصوص اہل قلم کا اس سحر سامری کی گرفت میں آ جانا اس لیے ایک المیہ ہے کہ نہ تو علوم کی جانب سنجیدہ رویے فروغ پا رہے ہیں اور نہ ادب میں زہرہ گداز سعی و کاوش کا وہ ماحول پنپتا نظر آتا ہے جو ہمارے بیشتر اہل فکر و دانش کا نشانِ امتیاز تھا۔''

اہل علم ان اداریوں میں بیان کردہ مواد سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اداریئے کس قدر دنیائے معنی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ اداریئے اگرچہ وقتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے

ہیں اس کے باوجود ان میں بیان کردہ ابدی حقیقتوں کی بنا پر ہر دور کی آواز سنائی دے گی۔ اس لیے کہ ان اداریوں کا لب ولہجہ نہ ہنگامی ہے اور نہ جذباتی اور نہ ہی یہ روایتی قسم کے اداریئے ہیں، بلکہ ان میں آپ کو کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی نہایت نفیس پُروقار زبان پڑھنے کو ملے گی۔ نئے الفاظ و اصطلاحات کے دروبست ایسے کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ قاری ان الفاظ کی شیرینی بھی محسوس کرتا ہے۔ یہ اداریئے محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، یہ رفعت خیال اور فکر و تدّبر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ہر اداریہ اپنے قاری کو ایک دفعہ تو سود و زیاں کے کانٹے پر اپنے آپ کو تولنے پر مجبور کرتا ہے۔

سہ ماہی ’الاقرباء‘ کے شماروں میں قارئین کے خطوط و مراسلات کا حصہ بھی پر از معلومات اور دلچسپ ہوتا ہے، اہل قلم حضرات اپنی بے لاگ تنقید اور تبصروں سے نوازتے ہیں ان مراسلات میں بھی ’الاقرباء‘ کے اداریوں کے سلسلہ میں بڑی ادیبانہ باتیں اور تاثرات نذر قارئین ہوتے ہیں۔ ملک کے مشہور ادیب، دانشور اور نقاد ڈاکٹر انور سدید، اداریہ ’مافیا‘ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

> ’’۔۔۔الاقرباء کے اداریہ ’مافیا‘ میں آپ نے ادب پر جس ’کینسر‘ کے حملے کا ذکر لگی لپٹی رکھے بغیر کیا وہ آپ کے ادبی اور اخلاقی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے اور بے شمار ایسے لوگوں کی ترجمانی بھی کرتا ہے جو اس ’مافیا‘ کا شکار ہیں۔۔۔ ’الاقرباء‘ کی یہ خدمت سنہری حروف میں لکھی جائے گی‘‘۔

ڈاکٹر انور سدید، لاہور سے ایک اور اداریہ (ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا) کے بارے میں اپنے خط میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔۔۔

> ’’الاقرباء‘ کا سالنامہ ۲۰۰۵ء موصول ہوا، میں نے سب سے پہلے آپ کا اداریہ ’’ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا‘‘ پڑھا اور اس اداریئے کے تناظر میں وہ تمام، خبریں، بھی ذہن میں کہرام بپا کر گئیں، جن میں ایک مخصوص ادبی شخصیت کو ماورائے قانون فائدہ حاصل کرنے کے لیے قانون کو پامال کیا گیا۔۔۔ آپ کا یہ جرأت مندانہ اداریہ سیاست، صحافت اور ادب کا ایک مکروہ اور قبیح امتزاج پیدا کرنے والے ’مافیا‘ کے خلاف ایک موثر احتجاج کی

آواز ہے۔ تاہم اسے 'صحرا میں اذان' کے مترادف بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔۔۔'' (الاقرباء شمارہ اپریل۔ جون ۲۰۰۵ء۔ صفحہ ۱۷۰)

یہ تمام اداریئے سید منصور عاقل صاحب کے گہرے تفکر اور رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ جن کو آپ نے کمال خلوص اور دلسوزی سے سپرد قلم کر کے فکر و عمل سے ہمارے مردہ ضمیروں کو جھنجوڑا ہے۔ شاید کسی کو تو احساس سودوزیاں ہو، کوئی تو ہو جو تطہیر ادب و معاشرہ کا پرچم تھام کر آگے بڑھے۔

اس قافلے میں سر بگریباں کوئی تو ہو　　کوئی تو ہو کہ ہو جسے احساسِ گمرہی

(منصور عاقل)

(مطبوعہ سہ ماہی 'الاقرباء شمارہ اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء)

افتخار عارف (ستارۂ امتیاز، ہلالِ امتیاز)
صدر نشین مقتدرہ قومی زبان۔ پاکستان
مورخہ ۱۶ فروری ۲۰۱۰ء

تعارف مصنّف

حضرت منصور عاقل کا نام جہانِ اردو میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ ممتاز شاعر، نامور محقق، صاحب نظر نقاد اور معتبر مدیر کی حیثیت سے اُن کا علمی سفر گزشتہ پچاس برسوں سے زیادہ عرصے کو محیط ہے۔ انھوں نے اردو کے ایک ہمہ جہت قلم کار کی حیثیت سے نمایاں زندگی گزاری ہے۔ وہ غیر منقسم برصغیر کے نامور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کا ایک ایک فرد اپنے علمی قدوقامت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کا مالک رہا ہے۔ ان کے نانا سید فدا گلاوٹھوی حضرت داغ دہلوی کے حلقہ تلامذہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ والدہ ماجدہ سیّدہ تلمیذ فاطمہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور وہ بھی خانوادے میں ایک خوش فکر شاعرہ کے طور پر عزت و تکریم کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ سید منصور عاقل کے برادر بزرگ علامہ سیّد قابل گلاوٹھوی کا نام نامی پاک و ہند میں مشہور و معروف تھا جن کے مجموعہ شعر ''دبستان قابل'' کی ترتیب اور اہتمامِ اشاعت کا اعزاز بھی سیّد منصور عاقل کو حاصل ہے۔

حضرت منصور عاقل انگریزی، اردو اور فارسی زبانوں پر دسترس کامل رکھتے ہیں۔ پاکستان کی سول سروس میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے کے بعد عزت و آبرو کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ دورانِ ملازمت جس جس شعبے میں بھی گئے اور انھوں نے جن جن شہروں میں بھی کام کیا اپنے کردار اور صلاحیتوں کے سبب رفقائے کار کے دلوں میں بھی گھر کیا اور اہل شہر نے بھی خدمات کے سبب عزت و احترام میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ملک میں اور ملک سے باہر اردو زبان و ادب کے ضمن میں ہونیوالے متعدد مذاکروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور اردو کی ترویج و فروغ کے سلسلے میں اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ وہ جرمنی، سوئٹزرلینڈ، فرانس، ہالینڈ، سویڈن، سعودی عرب، بھارت اور

بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں ہونے والی تقریبات میں شریک ہوئے اور وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں سے تبادلۂ خیال کیا اور پاکستان اور اردو کی عزت و وقار میں اضافے کا سبب بنے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر وقتاً فوقتاً اسناد و اعزازات سے نوازا جاتا رہا۔ اس ضمن میں انجمن ترقی اردو لاہور کی جانب سے ہدیۂ سپاس و سند اعتراف، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے ’نشان اعتراف‘ بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی جانب سے ’سند اعتراف خدمت‘ اور دیگر اداروں کی جانب سے وقتاً فوقتاً اعزازات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اُن کا ثروت مند ادبی سفر ۱۹۵۹ء سے تا حال کم و بیش پانچ عشروں کو محیط ہے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ’’حرف بہ حرف‘‘، ’’برگ سبز‘‘، ’’دبستان قابل‘‘، ’’مبارک نامہ‘‘، ’’خامہ خونچکاں اپنا‘‘ اور ’’شہاب دہلوی۔ شخصیت اور فن‘‘ ان کی وہ تصانیف ہیں جو خالصتاً علمی اور ادبی کتب کے ذیل میں آتی ہیں۔ اپنے طویل علمی اور تخلیقی سفر کے دوران ملک کے ممتاز روزناموں اور ماہناموں میں سیّد منصور عاقل کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس عرصے میں روزنامہ ’’تسنیم‘‘، روزنامہ ’’زمیندار‘‘ سہ ماہی ’’افق‘‘ اور سہ ماہی ’’اردو نامہ‘‘ سے وابستگی سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ۲۰۰۱ء سے وہ مشہور تحقیقی اور تخلیقی مجلّے سہ ماہی ’’الاقرباء‘‘ کی مجلس ادارت کے صدر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ دینی، تہذیبی، علمی اور ادبی روایت کی ترجمانی کے طور پر ’’الاقرباء‘‘ بہت کم عرصے میں اپنے لیے اعتبار و امتیاز کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

’’گہواہ سخن‘‘ ان کی نگارشات شعر پر مشتمل ہے۔ غزل کی صدیوں پر پھیلی ہوئی ادبی روایت میں سیّد منصور عاقل جس عمدگی سے شعر کہتے ہیں اس نے انھیں پاکستان کے صف اوّل کے غزل گو شعراء میں شامل کر دیا ہے۔ نئے مضامین، فن عروض اور صحت زبان پر دسترس، ہنر کے تمام قرینوں سے آگاہی نے انھیں جو مقام اعتبار بخشا ہے وہ ہمارے زمانے میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔

ہم صبح و شام ہزاروں لوگوں سے ملتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں مگر ان میں کم کم لوگ ایسے ہوتے

ہیں جن کو صاحب شخصیت افراد کے ذیل میں رکھا جا سکے۔ حضرت منصور عاقل میرے لیے صاحب شخصیت بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاقات اور صورت آشنائی تو بہت پہلے کی ہے مگر گزشتہ بیس برسوں سے میں ان کے حلقہ نیاز منداں میں شامل ہوں۔ جب بھی اُن سے ملنے کا موقع میسر آتا ہے کوئی نہ کوئی اچھا شعر، اچھا نکتۂ ادب ضرور لے کر اُٹھتے ہیں۔ تحقیق، تاریخ اور علمی مسائل پر ایسی مستنظہر اور دل کو چھو لینے والی گفتگو کا ہنر کم کم لوگوں کو آتا ہے۔ تبحر علمی کے باوجود خُردوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ عاجزی اور انکسار کا وصف ایسا کہ بس دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ خوش گفتاری اور خوش مزاجی کس کس وصف کی تعریف کی جائے۔ ان کی محفل میں بیٹھ کر اور ان سے مل کر ایک فرحت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ میرے نزدیک بڑے آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کم علم رکھنے والوں کو بھی اپنے سینے سے لگاتا ہے۔ ان کے اصلاحِ احوال کے لیے جو سلیقہ اختیار کرتا ہے وہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس سے کسی قسم کی نخوت یا تمکنت کا اظہار ہو، بس بات بات میں اصلاح کر دی جاتی ہے۔ میں اسلام آباد میں ہی نہیں پاکستان میں جب اردو کی علمی و ادبی دنیا پر نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ حضرت منصور عاقل جیسے لوگوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔

میں سیّد گرامی مرتبت کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ پروردگار عالم منصور بھائی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ان کی عزت و آبرو میں، سرفرازی و سربلندی میں اور طمانیت و سکون میں اضافہ فرمائے۔

۷۸۶

گزارشِ احوالِ واقعی

میرا ورثۂ شعر و ادب میرے بزرگوں کی عطا ہے۔ والدہ مرحومہ نے کہ سخن فہمی و سخن سنجی جن کے خاص اوصاف تھے مجھے صغیر سنی ہی میں حضرت شیخ سعدیؒ کی گلستاں و بوستاں کے درس مکمل کرادیئے تھے۔ محفلوں میں بلکہ اکثر گھروں میں مثنوی مولانا رومؒ کا ورد اس کثرت سے ہوتا تھا کہ بچوں تک کو بعض اشعار ازبر ہوگئے تھے۔ میرے نانا حضرت سیّد عبدالوحید فدا گلاؤٹھوی جو نواب مرزا داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں شامل تھے ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد مستقلاً وطن (قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر) ہی میں اقامت اختیار کرچکے تھے جس کے نتیجہ میں شعری نشستیں اور مشاعرے مقامی تہذیب و ثقافت کی پہچان بن گئے ان مشاعروں نے نئی نسل کے شعور کو ادبی سانچوں میں ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ میرے حافظہ پر اُس ادب پرور ماحول کی یادیں بھی نقش ہیں جب میرے بڑے بھائی علامہ سید قابل گلاؤٹھوی جو دہلی میں مقیم تھے تو اُن کی اردو اور انگریزی صحافت میں شہرت اور فارسی و اردو شاعری میں اُن کی بدیہہ گوئی کا سکّہ جم چکا تھا چنانچہ ماحول اور شخصیتوں کے فیضان سے مجھے بہرہ مند ہونے کے مواقع اس طرح ملے کہ اپنے بزرگوں کی اُنگلی پکڑ کر مجھے ایسی ایسی محفلوں میں جانے کی سعادت نصیب ہوئی کہ ان کی سطوت و عظمت کا اُس وقت مجھے شعور تھا نہ احساس مگر اب وہ میرے وجدان کا عظیم ترین سرمایہ ہیں۔

میرے والد محترم قاضی سیّد حبیب اللہؒ ایک جیدّ مذہبی سکالر، حافظِ قرآن، ماہر تعلیم، دہلی طبیہ کالج سے فارغ التحصیل مستند طبیب اور السنۂ شرقیہ بالخصوص عربی و فارسی پر دسترس رکھتے تھے۔ کثرت مطالعہ اور تحقیق کے گہرے علمی شغف کے باعث اُن کا دارالمطالعہ نادر مخطوطات اور ہزاروں قدیم و جدید کُتب پر مشتمل تھا اور اُس قت مجھے شعور نہ تھا کہ یہ سب کچھ کتنی بڑی دولت تھی میرے والد اگست ۱۹۴۸ء میں جب پاکستان آئے تو اس عظیم اثاثۂ علمی سے محرومی کی روح فرسا یادوں نے اُنھیں جانبر نہ ہونے دیا اُنھوں نے ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور میں رحلت فرمائی اور وہیں

مدفون ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ شائد اُنھیں کا فیضانِ روحانی تھا کہ مجھے لاہور ہی میں اپنا عہد طالب علمی بسر کرنے کا موقع میسر آیا جہاں مجھے حصولِ علم ہی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی بلکہ اِس گہوارۂ تعلیم و تعلّم میں میری فکری نشو ونما عہد ساز شخصیات اور لاہور کے دانش و آگہی سے معطّر شعری و ادبی ماحول کی رہینِ منّت ہے۔

میں اس اعتبار سے بھی خوش قسمت رہا کہ میری ملازمت کا آغاز شعبۂ تعلیم سے ہوا اور اس سفر کا آخری سنگِ میل گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان تھا۔ جہاں سیاسیات و تاریخ کے تدریسی فرائض میرے سپرد تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ملتان کی شعری فضا نے میری شعر گوئی کو اقلیم غزل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر دیا البتہ تعلیم کے شعبے کے بعد حکومتی شعبۂ اطلاعات و ابلاغیات سے وابستگی پندرہ سال کے طویل تر عہد پر مشتمل ہے اور اسی عہد میں صحافت و ادب کچھ اس طرح میرے قدم بقدم رہے کہ ملک کے اہل قلم سے میرا حلقۂ تعارف و رفاقت پشاور سے کراچی اور آزاد کشمیر سے بلوچستان تک وسیع ہو گیا اور الحمدللہ میں آج بھی پاکستان کے کسی بھی شہر میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔ یہاں مجھے اپنے عہد طالب علمی میں کہی گئی طرحی غزل (غالب کی زمین میں) کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

ذکر چھوڑ آئے ہیں ہم جہاں جہاں اپنا   ہیں وہیں وہیں چرچے آج بھی محبت کے

زیرنظر اداریوں کے پس منظر میں میرے ذہنی ارتقا کے متعدد سنگ ہائے میل شامل ہیں جن میں اسّی کی نصف اوّل دہائی کے دوران وفاقی وزارتِ مالیات کے افسر کی حیثیت سے صوبۂ پنجاب میں آرکائیوز (قدیم تاریخی دستاویزات) کے شعبہ میں بطور سربراہ محکمہ نیز بہ لحاظِ عہدہ معتمد (سکریٹری) مجلسِ زبانِ دفتری پنجاب میرا عہدِ تقرری خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں علمی تحقیق اور ملک میں اردو کے آئینی طور پر قومی و سرکاری زبان کی حیثیت سے عملاً نفاذ کے سلسلہ میں جو بھی حقیر سی کاوشیں کرنے کا مجھے موقع میسر آیا اُس نے ان ہر دو موضوعات پر میرے شعور کو

جلا بخشی نیز قومی و بین الاقوامی سطح پر کانفرنسوں میں شرکت اور پنجاب آرکائیوز کی ایک علمی تحقیقی ادارے کی حیثیت سے تنظیم نو کرنے کے بعد اندرون و بیرون ملک محققین اور سکالرز سے میرے ذاتی روابط میں تیز تر اضافہ ہوا۔ فرانس اور امریکہ سے دو ریسرچ سکالرز نے پاکستان کے حوالے سے میرے عہد تقرری میں اپنے تحقیقی مقالات مکمل کیے جن پر اُن کے ممالک کی متعلقہ جامعات نے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں عطا کیں جب کہ اندرون ملک سکالرز اور طلباء و طالبات نے پنجاب آرکائیوز میں نادر تحقیقی مواد سے استفادہ کیا۔ اسی دوران صدر پاکستان نے ملک میں آرکائیوز کی تنظیم نو کی پالیسی مرتب کرنے کے لیے وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی سربراہی میں ایک قومی کمیشن ترتیب دیا جس کی رکنیت کا مجھ خاکسار کو بھی اعزاز حاصل تھا اور بطور یک رکنی کمیٹی کمیشن کی حتمی رپورٹ بھی اِسی خاکسار کی مرتب کردہ تھی جو کابینہ ڈویژن کی معرفت صدر مملکت کو پیش کی گئی تاہم بعد میں تا حال اس رپورٹ کا مفقود الخبر ہو جانا ایک الگ دل دوز کہانی ہے جس کے بیان کا یہاں محل نہیں۔ البتہ اس کمیشن کی رکنیت کے باعث مجھے ملک کے تمام صوبوں میں سرکاری اور نجی ذخائز کتب، لائبریریوں اور آرکائیوز کی تنظیموں سے تفصیلاً آگاہی نصیب ہوئی دوسری طرف پنجاب میں مجلس زبان دفتری کی تشکیل نو میں جن بزرگوں اور بلند پایہ علمی شخصیات کا گراں بہا تعاون مجھے حاصل رہا اُن میں، دیگر کے علاوہ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد معز الدین اور ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور شامل ہیں۔ ان حضراتِ گرامی نے میری ذاتی درخواست پر مجلس استنادِ لغت (اردو بحیثیت زبانِ دفتری) کا رکن بننا قبول فرمایا۔ اسی دور میں مجلس زبان دفتری کے زیر اہتمام حکومتِ پنجاب کی جانب سے اردو زبان کے فروغ و ارتقا کے لیے ایک سہ ماہی لسانی، ادبی و تحقیقی مجلّہ ''اردو نامہ'' جاری کیا جس کے بانی مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے وابستگی میرے لیے سرچشمۂ عرفان و آگہی ثابت ہوئی۔ الحمدللہ کہ حکومتِ پنجاب کا یہ سرکاری مجلّہ آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

اردو زبان و ادب کی جو شمع میرے دل و دماغ میں روشن ہو چکی تھی اُس کو قائم و دائم رکھنے میں میرے ساتھ اُس وقت کے صدر انجمن ترقی اردو پاکستان اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم

کے جانشیں جناب (میجر) آفتاب حسن کا مربیانہ تعاون مجھے حاصل رہا۔ انھوں نے وفاقی حکومت میں اعلیٰ سطح پر منعقد ہونیوالے ہر اجلاس میں اردو کے بہ تعجیل نفاذ کے سلسلہ میں ہمیشہ میری تجاویز کی بھرپور تائید و حمایت کی میری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد مُحب گرامی پروفیسر فتح محمد ملک صاحب مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے صدر نشیں تھے انھوں نے بہ اصرار مجھے اُس اہم مجلس کے اعزازی سربراہ کے فرائض ادا کرنے کی پیش کش فرمائی جس کے دائرہ کار میں وفاقی حکومت کے جملہ قواعد و ضوابط اور فوقتاً فوقتاً وزارتوں اور محکموں کو جاری ہونیوالی ہدایات پر مشتمل ضخیم و مبسوط کتاب (Easta.Code) کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جانا شامل تھا تاکہ سرکاری سطح پر دفاتر میں اردو کو نافذ کرنے لیے یہ آخری رکاوٹ بھی دور ہو سکے۔ مجھے اس مجلس کے صاحبِ علم مترجم حضرات کی اعانت حاصل تھی چنانچہ بحمد اللہ یہ کام بخیر و خوبی انجام کو پہنچا جو محترم ملک صاحب کی اور میری دلی آرزو تھی۔

اس طویل پس منظر سے گزرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ سال ۲۰۰۱ء میں ایک علمی و ادبی اور تحقیقی سہ ماہی مجلّے ''الاقرباء'' کی مجلسِ ادارت کی صدر نشینی کے فرائض سنبھالتے وقت میرے ماضی نے مستقبل کے لیے جن تصورات کو جنم دیا اُن میں مجھے اکیسویں صدی میں ادبی اداریہ نویسی کا ایک ایسا منظر نامہ اُبھرتا دکھائی دیا جو ماضی سے بہت مختلف تھا۔ اس منظر نامے کا تقاضا تھا کہ ادبی اداریہ نویسی عصری معنویت کی ترجمانی کا بھرپور کردار ادا کرے اور کاملاً معروضی تنقید کے ذریعہ معرض وجود میں آنے والی تخلیقات کو سطحیت سے پاک کر کے اُنھیں معاشرتی تہذیب و ثقافت کی بنیاد فراہم کرے۔ میرے ایقان کا یہ نکتہ بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ ایسا ہی ادب عالم انسانیت کی ہمہ جہتی ترجمانی اور فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے اور یہی آفاقیت نسلِ انسانی کو ایک لڑی میں پُرو سکتی ہے لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب تخلیق کار کسی بھی لمحہ اپنے گردوپیش سے جُدا ہو اور نہ ماضی فراموش رویہ اختیار کرے۔

میں نے اپنے اداریوں میں بیک وقت اردو زبان و ادب پر بھی توجہ مرکوز کی ہے اور تحقیقی و تنقیدی موضوعات کے ابلاغ و اظہار کے لیے پُروقار زبان کو وسیلہ بنایا ہے جس کے بغیر یہ

موضوعات تشنۂ تفہیم رہتے ہیں اردو زبان اب ایک عالمی مرتبہ حاصل کرچکی ہے اور ہرنوع کے احساس کمتری اور تعصب نگاہی سے بالاتر ہوکر اس کا یہ حق تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ یہ نہ صرف پاکستان کی قومی زبان ہے بلکہ اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل ہونے کا کسی بھی دوسری زبان سے زیادہ استحقاق رکھتی ہے کہ خود اقوام متحدہ کے تعلیمی سماجی اور ثقافتی ادارے نے اپنے مستند تحقیقی اعداد و شمار شائع کر کے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ دنیا کی تقریباً چھ ارب آبادی میں کم و بیش ڈیڑھ ارب نفوس اس زبان میں بات کرنے اور سمجھنے پر قادر ہیں۔

''الاقرباء'' میں گزشتہ بارہ تیرہ برسوں میں شائع ہونے والے اداریوں کی قومی و بین اقوامی سطح پر علمی وادبی اور لسانی حلقوں کی جانب سے ہمہ گیر پذیرائی کے بعد اور ملکی و غیر ملکی معروف جامعیات بالخصوص ہارورڈ یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف واشنگٹن (امریکہ) میکگل یونیورسٹی (کینڈا) استنبول یونیورسٹی (ترکی) اوساکا یونیورسٹی (جاپان) اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) میں یہ مجلّہ معتبر تحقیقی مواد کا حامل ہونے کے باعث محققین اور طلباء و اساتذہ کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے چنانچہ مجھے اہلِ علم و دانش کے اِس اصرارِ پیہم کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا ہے کہ زیرِ نظر اداریوں پر مشتمل مجموعہ صاحبانِ فکر و نظر کی خدمت میں بصد عجز و نیاز پیش کر دیا جائے۔ والسلام

سیّد منصور عاقل

تمنا کا پہلا قدم

غالب کے لیے تو دشت امکاں کی تمام وسعتیں سمٹ کر نقش پا بن گئی تھیں لیکن ہم نے جس دشت خار میں تمنا کا پہلا قدم رکھا ہے وہاں پہلے ہی بہت سے سودا صرف برہنہ پا ہی نہیں بلکہ پا شکستہ و لہو لہان نظر آ رہے ہیں، بعض اقدار میں تبدیلی اور بعض میں پامالی کا عمل اس تیزی سے پھیلا ہے کہ زندگی نئے نظام ترجیحات میں اپنے سیاق و سباق ہی سے برگشتہ نظر آتی ہے مادیت کی سفاکانہ یلغار نے ادب و فنون کے ارفع تصورات کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور خود انسانی ذہن نے نسل انسانی کی ہلاکت کے لیے سائنس کی ترویج کے نام پر وہ اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ صرف ایک اشتعال پرور لمحہ تمام گردوپیش کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کر سکتا ہے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ لگتا ہے کہ دنیا بھر میں اخلاقی قدریں اور احترام انسانیت کے نظریات ٹھیٹ مادہ پرستی کے ہاتھوں یرغمال ہو کر رہ گئے ہیں تاہم اس ظلمت آلود فضا میں کہیں کہیں روشنی کی رمق دکھائی دیتی ہے جو نتیجہ ہے ان ارباب اخلاص کی بے لوث کاوشوں کا جو مادی و سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی کو اعتدال و توازن سے ہمکنار کرنے کے لئے فنون لطیفہ کی بقا اور اخلاقیات سے مرصع شعرو ادب کے ذریعۂ نجات ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

چنانچہ ہم نے اپنے سفر کا آغاز انہیں عوامل سے حوصلہ پا کر کیا ہے اور اس ادراک کے باوجود کہ ماحول ادبی صحافت کیلئے سخت ناسازگار ہے، رخت سفر باندھ لیا ہے کہ اس دشت خار میں ہم جیسے برہنہ پا کچھ اور بھی ہیں جو اس مٹی کو اپنے خون سے نمی بخش کر زرخیز بنانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔

ہماری مزید خوش بختی، یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسے ادارے کی سرپرستی حاصل ہے کہ جس کا نصب العین ہی قرابت و یگانگت اور ایثار و تعاون کو بنیاد بنا کر فلاحی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کی اعلی اقدار کو ارتقاء کی منزل سے ہمکنار کرنا ہے۔ الاقرباء فاؤنڈیشن اسلام آباد گزشتہ چند برسوں سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس انداز سے سرگرم عمل ہے کہ خود انحصاری اس کا نشان امتیاز اور بیرونی ذرائع تو کیا سرکار والا مدار تک سے کسی بھی طلب و خواہش سے

گریز اس کی پالیسی کا بنیادی ستون ہے یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا ہے کہ اس کے اراکین، ایثار پیشہ ہیں اور باہمی تعاون ہی کو بنیاد بنا کر کارہائے خیر کی ادائیگی میں مصروف عمل رہتے ہیں، اراکین کا حلقہ بحمد اللہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ وسعت حاصل کرتا جا رہا ہے اور اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی رکنیت کا نظام اس لئے پھیلتا جا رہا ہے کہ شرط رکنیت صرف بے لوث مقاصد سے اتفاق اور باہم دگر رشتہ و قرابت پر موقوف ہے مزید یہ کہ سیاست و فرقہ واریت ہمارے نصاب عمل میں شجر ممنوعہ قرار دیئے جا چکے ہیں کہ یہی بہت سی آلائشوں سے محفوظ رہنے کا معتبر طریقہ ہے۔

ہمارے لئے یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ہمیں ملک کے معروف و محترم اہل قلم خواتین و حضرات کا گرانقدر تعاون حاصل ہے جنہوں نے ہماری پہلی ہی التماس کو شرف پذیرائی بخشا اور ہمیں حوصلہ عطا کیا کہ اس سفر میں ہم تنہا نہیں بلکہ توشۂ سفر مہیا کرنے والے بھی ہمارے ساتھ ہیں، ہم نئے لکھنے والوں کا بھی دلی خیر مقدم کریں گے تا کہ چراغ سے چراغ جلتے رہیں اور ایک ایسا عالم امکاں منور نظر آنے لگے جو اعلی علمی و ادبی اور تہذیبی و ثقافتی روایات کا حقیقی وارث و امین بن جائے، ہم ادبی اجتہاد اور تجربات نو بہ نو کا بھی خیر مقدم کریں گے کہ ادب کوئی ساکت و جامد عمل نہیں لیکن ہم ادب میں اخلاق باختگی، ابتذال اور بازاریت کا ہرگز کوئی تصور نہیں رکھتے، اور ایسی تمام نگارشات کو غیر ادب تصور کرتے ہیں۔ اصناف ادب کی اشکال کو مسخ کرنا بھی ہمارا مسلک نہیں ہو سکتا اور زبان کے علمی وقار کو بھی مجروح کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، بعض عصری رجحانات جو ان عوامل سے متصادم ہیں ہم انہیں علمی بے بصری اور فنی کم مائیگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں کاش ہمارا نصاب تعلیم پھر ایک بار اس طرح مرتب ہو کہ اپنی تاریخ و روایات سے آگاہی اور السنہء شرقیہ بالخصوص عربی و فارسی کی معرفت کہ ہماری تہذیب و ثقافت کی امین بھی ہیں، ہمارے نئے لکھنے والوں کے لئے توشہء خیالات بن جائیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمارے عزائم میں استقامت عطا فرمائے اور الاقرباء فاؤنڈیشن کے حصول مقاصد اور اس مجلّہ علمی کی آبیاری کے عمل کو جاری و ساری رکھنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ (آمین) (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۱ء)

قرطاس وقلم کی آزمائش

زندگی ان گنت خانوں میں بٹے ہونے کے باوجود ایک وحدت ہے اور ایک ایسی وحدت کہ جس کا خمیر ہی کثرت سے اٹھا ہے ''نوع بہ نوع جہتوں نے اس کی آبیاری کی ہے اور نت نئے رنگوں سے مرتب ہونیوالی اس قوس قزح نے کائنات کی وسعتوں کو نور وظلمت کا ایک ایسا امتزاج عطا کیا ہے جو ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے اور اس کی آغوش ارتعاش سے ابھرنے والا آہنگ اس کی پہچان۔ ہر گزرنے والا لمحہ بے شمار تجربات ومشاہدات کو سمیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور اس طرح ماضی کے حال اور حال کے مستقبل میں منتقل ہونے کا عمل مسلسل جاری ہے، لیکن یہ عمل بیک وقت لوح تاریخ پر اپنے نقش بھی مرتسم کرتا جا رہا ہے۔ یوں حیات انسانی کی عہد بہ عہد روداد مرتب ہو رہی ہے اور زندگی کا ہر شعبہ مورخ کے قلم کی زد پر ہے، زندگی کے انہیں شعبوں میں ایک شعبۂ ادب بھی ہے جو دوسرے شعبوں کی طرح باہم وگر مربوط ومنسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد وممتاز کردار ادا کر رہا ہے کہ زندگی کے تمام نقش اس آئینہ میں منعکس ہو رہے ہیں۔

ادب صرف انسانی جذبوں اور رویوں کی داخلی کیفیات ہی کا ترجمان نہیں بلکہ وہ خارجی عوامل کی تلخ وشیریں حقیقتوں کا غماز بھی ہے ہر معاشرے کا عمرانی تشخص اس کے تہذیبی وثقافتی اور سیاسی واقتصادی فریم ورک میں رہتے ہوئے جغرافیائی خصوصیات اور تاریخی واقعات کا رہین منت ہے چنانچہ ادب ان تمام جہتوں کا احاطہ تاریخ کے واقعاتی انداز میں نہیں بلکہ فن کے جمالیاتی سانچوں میں ڈھال کر مختلف اسالیب نگارش کے ذریعہ کرتا ہے البتہ ہر ادب کا لسانی مزاج اس زبان کے تابع فرمان ہوتا ہے جو اس کا ذریعہ تخلیق بنتی ہے۔

اردو زبان میں جو ادب تخلیق ہوا ہے وہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ وہ ایک حسین ودلپذیر کثیر اللسانی پس منظر سے مالا مال ہے یہی وجہ ہے کہ اردو شعر وادب کا ارتقاء مزاج وآہنگ کے

اعتبار سے تنوع کا ایک خوبصورت شاہکار ہے جسے آب ورنگ بخشنے کے ساتھ ساتھ وقار وتمکنت عطا کرنے میں خصوصاً فارسی زبان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اور ایک مدت بعد تک نثری وشعری تخلیقات میں یہ رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن معاشرتی ڈھانچے میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کا عمل جس کو مادّی ترجیحات اور مقصود بذات خواہشات نے بنیاد فراہم کی ادب میں ایک ایسے زوال آمادہ رجحان اور فکر ونظر کی بے بضاعتی پر منتج ہوا ہے جس نے معیار ومقدار (Quality and Quantity) کے امتیاز وتناسب کو پلٹ کر رکھ دیا ہے اس تشویشناک صورت حال میں مزید اضافہ نصاب تعلیم سے کہیں زیادہ ہمارے نظام تعلیم نے کیا ہے جو سیاست وتجارت کے ہاتھوں یرغمال ہو کر ایسے فارغ التحصیل خواتین وحضرات اس بدقسمت و متزلزل معاشرہ کو عطیہ کر رہا ہے جو علمی اسناد واعزازات سے متصف قرار دیئے جانے کے باوجود بالعموم علم کی روح اور وجدان وبصیرت کی نعمتوں سے بالکل اسی طرح محروم ہیں جس طرح خوشنما کاغذی پھول خوشبو سے۔ مستزاد یہ کہ حالیہ برسوں میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کرنے والوں کی کھیپ کی کھیپ اس طرح منظر عام پر آئی ہے کہ اس نے قرطاس وقلم کو ایک آزمائش ہی میں نہیں بلکہ اس قلمرو کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مستثنیات اپنی جگہ لیکن ”صاحبان قلم“ کا یہ انبوہ نو دریافت خود کو ”اہل قلم“ منوائے جانے پر بے حد مصر ہے اور اس دُھن میں دانش گاہوں، علمی وتحقیقی اداروں، ادبی مجالس اور ذرائع ابلاغ میں اس تیزی سے داخلے کے راستے ہموار کر رہا ہے کہ اہل علم وخبر دانستہ پسپائی پر مائل نظر آتے ہیں ہر چند کہ دور موجود کو کسی علمی خلا سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن موجود ادبی منظر مسموم وپراگندہ نظر آتا ہے نیز روزناموں کے ادبی ضمیموں نے جو اخباری ادب پیدا کیا ہے اور آئے دن کی کتابوں کی تقاریب رونمائی نے جن پستہ قدوں کو منظر عام پر لا کھڑا کیا ہے اس نے ادبی ارتقاء کے عمل کو سطحیت کے ہاتھوں پابجولاں کر کے رکھ دیا ہے۔ ادب کی اصناف کو جدت پسندی کے نام پر مسخ کیا جا رہا ہے اور عرفان وآگہی کے فقدان نے اس بحران کو اور بھی سنگین بنا دیا ہے۔

مصنوعی دانشوری (Pseudo.intellectualism) کی اس ظلمت پاش یلغار میں حکمت و

دانش اور علم و بصیرت کے جو دیئے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں وہی ہمارا اثاثہ ہیں ملک میں علم و ادب کے نقیب معیاری رسائل و جرائد کی تعداد نہایت محدود سہی لیکن یہ شکست و ریخت کی اس فضا میں ادب کی اعلی قدروں کی ترجمانی کر کے مستقبل کو لاحق خطرات سے محفوظ کر سکتے ہیں اور نام نہاد جدت پسندی کی جگہ جو نا اہلیت کی پیداوار ہے ادبی و شعری اجتہاد کے علم باصلاحیت ہاتھوں میں تھما سکتے ہیں۔ سہ ''الاقرباء'' اس جہاد میں اپنے قلمی معاونین کے ساتھ انشاء اللہ شانہ بشانہ شریک رہے گا۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۱ء)

قومی ورثہ کا تحفظ

عروج و زوال ہی نہیں بلکہ قوموں کا وجود و عدم بھی ان کی شناخت پر موقوف ہے۔ تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت، زبان و ادب اور علوم و فنون قومی ورثہ کے طور پر شناخت کے اجزائے ترکیبی کہے جاسکتے ہیں جو ایک ارتقائی عمل کے ذریعہ نشو و نما پاتے ہیں۔ وہ اقوام جو اپنی شناخت کا ادراک رکھتی ہیں ہمیشہ زندہ و متحرک رہتی ہیں اور وقت کی پیشانی پر اپنے نقوش مرتسم کرتی چلی جاتی ہیں البتہ تاریخ ایسی قوموں کی داستانیں بھی اپنے عبرت کدوں میں محفوظ کر لیتی ہے جو اپنی شناخت سے اس لئے محروم ہو جاتی ہیں کہ انہیں اپنے قومی ورثہ کے تحفظ سے مجرمانہ غفلت گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے ایسی قومیں پھر کسی بھی اعتبار سے قوم کہلانے کی مستحق نہیں رہتیں اور ان کے افراد ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ جاتے ہیں، وہ اپنے سیاق و سباق کو کھو بیٹھنے کے سبب اس طرح تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں کہ وہ احساس تفاخر جو باوقار قوموں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے انہیں کبھی میسر نہیں آتا۔

جنوبی ایشیا کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان ایک طویل ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد اپنی جداگانہ شناخت منوانے میں کامیاب ہوئے، چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس عمل کا نقطۂ عروج کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ایک خطۂ زمین بھی حاصل کر لیا جو تہذیب و ثقافت، علوم و فنون اور عظمت قومی کے تاریخی شواہد کے گنج ہائے گراں مایہ سے مالا مال تھا یہی نہیں بلکہ یہ انقلاب اپنے جلو میں یورپ میں بپا ہونے والے احیائے علوم (Renaissance) کا ایک مماثل بھی لیکر آیا جو ہجرت کر کے آنے والوں میں بے شمار کی حکمت و دانش اور ان کے ساتھ منتقل ہونے والے ذخیرہ ہائے کتب کی شکل میں ہمارا قومی اثاثہ بن گیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وقت کی اس دار و گیر اور افراط و تفریط میں بہت کچھ ضائع بھی ہو گیا لیکن گزشتہ نصف صدی سے زائد مدت پر محیط ہماری قومی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ نہ تو ہم میں کوئی احساس زیاں پایا جاتا ہے اور نہ ہم اپنے عظیم قومی ورثہ کے تحفظ کا

فریضہ انجام دے سکے ہیں، ملک میں ہر چند ایسے اداروں کی کوئی کمی نہیں جو قومی ورثہ کی داشت و پرداخت پر مامور ہیں لیکن بایں ہمہ بے شمار تاریخی آثار و قرائن عدم توجہی کا شکار ہیں، نایاب و نادر اشیاء سرقہ و خیانت سے محفوظ نہیں، کتب خانے مطلوبہ وسائل سے محروم ہیں۔ قدیم و تاریخی دستاویزات کی اہمیت کا شعور معاشی و سیاسی ترجیحات میں دب کر رہ گیا ہے، قیمتی کتب فٹ پاتھوں پر کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں، پھر وہ خریدار نظر نہیں آتے جو ان کے قدر شناس ہوں، البتہ اس قومی ورثہ پر تجارت کرنے والے ہر جگہ منڈلاتے نظر آتے ہیں، جو نہایت بیدردی سے قومی شناخت کے اس گنج گراں مایہ کو چند سکوں کے عوض بیرون ملک منتقل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں، ایسا ہی دردناک پس منظر غالباً حکیم الامتؒ کی مشہور نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' کی تخلیق کا محرک بنا جس میں وہ اپنے آباء کی کتابیں جنہیں وہ علم کے موتی سے تعبیر کرتے ہیں یورپ میں دیکھ کر اپنے دل کو ''سیپارہ'' ہوتا محسوس کرتے ہیں اور غنی کاشمیری کے جس شعر پر نظم کا اختتام کرتے ہیں وہ آج بھی ہمارے حسب حال ہے:

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن   کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

پاکستان میں غالباً پہلی بار حکومتی سطح پر یہ احساس بیدار ہوا اور اپریل ۱۹۸۱ء میں صدر مملکت کے حکم کے تحت ڈاکٹر محمد افضل کی سربراہی میں ایک کمیٹی (Consultative Committee on Archives) تشکیل دی گئی جس کے اراکین میں ملک کے معروف سکالرز نیز لائبریری، میوزیم، آثار قدیمہ اور آرکائیوز کے شعبوں سے متعلق ماہرین کو شامل کیا گیا۔ کمیٹی نے چند ماہ کی مسلسل کاوش اور عرق ریزی کے بعد ایک نہایت جامع رپورٹ حکومت کو پیش کی جس میں قومی ورثہ سے متعلق تمام شعبوں کا جائزہ لیا گیا ملک میں علمی ریسرچ کے فروغ کے لئے ٹھوس تجاویز پیش کی گئیں۔ قدیم کتب، اہم تاریخی دستاویزات اور قومی اہمیت کے نوادر کے تحفظ و استعمال کے رہنما اصول وضع کئے اور ان تمام شعبوں کو مستقبل میں مربوط و بامقصد بنانے کیلئے ایک وفاقی سروس گروپ (National Heritage Preservation Service Group) کا ڈھانچہ مرتب کر کے دیا

لیکن نمعلوم وہ رپورٹ حکومت کے کس سردخانہ میں مدفون ہے کہ کہیں سراغ تک نہیں ملتا' کاش ہمارے موجودہ ارباب بست وکشاد اس طرف بھی توجہ دے سکیں اور اس طرح بالخصوص تاریخ اور علم وادب کے شعبوں میں ریسرچ کا معیار بہتر ہوسکے جو خصوصاً ادب کے شعبہ میں اپنی پستی کی انتہاء کو چھو رہا ہے۔ (جولائی۔ستمبر ۲۰۰۱ء)

قومیت کے اجزائے ترکیبی میں اُردو زبان کی اہمیت

پاکستان کا قیام ایک ایسے بسیط و وسیع پس منظر سے مملو نظر آتا ہے جو اپنی نوبہ نو جہتوں کے اعتبار سے منفرد بھی ہے اور تاریخ ساز بھی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی تسلط مکمل ہو جانے کے بعد برصغیر میں حیاتِ اجتماعی کا جو ایک نیا منظر طلوع ہوا اس میں مسلمانوں کے قومی تشخص کا سوال بنیادی اہمیت اختیار کر گیا اس کا واضح ترین سبب نئے حکمرانوں کا وہ سفاکانہ رویہ تھا جس کا بوجوہ مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا جب کہ ہندو اکثریت کو فیصلہ کن بالادستی سے بہرہ یاب ہونے کے لیے امکانات کے تمام در باز کر دیئے گئے چنانچہ حکمرانوں کے انہیں انصاف باختہ رویّوں اور تخصیص و امتیاز کی منتقمانہ روش نے اسلامیان ہند کو جنہیں ان کی سابق حکمران حیثیت کے باعث ہدف ستم بنایا گیا خود بخود اپنی جداگانہ قومیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا گیا۔ برصغیر میں کثیر القومی معاشرے کی ایک طویل تاریخ کے باوجود ہندو مسلم معاشرت کے درمیان ایک حد فاصل قائم تھی جسے جداگانہ تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت اور روایات و عقائد کے علاوہ دو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اردو ہندی کے لسانی فرق نے اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ جداگانہ قومیت کے اس احساس کا ارتقاء جب سیاسی جدوجہد سے ہمکنار ہوا تو مسلمانوں کے لئے اپنے نصب العین کی طرف پیشرفت میں سب سے زیادہ استقامت و توانائی کے حصول میں اردو زبان مددگار ثابت ہوئی جو برصغیر کے جملہ اکناف میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی واحد ترجمان بن گئی اور پھر وہ ساعت مسعود بھی آ پہنچی جب پاکستان مسلمانانِ برصغیر کے تفاخرِ ملّی کا نشان بن کر دنیا کے نقشہ پر ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے نمو پذیر ہوا۔

ہمارے وجودِ مقتدر کے یہ عوامل ہمارا ایک ایسا اثاثہ تھے جن سے مستقبل میں اتحادِ قومی کے درخشاں خدوخال مرتب کئے جا سکتے تھے۔ یہ حقیقت ہی کہ اردو زبان تحریک پاکستان کی زبان تھی استحکام پاکستان کی ضمانت بن سکتی تھی بشرطیکہ اسے علاقائی تعصبات سے ماورا رکھا جاتا جس کی

ضرورت و ناگزیریت کی طرف خود بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں توجہ دلائی لیکن وہ زبان جس نے آزادی سے قبل کی سیاست کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا تھا جب آزادی ملی تو خود سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی یہی وجہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدّت پر محیط پاکستان کی تاریخ جن ہیجان انگیز کیفیتوں سے دوچار رہی اور مدوجزر کے جس مسلسل عمل نے ہمارے سفینۂ قومی کو متزلزل کئے رکھا اُس کے نتیجہ میں نہ صرف ہم اپنے ایک بازو سے محروم ہو گئے بلکہ لسانی و نسلی تعصّبات اور علاقائیت زدہ مسموم و پراگندہ ذہنیتوں نے ہمارے قومی تشخص کو بُری طرح مجروح کر ڈالا۔ یہ مفروضہ نہایت خطرناک مضمرات کا حامل ہو سکتا ہے اگر اردو کو پاکستان کی علاقائی زبانوں کا حریف ٹھہرایا جائے حالانکہ رسم الخط کے اعتبار سے اردو اور علاقائی زبانوں کی مماثلت اور مزاج و آہنگ کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان اسلامی اخوت کا مستحکم رشتہ ہی بقائے باہمی کی ناقابل تنسیخ ضمانت ہے۔

قومیت کے اجزائے ترکیبی میں لسانی وحدت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جس سے انحراف کے نتیجہ میں ہمارے ملک میں جو ایک دلخراش منظر ابھر کر سامنے آیا اس نے ہماری اجتماعی شناخت کے تاروپود منتشر کر کے رکھ دیئے ہیں کیا یہ ایک سنگین المیہ نہیں کہ سکھ تو پوری نصف صدی تک (۱۷۹۹ تا ۱۸۴۹ء) پنجاب میں اپنے عہد حکومت میں فارسی کو اپنی سرکاری زبان قرار دے سکتے ہیں اور ہم نصف صدی گزر جانے کے باوجود بھی انگریزی کی جگہ اردو کو دفاتر میں رائج نہیں کر سکے۔ اس باب میں ہم ملکی آئین سے روگردانی کے جرم کے بھی مرتکب ہوئے ہیں جس کا تقدّس و احترام ہمارے مزاج اور قومی کردار کا تقاضا ہونا چاہئے۔ آخر وہ کونسی ایسی وجوہ ہیں جو آئین سے بار بار صرفِ نظر کرنے یا اردو کے بطور سرکاری زبان نفاذ کی راہ میں ترامیم کے ذریعہ ناقابل جواز مواقع پیدا کر رہی ہیں۔ ہم دنیا کے جس خطۂ ارضی میں واقع ہیں وہاں چین و جاپان جیسے ممالک کی روشن مثالیں موجود ہیں جو شاہراہ ترقی پر اپنے سفر کی برق رفتاری میں دنیا کی کسی بھی قوم سے پیچھے نہیں بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام اور امریکہ سے بھی ان ممالک کو اگر مسابقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو بھی چین و جاپان کے کسی طرح کمتر ہونے کا تاثر پیدا نہیں ہوتا اور یہ ممالک اپنی

اپنی قومی زبان کے توسط سے عالمی سطح پر بھرپور تعارف حاصل کرنے میں کسی بھی دوسری قوم سے پیچھے نہیں یہی نہیں بلکہ دیگر عالمی زبانوں بالخصوص انگریزی زبان پر عبور اور مہارت بھی اُن کی بین الاقوامی شناخت میں ایک نہایت موثر عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ صورت حال کیا اہل پاکستان کے لیے لمحۂ فکریہ نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جغرافیائی آزادی کے امین تو قرار دیدیئے گئے لیکن ذہنی وفکری کم مائیگی اور احساس کمتری کے سبب طوقِ غلامی کو ابھی تک اپنے وجود پر سجائے ہوئے ہیں انگریزی زبان جس میں بے اندازہ علم وحکمت کے خزانے پوشیدہ ہیں اور جو ایک بین الاقوامی ذریعۂ اظہار کے طور پر بھی یقیناً سرفہرست ہے اُس کی مخالفت صرف ناپختہ و نادان طرز فکر کا ہی وطیرہ ہوسکتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی قومی زبان کو پس پشت ڈال کر اپنے اجتماعی تشخص سے غداری کے مرتکب ہوں اور وہ بھی انگریز کی باقیات کے اُس گروہ کی ریشہ دوانیوں سے مغلوب ہوکر جو سرکاری اداروں اور دفاتر میں ایک غیرملکی زبان کے تسلط سے اپنی بقا کو وابستہ کیے ہوئے ہے یہ گروہ اپنے اثر ونفوذ کی بدولت اردو کے ذریعۂ تعلیم بننے کے راستے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جس نے ہمارے نظام تعلیم کو اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے افسوس تو یہ ہے کہ وہ ادارے بھی کہ نفاذ اردو کو جن کے قیام کا مدعا قرار دیا گیا اس حقیقت کے باوجود بے عملی کا شکار ہیں کہ اردو جدید عہد کے تمام تقاضوں سے ٹائپ رائٹر سے لے کر کمپیوٹر ٹیکنالوجی تک مکمل طور پر ہم آہنگ ہوچکی ہے۔

وقت متقاضی ہے کہ اہل دانش اور ارباب اقتدار صورتحال کی طرف نہ صرف اپنی توجہ مبذول کریں بلکہ اپنی تمام تر توانائیاں وقف کر کے قومی شناخت کو شکست وریخت کے عمل سے محفوظ کرلیں۔ (اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۱ء)

تصنیف واشاعت کے مسائل

تصنیف ایک ایسا تخلیقی عمل ہے کہ جو اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا جب تک منصۂ شہود پر نہ آ جائے، یہی وجہ ہے کہ کسی ایسی ایجادِ ذہنی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ جس کا موجد یا خالق کسی ایسے اضطراب سے دوچار نہ ہو کہ جو اظہار وابلاغ کی کسی بھی مروجہ صورت پر منتج نہ ہو سکے۔ علوم وفنون اور انسانی ذہن کے جملہ تخلیقی محرکات اسی کلیہ کے تابع نظر آتے ہیں اور مرئی یا غیر مرئی وجود پانے والی کوئی بھی حقیقت جو منظر عام پر آنے سے قاصر یا محروم ہے اسے وجودِ باطن سے تو تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن وجود ظاہر ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تخلیقات کی نمو پذیری کے اس فطری نظام کا سب سے بڑا حوالہ عمرانی جہتوں کا وہ ارتقاء ہے جو انسانی افکار ومحسوسات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور خود بھی انسانی جہد البقا کے نوع بہ نوع اثرات کے ردوقبول کے عمل سے مسلسل دوچار رہتا ہے۔

چنانچہ ادب کے شعبہ میں تصنیف وتالیف سے مربوط اشاعت کا عمل نہ صرف یہ کہ ناگزیر ہے بلکہ ادب کے فروغ وارتقاء کا ضامن بھی ہے۔ آج علوم وفنون کے وہ تمام ذخائر جو ایک لامحدود ماضی پر محیط انسان کی ذہانت وبصیرت کے شاہکار ہیں ہمارا قیمتی اثاثہ بن چکے ہیں اور یقیناً یہ سب مرہونِ منت ہیں ان وسائل اظہار کے جو تشہیر واشاعت کی نو دریافت وسعتوں میں مستقبل کے بھی بے پناہ امکانات پر کمند افگنی کر رہے ہیں۔ حرف وصوت (Print & Electronic Media) کا تیزی سے وسعت پذیر یہ نظام افق تا افق ابلاغ واظہار کی تابانیوں سے تمام عالم کو منوّر کرتا چلا جا رہا ہے اور اس کے جلو میں فکر وفلسفہ اور ندرت وایجاد کے قافلے سرگرمِ تگ وتاز نظر آتے ہیں لیکن قرطاس وقلم کی اس ہمہ گیریت نے جہاں اقلیم ہنر کی وسعتوں کو لامحدود کر دیا ہے وہاں معیار فکر وفن کو بھی بری طرح مجروح کر کے رکھ دیا ہے سطحیت اس بحر بے کنار کا عنوان بن کر رہ گئی ہے بلکہ بے ہنری اور علم باختگی کی اس فضا نے حقیقی صلاحیتوں کے تخلیقی رجحانات کو محدود ومسدود

کر کے رکھ دیا ہے اور وہ منظر نامہ ابھی تک طلوع نہیں ہو سکا ہے جو ایک ''گلشنِ نا آفریدہ'' کے اجزائے آفرینش کو مجتمع کر سکے۔

میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں　　ہوں گرمئی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج

سطحی ادب پر مشتمل اشاعتی گرم بازاری روز مرّہ کا معمول بن گئی ہے لیکن اس کے باوجود کہ علم و ادب کے فروغ سے منسوب سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی کوئی کمی نہیں اور اشاعتی کاروبار نجی شعبہ میں بھی حصول زر کا ایک بے لگام ذریعہ بن گیا ہے، معیاری تخلیقات کی راہیں محض اس لئے مسدود ہوتی جا رہی ہیں کہ حقیقی اہل قلم کا استحصال ان قوتوں کا وطیرہ بن چکا ہے اور اہل علم کا چونکہ اہل زر ہونا امرِ محال ہے اس لئے وہ از خود بھی تشہیر و اشاعت کا اہتمام کرنے سے قاصر ہیں اس صورتِ حال میں ہر صاحبِ قلم خود کو اہل قلم سمجھنے کی نادانی میں مبتلا ہو چکا ہے جو فروغ علم کے لئے ایک خطرناک فال ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ نجی و سرکاری شعبہ کے اشاعتی ادارے خود ساختہ قلمکاروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور آئے دن کی کتابی رونمائیوں کے سیلاب میں انہیں غرق ہونے دیں کیونکہ علم و آگہی کے افلاس پر مبنی جس حرفِ بے حُرمت کی وہ تخلیق کر رہے ہیں اس کی حیثیت کاٹ کباڑ (Dust bin Stuff) سے زیادہ ہر گز نہیں، دوسری طرف علم و دانش کے نام پر مصنوعی محفلیں سجانے والے کاریگروں (Professionals) کے جو طائفے بنتے چلے جا رہے ہیں انہیں بھی پوری حقارت سے نظر انداز کرنے کی ضرورت ہے۔

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

ان حالات میں مخلص و ذمہ دار اداروں کا فرض یہ ہے کہ وہ تخلیق و تقلید اور سرقہ و تصنیف کے درمیان حد فاصل قائم کریں اور ان مصنوعی چہروں سے ادبی منظر کو پاک کریں جنہیں مسلسل و متواتر دیکھ دیکھ کر اہل بینش کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں، ہمارے اربابِ بست و کشاد کو ایسی صدارتوں اور مہمانانِ خصوصی کے اعزازات سے گریز برتنا چاہئے جن کا سببِ مذموم صرف ان کی سرکاری و

مقتدر حیثیت قرار پاتی ہے۔ خون جگر سے حرف کاری کرنے والے اربابِ دانش کا حق ہے کہ اگر وہ منظر پر دستیاب نہ بھی ہوں تب بھی انہیں تلاش کر کے ان کے جائز اعزازات انہیں لوٹائے جائیں اور ان کی تحریروں کو تجارتی و سیاسی مفادات کی میزان کی نذر کرنے کے بجائے ان کی درست حق رسی کرتے ہوئے انہیں منصۂ شہود پر لایا جائے ورنہ تصنیف کا تخلیقی عمل نا تمام رہے گا۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء)

ادب میں سرقہ وخیانت کے مسائل

ادب اور فنون لطیفہ تقدیس وتکریم کے اس لیے مستحق قرار پاتے ہیں کہ انسانی ذہن کی بہترین تخلیقی، ایجادی اور اختراعی صلاحیتیں ان شعبوں میں نہ صرف نشوونما پاتی ہیں بلکہ ان کے اظہار وابلاغ کے نتیجہ میں ایک مہذب، متمدن اور شائستہ معاشرہ کے خدوخال بھی مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے تمام ادیب شاعر اور فنکار جو اپنے رُشحات فکر کی انفرادیت کا اختصاص وامتیاز رکھتے ہیں ان کا یہ حق تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی تمام نمو پذیر کاوشوں (Expressive Efforts) کے تخلیقی نتائج کے بلاشرکت غیرے مالک ومختار ہیں اور ان کی ذہانت وبصیرت کے تراشیدہ حروف ہوں کہ نقش ان کا اثاثۂ، دانش (Intellectual Property) قرار پاتے ہیں سرقہ وخیانت کے خلاف ان کا تحفظ ہر مہذب معاشرہ کا فرض ہونا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ اہل قلم اور اہل ہنر کے اس حق کو تسلیم بھی کیا گیا اور اس کے اخلاقی جواز کو قانونی بنیاد بھی فراہم کی گئی لیکن بدقسمتی سے ترقی پذیر ممالک میں خاص طور پر یہ قوانین عملاً موثر ثابت نہ ہو سکے اور حکمت ودانش کے شہ پاروں کی تجارت ایک شرمناک معمول بنی رہی وہ لوگ جنہوں نے اپنے فکر وفن کو طبع زاد کوششوں سے رنگ وآہنگ عطا کیا اور اپنے خونِ جگر سے اپنی تخلیقات کی آبیاری کی بدستور اپنے حق سے محروم رہے ان کی ایجادیت (Originality) کے وصف گراں بہا کو ادب وفن کے بے رحم تاجر سرعام نیلام کرتے رہے۔ کاپی رائٹ کا قانون اس سفاکانہ صورتِ حال کا سراپا بے بسی سے تماشا کرتا رہا۔ کوئی بھی معاوضہ یا رائلٹی (Royalty) ملنا تو درکنار اجازت کے رسمی تکلف کو بھی ضروری نہیں سمجھا گیا اور ادبی قذاقی (Literary Piracy) کا یہ بہیمانہ عمل حقیقی تخلیق کاروں کی بے بسی وکسمپری کا مذاق اڑاتا رہا حالانکہ بین الاقوامی سطح پر جہاں عالمی اثاثۂ دانش کی تنظیم (World Intellectual Properly Organisation) اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کے طور پر قائم ہے وہاں بیشتر ممالک میں بھی وقتاً فوقتاً قانون سازی کی جاتی

رہی ہے لیکن لگتا ہے یہ سب اقدامات کلیتہً موثر ثابت نہیں ہو سکے۔

جنوبی ایشیا کے ممالک خاص طور پر نہ صرف اپنے قلمکاروں اور اہل فن کو مطلوبہ تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ غیر ملکی تخلیق کاروں کو بھی ادب اور آرٹ کے شعبوں میں تاجرانہ طوائف الملوکی (Commercial Anarchy) کا شکار ہونا پڑا ہے۔ ماضی میں ڈاکٹر ہنری کسنجر جیسے معروف بین الاقوامی دانش ور کی کتاب کی پاکستان میں خلاف قانون اشاعت ایک شرمناک مثال ہے جس پر حکومت وقت کو معافی مانگنا پڑی ہر چند کہ اُس وقت بھی ملک میں ۱۹۶۲ء کا کاپی رائٹ قانون نافذ تھا جو آج بھی اپنی تمام تر بے حُرمتی کے باوجود باقی و قائم ہے اور جس میں طبع زاد ادبی مواد (Original Literary Work) کی بہ تمام و کمال تعریف ہی نہیں بلکہ صراحت بھی کی گئی ہے۔ اصل میں برصغیر کی حد تک اس شعبہ میں انتشار و خلفشار کی فضا تقسیم ملک ہی کے وقت سے مسلسل کارفرما نظر آتی ہے۔ ۱۹۱۱ء کا کاپی رائٹ ایکٹ جس میں ۱۹۱۴ء میں ترامیم بھی کی گئیں تقسیم ملک کے وقت عملاً غیر موثر ہو کر رہ گیا کیونکہ دو علیحدہ علیحدہ خود مختار مملکتیں معرضِ وجود میں آ گئی تھیں یہی وجہ تھی کہ سرحد کے دونوں طرف طبع زاد مواد ہی نہیں بلکہ ترامیم و اقتباسات کی اخلاق و قانون کے خلاف ہمہ گیر اشاعت اہل علم و ہنر کے حقوق کی دردناک پامالی کا سبب بنتی رہی۔ دہلی میں ۱۹۶۷ء میں منعقدہ بین الاقوامی سیمینار بھی ایشیائی اہل قلم اور فن کاروں کے حقوق کا تحفظ کرنے میں ناکام رہا۔

پاکستان میں ہر چند کہ کاپی رائٹ ایکٹ ملک کے صحیفۂ قانون (Statute Book) کا ایک جزو لاینفک ہے اور اس کے تحت ۱۹۶۷ء میں قواعد سازی (Rule Making) کا کام بھی تکمیل پا چکا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اہل قلم کا آج بھی کوئی پرسانِ حال نہیں، اور متاع دانش کی لوٹ مار بدستور جاری ہے اب تک تو یہی شکوہ تھا کہ نجی شعبہ کے اشاعتی ادارے اور اخلاق باختہ زر پرست افراد اہل قلم کا استحصال کر رہے ہیں بلکہ اب تو سرکاری شعبہ کے ادارے بھی جو ادب اور علم و ہنر کے فروغ اور تخلیق کاروں کے تحفظ حقوق کے لیے قائم کیے گئے تھے ان کے برہنہ استحصال پر اُتر آئے ہیں یہاں تک کہ کتاب کی حُرمت کے نام پر قائم کیا جانے والا ایک سرکاری ادارہ جسے

ایک شاعر اعظم نے شرف سربراہی بھی مرحمت فرمایا ہے ایسی کتب کی اشاعت کا بلاخوفِ تعزیر (With a sense of Impunity) مرتکب ہو رہا ہے جن کے اکثر مندرجات ہمارے بعض معروف و محترم اہل قلم کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں اور انہیں نہ صرف معاوضۂ استحسان کے حقوق سے محروم رکھا گیا بلکہ مجرمانہ طور پر بے خبر بھی رکھا گیا۔ کیا ان کتابی تقدس کے ناخداؤں کو حکیم الامت کا یہ شعر بھی یاد نہیں رہا کہ

برگِ گُل رنگیں زمضمون من ست　　　مصرع من قطرۂ خونِ من ست

(اپریل۔ جون ۲۰۰۲ء)

اردو میں غیر ملکی زبانوں سے تراجم

عہد حاضر میں علوم وفنون ارتقاء وہمہ گیریت کی جن بلندیوں کو چھو رہے ہیں وہ سب انسانی ذہن کی بے پناہ صلاحیتوں کا فیضان ہے یہی وجہ ہے کہ حکمت و دانش کے تمام نتائجِ تخلیق عالم انسانیت کا مشترک ورثہ ہیں لیکن موجود زمینی حقائق بدقسمتی سے اس کلیہ کی تکذیب کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ انسانی برادری افلاس وافراط اور کمزوری وتوانائی کی حدود میں تقسیم ہو کر خود اپنے ہی خلاف صف آراء ہوگئی ہے۔ علم اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی طاقت کی بنیاد پر اقوام ایک دوسرے کے استحصال پر کمربستہ دکھائی دیتی ہیں اور وہ آفاقی توازن جو حیات انسانی کی اجتماعی ضرورت ہے اس سے تمام دنیا محروم ہو کر رہ گئی ہے بعض بالادست اقوام اپنے نتائج تحقیق کے گرد آہنی حصار قائم کر کے مجرمانہ اجارہ داری کی مرتکب ہوئی ہیں اور اکثر زیردست اقوام یا تو اپنی بے وسیلگی کے جال سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے میں مصروف ہیں یا سرے سے اس احساس ہی سے محروم نظر آتی ہیں کہ علم کے حصول کے لیے راستے تلاش کرنا اور علم کو ہمہ گیر ارتقاء کا ذریعہ بنانا ان کے حیطۂ امکانات میں شامل ہے۔

پاکستان کا وجود جو اہل وطن کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت بیت جانے کے باوجود اپنی بنیادوں کے اضمحلال سے اس لیے دوچار ہے کہ توانائی بخشنے والے عوامل سے جن میں دستیاب ذخیرۂ علم سے استفادہ اور اس میں مسلسل اضافے کی ضرورت سرفہرست ہے۔ متواتر اغماض برتا گیا ہے جسے ہر آنے والی نسل اگر اپنے بزرگوں کی مجرمانہ غفلت سے تعبیر کرے تو غلط نہ ہوگا۔ المیہ تو یہ ہے کہ تعلیم جسے ہماری قومی ترجیحات میں اولیت حاصل ہونا چاہیے تھی فکری، نظری اور عملی انتشار وخلفشار کا شکار رہی۔ نتیجتاً نہ تو کوئی جہت متعین ہو سکی۔ اور نہ سمت۔ پالیسی سازی کا کام ہر دور میں ہوا لیکن توفیق عمل سے محروم یہی کام تدبر وحکمت کے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ ایک بار پھر ہوا ہے۔ خدا کرے کہ بار آور ثابت ہو۔

ملک میں علوم وفنون اور زبان وادب کے فروغ کے ضامن اداروں کی ایک طویل قطار تو نظر آتی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایسے ہاتھوں میں یرغمال ہو کر رہ گئے ہیں جو صرف اور صرف ذاتی مفادات کے لیے متحرک رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اداروں کی کارکردگی نہ صرف محل نظر ہے بلکہ زر کثیر کے مسلسل ضیاع کے نتیجہ میں بے لاگ احتساب کی بھی متقاضی ہے قومی زبان اردو کو جس ناروا سلوک کا مستحق گردانا گیا ہے وہ بحیثیت قوم ہمارے احساس تفاخر کی شکست وریخت پر بھی منتج ہوا ہے اور خود زبان کے علمی فروغ کو بھی محدود و مسدود کر دینے کا سبب بنا ہے یہ حقیقت ایک سانحہ سے کم نہیں کہ مقتدرہ قومی زبان اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہی نہیں بلکہ قومی زبان کو دفتری و سرکاری حیثیت دلانے میں ارباب اختیار کی مسلسل عدم توجہی اور پے بہ پے آئینی خلاف ورزیوں کو سراپا بے حسی و بے بسی سے دیکھتا رہا ہے اور ارتکاز عمل (Focus) اردو زبان میں تراجم کے ذریعہ اس کی علمی وفنی حدود کو وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے بجائے اکثر و بیشتر ایسی کتب کی اشاعت پر رہا ہے جو مستثنیات کے باوصف متعلقہ مولفین و مرتبین یا مصنفین کی سرپرستی اور شخصی مفادات کے تحفظ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اور بھی اداروں نے تراجم کے کام کئے تو ہیں لیکن یہ سب نہ تو مربوط ہیں نہ منضبط اور ایک ایسے چیلنج سے نمٹنے کے لیے انتہائی ناکافی ہیں جس کا مقصد اردو کو ہر سطح پر بحیثیت سرکاری زبان رائج و نافذ کرنا ہے اور ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے قدیم و جدید علوم کی تعبیر و تشریح کی قدرت عطا کرنا ہے۔

حیدر آباد (دکن) کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہی نے عالمی سطح کے ماہرین علوم پیدا کئے اور اردو کو غیر ملکی زبانوں سے کئے گئے تراجم کے ذریعہ عظیم علمی وفنی جہتوں اور وسعتوں سے ہمکنار کر دیا۔ ضرورت ہے کہ پاکستان میں انہیں بنیادوں پر اردو زبان کی علمی ترویج (Enrichment) کی حکیمانہ منصوبہ بندی کی جائے تاکہ سائنس ادب اور عمرانیات کے جن شعبوں میں عالمی سطح کی جو تصانیف منظر عام پر آئی ہیں اور جو بلاشبہ تمام عالم انسانیت کا مشترکہ ورثہ بھی ہیں اور اثاثہ بھی انہیں اردو زبان میں تراجم کے ذریعہ منتقل کیا جائے اس طرح قومی ذہن کی اجتماعی وانفرادی تشکیل میں نہ صرف مدد ملے گی بلکہ اردو زبان جدید ترین علوم اور رجحانات فکر

سے ہم آہنگ ہونے کی اپنی صلاحیت کو مزید متحرک و مستحکم بنا سکے گی۔ یہی نہیں بلکہ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ہر شعبہ میں اور ہر سطح پر موثر کردار ادا کر سکے گی اور سرکاری زبان کے طور پر بھی اس کے نفاذ کے راہ کی تمام رکاوٹیں یکسر ختم ہو جائیں گی۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے موجودہ اداروں کے فرائض منصبی (Mandate) پر یا تو نظرِ ثانی کی جائے اور بالخصوص مقتدرہ قومی زبان کے نصاب عمل میں غیر ملکی زبانوں سے اردو میں تراجم کے ایک جامع اور مربوط پروگرام کو شامل کیا جائے یا قومی سطح پر ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو ماہرین لسانیات پر مشتمل ہو اور معروف عالمی زبانوں میں جدید و قدیم علوم پر شائع ہونے والی مستند کتب کو تراجم کے ذریعہ ہماری قومی زبان میں منتقل کر کے ہمارا تفاخرِ گم گشتہ ہمیں واپس لوٹا دے۔ (جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۲ء)

ادب میں تطہیر کا عمل

الاقرباء کا زیرِ نظر شمارہ حکیم الامت حضرت علاّمہ اقبالؒ کی ذات گرامی منزلت سے منسوب و معنون ہے ہم ان تمام اہل قلم حضرات کے صمیم قلب سے سپاس گزار ہیں جن کی نگارشات نظم ونثر اس مجلّہ کی زینت ہیں اور جن کے ذریعہ حضرت علاّمہ کے افکار و نظائر اور فلسفہ وفن کی مختلف جہتوں کا نہایت بلیغ اور بصیرت افروز انداز میں جائزہ لیا گیا ہے صاحبانِ علم کی اس کہکشاں میں ایسی ہستیوں کے اسمائے گرامی بھی نظر آئیں گے جو آج ہمارے درمیان نہیں اور ہماری علمی وادبی تاریخ کا بیش بہا اثاثہ بن چکی ہیں لیکن ادارہ کو ان کے نتائج تحقیق وتخلیق پر مبنی ایسی نگارشات پیش کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے جو یا تو بوجوہ منظر عام پر نہیں آسکیں یا ماضی بعید کی گرد میں روپوش ہو جانے کے سبب نایاب یا کم یاب ہو چکی ہیں۔

ایسی ہی ایک مثال ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کا وہ مقالہ (لیکچر) ہے جس میں مرحوم نے اسلام میں الٰہیات کی تشکیل جدید (Reconstruction of Religious Thought in Islam) کے موضوع پر شاعر مشرق کے فلسفہ وحکمت پر مبنی عالمانہ خیالات (مدراس لیکچرز) کا نہایت باریک بینی اور دقیقہ سنجی سے ایک ایسا پُر مغز تجزیہ پیش کیا ہے جو اقبالیات کے طالب علموں اور محققین کے لیے مستقل رہنمائی کا درجہ رکھتا ہے اس کے علاوہ جناب حامد حسن قادری کا جو ہماری ادبی تاریخ کا نہایت برگزیدہ نام ہے ایک ایسا شہکار شریک اشاعت ہے جو بہ اعتبار تاریخ گوئی اپنی مثال آپ ہے قادری صاحب مرحوم کا یہ فارسی قطعۂ تاریخ جو علاّمہ کی رحلت کے فوراً بعد (۱۹۳۸ء) انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے مجلّہ علمی ''اردو'' کی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا ایسے رواں و برجستہ اشعار پر مشتمل ہے جن کے مصرع ہائے اوّل سے ہجری اور ثانی سے حضرت حکیم الامت کی عیسوی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ ایک اور تاریخی ادب پارہ بھی الاقرباء کے صفحات کا اختصاص کہا جاسکتا ہے جو ایک تعزیتی نظم کے طور پر اکبر لاہوری کا نتیجہ فکر ہے اکبر لاہوری حضرت علامہ کے جنازہ میں

شریک تھے اوران کے جسد خاکی کے لحد میں اتارے جانے تک نظم کے اشعار مکمل کر چکے تھے چنانچہ بلاخوف تردید اکبرلاہوری کی اس نظم کو علامہ کی وفات پر لکھے جانے والے مرثیوں میں نقش اوّل قرار دیا جاسکتا ہے۔ فیض احمد فیض مرحوم گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی کے طالب علم تھے مفکرِ اسلام کو خراج عقیدت وتحسین کے طور پر لکھی گئی ان کی ایک نظم بھی جو کالج کے میگزین ''راوی'' میں اشاعت پذیر ہوئی اور جو جناب فیض کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں ''الاقرباء'' کے زیرنظر شمارہ کا نشان امتیاز ہے ہمیں توقع ہے کہ قارئین کرام اس مجلّہ کے مندرجات کو اپنی خصوصی توجہ سے سرفراز فرمائیں گے ہم نے بہر حال یہ اختصاص برقرار رکھنے کی مسلسل سعی کی ہے کہ الاقرباء کی نگارشاتِ نظم ونثر غیر مطبوعہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہ اعتبار نوعیت تخلیقی ہوں یا تحقیقی اپنے قلمی معاونین سے بھی ہمیشہ ہماری یہی استدعا رہی ہے کہ وہ اپنے رُشحات قلم ہمیں مرحمت فرماتے وقت اس پہلو کو مدنظر رکھیں۔

اقبال کے حوالے سے افق ذہن پر جو ایک اور نظر افروز منظر طلوع ہوتا ہے وہ ادب کا کردار ہے جو ایک طرف معاشرتی اقدار کی عکاسی کا فرض ادا کرتا ہے اور دوسری طرف ایک صحت مند و توانا معاشرہ کی تعمیر وتشکیل میں رہنمائی مہیا کرتا ہے چنانچہ اس نوع کے ادب کا خالق فن کار معاشرہ کا قیمتی اثاثہ بن جاتا ہے جس کا نعم البدل کسی بھی مادی دولت وثروت کو قرار نہیں دیا جاسکتا غالباً رفعت وعظمت کا یہی وہ تصور تھا جس کے زیر اثر کارلائل نے شیکسپیر کو ان تاریخی الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

" Indian Empire or no indian Empire, we connot do without Shakespear"

ترجمہ: (سلطنت ہند رہے یا نہ رہے ہم شیکسپیر کے بغیر نہیں رہ سکتے)

لیکن علامہ اس کے برعکس ایک آزاد وخودمختار مملکت کی نوید سناتے ہیں اور قوم سے اپنے عوض کسی سلطنت یا مملکت سے دستبردار ہونے کی جگہ افراد قوم سے اپنے ''نور بصیرت'' کے اوصاف میں ڈھل جانے کی آرزو کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ یہی وہ نکتہ ہے جو انفرادی و اجتماعی

کردار سازی میں کلام اقبال کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور ادب میں تطہیر کے عمل کو موثر و با مقصد بنانے کی ضرورت مزید نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

اس معنوی و نظریاتی سیاق و سباق میں جب ہم آزادی کے بعد نصف صدی سے زیادہ مدت پر محیط اپنے ملک میں ادب کے ارتقاء اور رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ادب عصری تقاضوں سے تو یقیناً ہم آہنگ رہا اور تند و تیز انداز میں مزاحمتی کردار بھی ادا کرتا رہا مگر نہ صرف قدر و مقدار (Quality & Quanitity) کا تناسب درہم برہم ہوتا گیا بلکہ معاشرتی تطہیر و اصلاح کا عمل بھی جو ادب کا ایک اہم فریضہ ہے ایک حد تک منفی رجحانات کے زیر اثر چلا گیا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ قلم کی امانت جن آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتی رہی ان کی ذہنی علمی اور معاشرتی نشو و ارتقا (Orientation) اور پیشرو اہل قلم بزرگوں کی فکری و نظری ترجیحات (Intellectual & ideological Preferences) کے درمیان تسلسل و ترویج کے عمل کی جگہ ایک وسیع خلا پیدا ہو گیا بلکہ اخلاقیات سے بے نیاز مادہ پرستانہ ذہن اس قدر غالب آ گیا کہ ادب کی بنیادی قدریں زوال و انہدام کا شکار ہو کر رہ گئیں اس صورتِ حال کے لیے نسل در نسل آنیوالے اہل قلم کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ اس تدریجی انحطاط کا ناقابل تردید الزام ناقص اور مادہ پرستانہ نظام تعلیم پر عائد ہوتا ہے جس نے بظاہر تو اسناد علم و دانش بے شمار ہاتھوں میں تھما دی ہیں لیکن ان ہاتھوں کو رہنمائی مہیا کرنے والے اذہان اس ''نور بصیرت'' سے یکسر محروم ہیں جس کی آرزو اقبالؒ نے کی تھی نتیجہ کے طور پر آج کا ادب واضح طور پر سطحیت اور علمی بے بضاعتی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے اور خاص طور پر علاّمہ مرحوم نے شعر کو ایک موثر ذریعہ اظہار "Vehicle of Expression" بنا کر اس سے جو انقلاب آفریں کام لیا اس کا عشر عشیر بھی کہیں ہمیں عصری تخلیقات میں نظر نہیں آتا کاش ہمارے خدایان اقتدار تعلیمی اقدار کے اس افلاس اور کج روی کو دور کرنے کی طرف توجہ دیں اور وہ ادارے جو ترویج ادب کے نام پر معرض وجود میں آئے ہیں نیز ادبی ذرائع ابلاغ (Literary Madia) ثقہ ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کریں تا کہ ادب میں تطہیر کا عمل پروان چڑھ سکے۔

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۲ء)

'ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے'

اکیسویں صدی اپنے آغاز ہی سے کچھ اس انداز سے محوِ خرام ہے کہ تمام کائنات ارضی لرزہ براندام نظر آتی ہے۔ آثار و قرائن وسوسوں اور نت نئے اندیشوں کو جنم دے رہے ہیں۔ دنیا دو عالمگیر جنگوں کے وحشت ناک تجربات سے گزر چکی ہے اور اب مزید کسی ایسے تجربہ سے دوچار ہونے کے تصور سے مبہوت و سراسیمہ دکھائی دیتی ہے آئن سٹائن سے سوال کیا گیا تھا کہ ماضی کی دو جنگوں کے پیش نظر انہیں تیسری عالمگیر جنگ میں کس قسم کے اسلحہ کے استعمال کے امکانات نظر آتے ہیں جواباً اپنے عہد کے اس عظیم سائنسدان نے کہا کہ، تیسری نہیں بلکہ چوتھی عالمگیر جنگ کے بارے میں پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ عالم انسانیت کو اگر اس جنگ کا سامنا ہو تو مخالفین ایک دوسرے پر تیر کمان اور اینٹ پتھر سے حملہ آور ہونگے۔ الامان والحفیظ!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں   محو حیرت ہوں یہ دنیا کیا ہے کیا ہو جائیگی

سانحہ اور مکمل انسانی سانحہ (Total Human Catastrophe) ہی اگر مستقبل کی کسی نیوکلیر آویزش کا ناگزیر ماحصل ہو سکتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آویزش کی سفاکی سے بچا جا سکتا ہے؟ کیا یہ بھیانک صورتحال انسانی ضمیر اور اجتماعی دانشِ انسانی کے لیے تاریخ انسانی کا سب سے بڑا اور سنگین ترین چیلنج نہیں؟ کیا رواں صدی جس کا آغاز ہی خون انسانی کی بے وقعتی اور انسانیت کی بدترین تحقیر یعنی انسان سازی (Human Cloning) کی ایک صنعت کے طور پر صورت گری سے ہوا ہے اشرف المخلوقات کو تمام مخلوقات میں ارزل و ابتر بنا دینے کے مترادف نہیں؟ تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civilzaations) کے نام پر جس رقص ابلیس کا اہتمام کیا جا رہا ہے کیا وہ انسانیت کی ہلاکت و تباہی پر منتج نہیں ہوگا؟

ان تمام سوالات اور ایسے ہی تمام خدشات نے عالمِ انسانیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور ایک

منطقی و ناگزیر سوال مزید ابھر کر سامنے آیا ہے کہ آخر گزشتہ عالمی جنگوں کی حشر سامانیوں کے بعد بھی اہل دانش و اہل قلم آخر کیوں ارباب سیف و سناں کو تقدیس انسانیت اور حیات انسانی کے تحفظ پر آمادہ نہیں کر سکے۔ عالمی ادب آخر اس قدر بے بضاعت و بے اثر کیوں ہو گیا کہ عالمی مسائل کے حل کے لیے صرف اور صرف طاقت و تشدد پر انحصار کیا جانے لگا، ظاہر ہے کہ یہ حکمت و دانش کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے ایک عالمگیر زوال پذیر نظام اخلاقیات اور بنیادی انسانی اقدار سے بیگانگی کا، حقوق انسانی سے روگردانی کا، نسلی، انسانی و مذہبی تعصّبات کے خلاف عالمی ادب کی غیر موثر مزاحمت کا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں آج بھی خال خال ایسے اہل قلم موجود ہیں جو اس ہمہ گیر زوال و انحطاط پر سر بگر بیاں اور عالمی امن کی سفاکانہ پامالی پر نوحہ کناں ہیں لیکن وہ خود ایک خوردبینی اقلیت (Microscopic Minority) ہونے کے سبب موجودہ کریہہ المنظر صورت حال پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہے ہیں۔

پاکستان بھی اس تناظر سے باہر کوئی خطہ ارضی نہیں لیکن یہاں قرطاس و قلم جس طرح ایک انبوہ ناسزا کے ہاتھوں یرغمال ہو کر رہ گئے ہیں اس المیہ کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے اور ان لوگوں کے لیے عالمی مسائل تو بعید از فکر موضوعات ہیں ہی لیکن انہوں نے مروجہ اصناف ادب کی جدیدیت کے نام پر جو مٹی پلید کی ہے وہ بذات خود ایک حادثۂ جانکاہ ہے۔ اردو شعر جو کبھی حسن و لطافت کا مرقع اور گنجینۂ معنی کا پیکر ہوتا تھا اس طائفۂ کم نظراں نے اپنے فکری و علمی دیوالیہ پن سے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور ہئیت و اسلوب کو فن کی نئی جہتوں سے روشناس کرانے کے بجائے ایسے کُھردرے۔ نامانوس اور قبیح طرز کلام (Diction) کو اختیار کیا ہے جس نے ہماری شاعرانہ روایت کے تسلسل کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے ناول کی صنف قریب قریب بوجوہ معدوم ہو چکی ہے جب کہ افسانہ فنی ارتقاء اور موضوعاتی وسعت سے محروم نظر آتا ہے مزاح (Humour) جو ایک باقاعدہ فن تھا اور جس کی آبیاری ذہانت، شعور اور علمیت کے مرہون منت تھی اب ایک جنس بازاری بن کر رہ گیا ہے بلکہ یہ استہزاء نگار جو خود کو ''مزاح نگار'' سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں نہ صرف یہاں شہر در شہر محفلوں میں ادبی آلودگی (Litarary Pollution) کا سبب بن رہے ہیں

بلکہ بیرونی منڈیوں میں بھی اپنی ''شاعری واداکاری'' سے ''زرکم عیار'' کمانے میں مصروف ہیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ شعر وادب سے وابستہ وہ سنجیدہ اور بصیرت و بصارت سے بہرہ مند طبقہ کمال بے بسی سے اس طوائف الملو کی (Anarchy) کا نظارہ کر رہا ہے ااور اب یہ رجحان عام ہو گیا ہے کہ وہ ذاتی وقار و منزلت ہی کی قیمت پر کیوں نہ ہو شرکت صرف ایسی محفلوں میں کی جائے جو الیکٹرانک میڈیا کے حلقۂ نظر (Focus) میں ہوں یا حصول زر کا وسیلہ ہوں چنانچہ ہمارے بیشتر ''دانشور ادیب اور شاعر'' ہر صبح اسی فکر میں گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں کہ

''کوئی خط اس کو لکھوائے اگر تو ہم سے لکھوائے''

یہ ہے ہمارے یہاں اکیسویں صدی کا منظر نامہ اور یہی ہے لمحۂ فکریہ بھی! (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۳ء)

ادب اور ''نظریہء ضرورت''

ادب اور غیر ادب کے درمیان حد فاصل صرف اس وقت مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے جب تخلیق کار کا ذہن اقدار حیات کے تعین اور ان کے مابین ربط و امتیاز کے ادراک سے محروم نظر آئے یہی وجہ ہے کہ نقد و نظر کی میزان میں تُل کر جو تخلیقات ادب قرار پاتی ہیں وہ اپنے خالق کی صحتِ فکر اور بلوغتِ نظر کی پہچان بن جاتی ہیں اور جو اس میزان کی متحمل نہیں ہو پاتیں وہ صرف غیر ادب ہی نہیں ٹھہرائی جاتیں بلکہ تخلیق کے نقص کی غماز قرار پاتی ہیں چنانچہ یہ فکر و نظر کی وہ صداقت ہے جس سے انکار یا تو مصلحت و منافقت کو جنم دے سکتا ہے یا خود فریبی و کور نگاہی کو۔ تاریخ نے لفظ و معانی کے آہنگ سے آفاقی سطح پر ادب کے جن خد و خال کو منور کیا انہیں زمان و مکاں کی قیود سے قطع نظر حیات و کائنات کی متنوع جہتوں کا ترجمان تسلیم کیا گیا اور ادیب کو ذات و صفات کا آئینہ۔ لیکن جہاں جہاں افلاسِ ظرف کے ہاتھوں قرطاس و قلم ذہنی پستی کی زد پر آتے گئے ضرورت ایجاداتِ مہمل کی ماں بنتی گئی۔

یہ ضرورت ادب کے حوالہ سے اور بالخصوص گزشتہ نصف صدی سے تا حال پاکستان میں مختلف اصناف ادب کے تخلیقی عمل کے تناظر میں ایک نام نہاد ''نظریہ'' کے قالب میں ڈھل چکی ہے جسکا ایک سبب تو برق رفتار اور ہمہ جہت وہ انقلابی عمل ہے جس کے نتیجہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تکنیکی و میکانیکی ایجاداتِ تازہ بالخصوص کمپیوٹر کے نظام نو نے زندگی کی ترجیحات کو بدل کر رکھ دیا ہے اور حصول تعلیم کے مقاصد کا رخ یکسر تبدیل کر کے حیات انسانی کو مادّیتِ محض کی دلدل میں بری طرح پھنسا دیا ہے دوسری طرف ادب عالیہ کے تخلیقی امکانات پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہ نہیں کہ ادب کا شعبہ معیار و اقدار کے افلاس سے دوچار ہو چکا ہے بلکہ باعث تشویش امر یہ ہے کہ ایسا تندرست و توانا ادب جس کی بنیادیں عالمگیریت اور وحدتِ انسانی کے رشتوں میں پیوست ہوں اور جو انفرادی و اجتماعی حیات کو تہذیب و معاشرت اور تمدن و ثقافت کی لطیف و پاکیزہ قدروں سے ہمکنار کر سکے روز بروز رو بہ انحطاط اور تقلیل و کم ہنری کا شکار نظر آتا ہے اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے لکھنے والوں کی ایک غالب

اکثریت علمی بصیرت اور نظری ثقاہت سے بعید سے بعید تر ہونے کے سبب سہل انگاری کے دامِ نظر فریب میں گرفتار ہوچکی ہے جس کے نتیجہ میں ادب میں سطحیت کا عنصر غالب آچکا ہے۔

نام نہاد ''نظریہء ضرورت'' نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو مسلّمہ روایات اور صحت مند اقدار سے انحراف پر مجبور کردیا ہے اور اخلاقی و قانونی مسلّمات کی بے توقیری کے عذاب میں مبتلا کردیا ہے وہاں قلم کے بیشتر امانت داروں کو خیانت فکر و نظر کے غیر شعوری جرم کے ارتکاب پر اس انداز میں مائل کردیا ہے کہ قلم حقیقت کی تلاش و جستجو اور معاشرتی رویوں کی تطہیر کے بجائے ذاتی اغراض کے حصول اور خود ادیب کے ادبی منظر پر استحکام اور نمود و ستائش کے لئے وقف ہوکر رہ گیا ہے۔ تجربہ و مشاہدہ گواہ ہیں کہ عصر رواں میں ذرائع ابلاغ کی بیساکھیوں پر جو چہرے ادبی منظر پر طلوع ہوئے ہیں ان میں سے اکثر ادب کے ''نظریہء ضرورت'' کی پیداوار ہیں جن کی تخلیقات میں بیش از رُطب و یابس ثقہ مواد کم ہی نظر آئے گا بالکل اسی طرح شعر کی قلمرو بھی ''ضرورت شعری'' کے ہاتھوں حزن و یاسیت کا شکار ہے عہد حاضر کی شعری تخلیق میں گہرائی و گیرائی کی صفات کم سے کم تر ہوتی جارہی ہیں اور ان کی جگہ نت نئے تجربوں کے روپ میں فنی کم مائیگی اور تخیل و تصوّر نیز وجدان و دانش کی بے بضاعتی راہ پارہی ہے یہ صورت حال اک لمحہ فکریہ ہے اُن متحرک و ذی شعور اہل علم و قلم کے لئے جو اصلاح احوال کا بیڑہ ایک سنجیدہ چیلنج سمجھ کر اٹھائیں، حقیقی علمی کاوشوں کی رہنمائی اور سرپرستی فرمائیں ورنہ تھک ہار کر بیٹھ جانے اور محض ماضی کی کاوشوں کے سُرخاب کے پر کلاہوں میں سجالینے سے حال و مستقبل کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا مشاہدہ و تجربہ میں آنے والی یہ حقیقت بھی انتہائی تکلیف دہ ہے کہ قحط الرجال کی اس دل شکن فضا میں قرطاس و قلم سے وابستہ جو بھی معدودے چند اہل بصیرت ہستیاں نظر آتی ہیں وہ تازہ تخلیقات سے کم و بیش دست کش ہوچکی ہیں اور صرف میڈیا کے ذریعہ نمو پذیری کے شوق بے حد سے مغلوب نظر آتی ہیں اس صورت حال نے جس سنگین خطرہ کو جنم دیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات جن کتب بے بضاعت کی تقاریب رونمائی میں جلوہ افروز ہوتے ہیں ان کے خس و خاشاک کا سیل بیکراں شعر و ادب کے ثقہ و صحت مند رجحانات کو بھی بہا کر لے جاسکتا ہے۔ (اپریل۔ جون ۲۰۰۳ء)

’ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں‘

’’الاقرباء‘‘ کے گزشتہ شمارہ (اپریل تا جون ۲۰۰۳ء) میں ’’ادب اور نظریہ ضرورت‘‘ کے زیرعنوان جو اداریہ سپردقلم کیا گیا تھا اس پر قارئین نے بالعموم اور اہل قلم نے بالخصوص جس بصیرت افروز ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ اس تاثر کو مزید تقویت بخشتا ہے کہ

’’غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ☆ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں‘‘

یعنی عہد حاضر ادب میں ایسے رویوں سے مغلوب نظر آتا ہے جو تحقیق و تخلیق کی افادیت و معنویت کو پس پشت ڈال کر فکری سطحیت اور فنی و علمی سہل انگاری کے رجحانات کو پروان چڑھا رہے ہیں اور ان رویوں نے جہاں اقدار و مقدار کے لطیف امتیازات کو دھندلا کر رکھ دیا ہے وہاں ان عناصر کو مسند اقتدار بھی سونپ دی ہے جو ابلاغ و اظہار کے وسائل کی پشت پناہی کے بل پر ادب کی قلمرو کو نہ صرف اپنے تصرف میں لا چکے ہیں بلکہ ’’معیار‘‘ کے ضامن اور اجارہ دار بھی بن بیٹھے ہیں۔ زیرنظر شمارہ میں شائع ہونے والے متعدد خطوط سے بھی اسی نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے جن میں ہمارے فاضل مراسلہ نگاروں نے زوال پذیر اس صورت حال کا معروضی اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے چنانچہ اس ضمن میں ایک نکتہ جو واضح ہو کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ معاصر ادب کے تخلیق کاروں کی ایک غالب اکثریت اپنی نگارشات سے یہ تاثر دے رہی ہے کہ ماضی ان کے نزدیک ایک عہد فراموش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا چنانچہ اس کی شکست و ریخت پر جو عمارت تعمیر کرنے کی وہ سعی فرما رہے ہیں اسے بنیادوں کا استحکام کبھی نصیب نہیں ہو سکتا اور نہ مستقبل کا امکانی تصور ان کی گرفت میں آ سکتا ہے۔

☆ ’’مستند ہے میرا فرمایا ہوا‘‘ کے مصداق غالب ہی ’’غلطیہائے مضامیں‘‘ باندھ سکتے ہیں۔ (ادارہ)

ہم گزشتہ اداریہ کے تسلسل میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ دو نہایت اہم عوامل اس صورت حال کے ذمہ دار نظر آتے ہیں اولاً وہ تعلیم و تربیت اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا منظر نامہ جس کے زیر اثر لکھنے والوں کی نئی نسل ذہنی نشو و ارتقا کے مراحل سے گزری دوئم وہ فکری و نظری بساط اور علمی و فنی استعداد جو اس کے نتیجہ میں انہیں میسر آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام منظر نامہ اس سے بہت مختلف ہے جس میں پیشرو نسل کو اپنی جبلّی صلاحیتیں بروئے کار لانے اور اکتساب علم و حکمت کے لامحدود ذرائع سے پوری یکسوئی کے ساتھ استفادہ کا بھرپور موقع ملا چنانچہ یہ فرق آج ان تخلیقات کا معروضی جائزہ لینے سے واضح ہو جاتا ہے جو ایک طرف Classics کے زمرے میں آتی ہیں اور جن پر قدامت و رجعت یا کلاسیکی طرز فکر کا لیبل چسپاں ہے اور دوسری طرف جدت و جدیدیت کا نام نہاد مکتب فکر قرطاس و قلم کو آلہ کار بنائے ہوئے ہے۔ ترقی پسند تحریک ادبی ارتقاء کے ایک خاص مرحلے پر ابھری اور اس نے متعدد قد آور شخصیتوں کو جنم دیا جو ہمارے ادب کا لازوال اثاثہ بن گئے لیکن اس طائفہ خیال نے کلاسیکی ادب سے نہ اغماض برتا اور نہ اس کی بنیادوں کو مسمار کرنے پر کمربستہ ہوئے بلکہ شاعری میں خصوصاً ان فنی اقدار کا احترام کیا اور اشاریت و رمزیت کے حسن سے آراستہ روایتی استعارات و تشبیہات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جو کلاسیکی ادب کا وقار و افتخار ہیں یہی نہیں بلکہ قدیم و جدید افکار و علامات کے استعمال سے اسلوب کے خوشنما امتزاج کی صورت میں لفظ و معنی کو تازگی عطا کی ایسے ہی ایک کاروان رنگ و بو کے سرخیل فیض احمد فیض قرار پائے جبکہ کلاسیکی ادب جس سے قدامت و رجعت کو یکسر منفی مفہوم میں منسوب کیا جاتا ہے مختلف اصناف ادب کو کہ وہ ناول و افسانہ ہو یا نظم و غزل ایسی جید و بے مثال ہستیوں کی کہکشاں مرتب کر چکا ہے جن کی تجلی بار تخلیقات آنیوالے ہر وقت میں منارۂ نور بنی رہیں گی اس کے برخلاف جدت و جدیدیت کے نام پر جو نام نہاد ادب آج تخلیق ہو رہا ہے وہ نہ صرف فکر و نظر کی گہرائی اور گیرائی سے یکسر محروم نظر آتا ہے بلکہ اصناف ادب کی ہئیت کو بھی نامانوس کُھردرے اور بے ہنگم الفاظ کے استعمال سے مسخ کرتا چلا جا رہا ہے اگر ایسا نہیں تو کیا یہ ادب اپنی کوکھ سے جنم لینے والوں میں ان ہستیوں کا کوئی عشر عشیر بھی پیش کر سکتا ہے جو کلاسیکی شعر و ادب کا سرمایہء افتخار ہیں اور جن کے بغیر

ادب یا شعر کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اصناف سخن جنہوں نے کلاسیکی اقدار کے زیر سایہ نشو و نما پائی آج ناپید ہوتی جا رہی ہیں کیا واقعی رباعی جیسی جلیل و جمیل صنف سخن کا نعم البدل ''ہائیکو'' کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کا ہمارے قلمکار سے نہ تو کوئی معاشرتی رشتہ ہے اور نہ جو ہمارے تہذیبی و ثقافتی مزاج سے کوئی مطابقت رکھتا ہے؟ رباعی کا فن عظیم ذہنی صلاحیت' فکر و نظر کی پختگی اور فلسفہ و فن پر مضبوط گرفت کا متقاضی ہے جبکہ یہ اوصاف جدت و جدیدیت کے نام پر ابھرنے والے کسی بھی پست قامت میں نظر نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ یہ عظیم المرتبت صنف سخن معدوم ہوتی جا رہی ہے تاہم وہ چند بزرگ جنہوں نے اپنے عہد جوانی میں اکتساب فیض کیا اور مسلسل کاوش و کوشش سے اس صنف سخن کو تمکنت و توانائی بخشی آج اس شبستان شعر کے آخری چراغ بن کر ٹمٹما رہے ہیں غزل کی حسین صنف سخن کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں کہ جدیدیوں نے اس کی دُرگت بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی یا یوں کہیئے کہ غزل کی لطافت معنوی و ہمہ گیری' ثقافتی آہنگ اور فنی محاسن کو قائم و دائم رکھنے اور انہیں مزید جلا اور تازگی بخشنے کے لئے جس ذہانت فکر اور فنکارانہ ذکاوت کی ضرورت ہے وہ ان اہلیت و مطالعہ اور نفاست مذاق و عقل سلیم سے محروم لوگوں کے بس کا روگ نہیں۔ ادب میں نئے افق تلاش کرنے اور قدیم و جدید فکر کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا کام اور ماضی حال و مستقل کو مربوط و منضبط رکھنے کا دانش و حکمت پر مبنی عمل وقت کی شدید ترین ضرورت ہے لیکن یہ کام جن معدودے چند ہاتھوں کے ذریعہ انجام دینے کی مساعی کی جا رہی ہیں ان کی قطع و برید پر ایک انبوہ کم سواداں کمربستہ نظر آتا ہے اور یہی وہ ادبی مافیا ہے جو ذرائع ابلاغ پر اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی حکمت عملی پر کارفرما ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ ادب کے علم و حکمت اور تدبر و ثقاہت کے ورثہ کی نگہبانی کرنے والی اقلیت منظّم ہو کر کثرت کم نظراں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کو روکے اور ادبی ابلاغ کے ان گوشوں کو تقویت بہم پہنچائے جو اس ہنگام انتشار میں مقدار سے ہٹ کر اقدار کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ (جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۳ء)

پڑیئے گر بیمار۔۔۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

* * *

کوئی بھی مہذب متمدن اور متحرک معاشرہ فرد کی اہمیت و افادیت سے نہ تو انکار کر سکتا ہے اور نہ فرد کے معاشی و معاشرتی حقوق سے صرفِ نظر کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے ویسے بھی افراد، معاشرے کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت سے جس توجہ اور حسن سلوک کے مستحق ہوتے ہیں اس کی ذمہ داری بھی ریاست کے فرائض منصبی میں سرِ فہرست ٹھہرتی ہے چنانچہ حکومت، ریاست کے ایک موثر عامل کے طور پر یہ اہتمام کرنے کی پابند ہے کہ افرادِ معاشرہ یا شہریانِ ریاست کے بنیادی حقوق بغیر کسی تعطل یا رخنہ اندازی کے انہیں حاصل رہیں، ان افرادِ معاشرہ میں وہ طبقات بھی شامل ہوتے ہیں جو اپنی کاوشوں سے نہ صرف معاشرہ کے خدوخال سنوارتے ہیں بلکہ تہذیبی و ثقافتی اور تمدنی و معاشرتی شعبوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت خاموشی سے ایک مسلسل و متواتر نادیدہ عمل کے ذریعہ ایسے ایسے خوبصورت رنگ بھرتے ہیں جو اس معاشرہ کو قار و تمکنت ہی نہیں بلکہ لطافت و رعنائی سے بھی ہمکنار کرتے ہیں۔ قوموں کے اجتماعی شعور کی تشکیل و تہذیب میں یہی طبقات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور یہی اجتماعی شعور قوموں اور معاشروں کو ایسی شناخت عطا کرتا ہے جو ان کا سرمایۂ و افتخار بن جاتی ہے لیکن اس نادیدہ عمل کے تسلسل اور اس کی اثر پذیری کو صرف چشمِ باطن ہی سے دیکھا جا سکتا ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ”دیدۂ دل“ سے تعبیر کیا اور ”ظاہر کی آنکھ سے تماشا“ کرنے سے منع فرمایا چنانچہ وہ معاشرے جو صرف ”ظاہر کی آنکھ“ پر انحصار کرتے ہیں۔ سنگین ترین ناانصافیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور معاشرتی تشکیل کے ان عناصر کو فراموش کر بیٹھتے ہیں جن کا ادراک صرف بصیرت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس عمل کے دوران یہ معاشرے بھول جاتے ہیں کہ جس طرح جسم کو صرف روح ہی متحرک رکھ سکتی

ہے اسی طرح معاشرہ کو تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی رنگ و آہنگ عطا کرنے والے صرف ادیب، شاعر اور فنکار ہی ہوتے ہیں اور انہیں عمر کے اُس حصہ میں بے یارومددگار چھوڑ دینا جب معاشرہ پر ان کی خدمات کا قرض اُتارنا فرض ہو جاتا ہے ایک انتہائی سنگین جرم اور ظالمانہ فعل ہے چنانچہ اس روح فرسا المیہ سے ہم بھی آج اس طرح دوچار ہیں کہ حکومت اور ادارے اپنے تخلیق کاروں کی اہمیت و افادیت کے نہ تو دل سے معترف نظر آتے ہیں اور نہ وہ ان کی نسبت احساس فرض سے سرشار۔ اس سلسلہ میں جو بھی خانہ پُری نظر آتی ہے وہ نمود و نمائش کے سوا کچھ نہیں۔

ہماری اس تحریر کا متحرک زیر نظر شمارہ میں شامل مراسلات میں پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی کا وہ مراسلہ ہے جو دعوت فکر دیتا ہے ان ارباب اختیار کو جن کی فہرستِ ترجیحات میں شاعر، ادیب یا فنکار کو اس کا درست اور جائز مقام نہیں دیا گیا یا وہ اس بصیرت ہی سے محروم ہیں جو اس نظر افتادہ طبقہ کی گراں بہا خدمات کا حقیقی منظر تشکیل دے سکے۔ ڈاکٹر صاحب کے خط میں چند نہایت اہم پہلو برملا انداز میں سامنے آئے ہیں اولاً یہ کہ حکومت نے علم و تحقیق اور ادب و فن سے متعلق بعض اداروں کے قیام کا اہتمام تو کر دیا ہے جو مخصوص لوگوں کی کفالت کے ضامن بنے ہوئے ہیں لیکن یہ ادارے ایسا کوئی بھی نظام کار وضع کرنے سے قاصر رہے ہیں جس کے تحت ملک میں موجود اہل علم و دانش کی فنی و تخلیقی صلاحیتوں سے استفادہ کا کوئی مربوط عمل جاری و ساری رہ سکے۔ ثانیاً ایسا کوئی نظام جزوی حیثیت میں اگر موجود ہے بھی تو وہ صرف منظور نظر افراد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے یا بڑے شہروں پر مرتکز کر دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں اظہار و ابلاغ کے ذرائع تک موثر رسائی نہ رکھنے والے وہ فنکار و اہل علم جو پس ماندہ اور دور دراز علاقوں میں رہائش پذیر ہیں حکومتی اداروں کی ‘‘فیاضی’’ سے نہ صرف محروم ہیں بلکہ ‘‘آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل’’ کے مصداق مستقبل میں بھی کسی ایسے امکان کی توقع نہیں رکھتے۔ یہ صورتحال صلاحیتوں کے مجرمانہ ضیاع پر منتج ہو رہی ہے اور ضرورت ہے کہ اصلاح احوال کے لیے فوری اور بامعنی اقدامات کیے جائیں۔ بزرگ اہل قلم کے صرف وظائف مقرر کر دینا ہی کافی نہیں کیونکہ دانش پروری کا یہ انداز اکثر خوددار طبائع پر بار بھی گزر سکتا ہے لہٰذا اہل قلم اور اہل فن کے ایک ایسے ہمہ گیر جائزے اور نظام العمل کی ضرورت

ہے کہ ان کی عزتِ نفس کو مجروح کئے بغیر وہ خواہ کہیں بھی ہوں ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جا سکے اور حکومتی اداروں کی جانب سے معاشی تعاون کی پیشکش ان کے لیے باعثِ طمانیت ہو نہ کہ وجہ تضحیک۔

ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ اس ضمن میں جو طریقہ ہائے کار وضع کئے جائیں وہ سہل و سادہ ہوں اور استحقاق کے ضامن ہوں تا کہ ”غزنوی و فردوسی“ کا المیہ زہر مکرر بن کر ہمارے معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت نہ ہونے پائے۔ عالمی ادب ایک بحر ذخار ہے جس سے تراجم نہ صرف ہماری علمی و ادبی اقدار کو وقیع و بیش قیمت بنا سکتے ہیں بلکہ تحقیق و تخلیق کی حوصلہ افزائی بھی ہمارے قومی اور معاشرتی وجود میں نت نئی جہتوں کا اضافہ کر سکتی ہے ہمیں یقین ہے کہ علم و دانش کے ایسے کارہائے نمایاں انجام دینے میں ہمارے دُور افتادہ اہل قلم و اہل فن حکومتی اداروں کے قرب و جوار میں بسنے والے دانشوروں سے کسی طرح کمتر ثابت نہیں ہونگے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

انصاف کا تقاضا ہے کہ ملک میں موجود حکمت و دانش اور تجربہ و ذہانت کے عظیم سرمایہ کو پائے حقارت سے نہ ٹھکرایا جائے، قرطاس و قلم کی سرپرستی کی جائے اور اہل علم کی کسمپرسی و زبوں حالی پر ترس کھانے کی بجائے استعداد و صلاحیت کو بنیاد بنا کر استحقاق کے اصول کو تسلیم کیا جائے کہ قلم بدست افرادِ گدایانِ کاسہ بدست نہیں بلکہ اُس معاشرے سے جسے انہوں نے اپنے خونِ جگر سے آب و رنگ بخشا ہے صرف قدر شناسی کا حق طلب کرتے ہیں۔

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۳ء)

قلم کشانِ ادب وصحافت

عجلت میں تخلیق کیے گئے ادب کو صحافت سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی صحافت اگر ادب کی کوئی باقاعدہ صنف نہیں تو بہ اعتبارِ تخلیق ادب سے مماثل ومتعلق یقیناً ہے رہا عجلت کا سوال تو یہ ایک ناگزیر عمل اس لیے ہے کہ صحافت کی بنیاد وقائع نگاری پر قائم ہے جو اس امر کی مقتضی ہے کہ تازہ ترین حالات وواقعات کو ممکنہ سُرعت کے ساتھ قارئین وناظرین تک پہنچا دیا جائے۔ قارئین کے ساتھ ناظرین کا اضافہ دورِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے جس کا سہرا بصری ذرائع ابلاغ کے سر ہے اور یہی وہ سرچشمۂ قوت ہے جس نے صحافت کو بحیثیت مجموعی یعنی قلمی، سمعی وبصری توانائی عطا کر کے دورِ حاضر ہی کی ایک اور بیک وقت “سفاک وتابناک” طاقت یعنی جوہری توانائی کا ہم پلّہ ہی نہیں بلکہ بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو زیادہ موثر وبرتر بنا دیا ہے چنانچہ جس طرح جوہری توانائی کا استعمال انسانیت کی ہلاکت وبربادی پر منتج ہو کر “سفاک” اور مادّی فروغ وارتقاء کا سبب بن کر “تابناک” کہا جا سکتا ہے اسی طرح صحافت کی مجموعی قوت کا استعمال “سفاک” بھی ہو سکتا ہے اور “تابناک” بھی۔

ان نئے امکانات ومضمرات پر صحافت کے اجارہ دارانہ تصرف نے اب عملاً اس تصور کی بھی تکذیب کر دی ہے کہ یہ ادب سے “مماثل ومتعلق” ہے البتہ “قلم” دونوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے جس کے بارے میں کہا گیا تھا۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم　　قلم کش را بدولت می رسانم

لیکن تجربہ ومشاہدہ اس صداقت کے گواہ ہیں کہ قلم نے اپنے تقدس وحُرمت کے باوجود “قلم کشانِ ادب وصحافت” کے درمیان انصاف نہیں کیا کہ دولت تک رسائی اربابِ صحافت کا مقدر بنا دی گئی اور محرومی اہل ادب کی قسمت! یہ تفاوت اس قدر شدید، برملا اور وسیع البنیاد ہے کہ کسی

وضاحت کا محتاج ہے نہ شواہد کا رہین منت! یہی نہیں بلکہ صحافت نے ادب کی حدود سے اس درجہ تجاوز کیا ہے کہ اسے اب ’’صنعت‘‘ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور دنیا کے متعدد وابستگان صحافت کا شمار اب ’’اہل صحافت‘‘ میں نہیں بلکہ دولت مند ترین صنعت کاروں کے ساتھ بطور ’’صحافت کار‘‘ کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کا ایک واشگاف پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا کی طاقت ور ترین حکومتیں اور مقتدر ترین شخصیتیں بھی صحافت کاروں کے ’’جلالِ قاہرانہ‘‘ کے سامنے لرزہ براندام رہتی ہیں اور یہ سراسیمگی انہیں ہمیشہ صحافت پیشگاں کی خوشنودی کا مستقل متلاشی بنائے رکھتی ہے تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قلم ادب وصحافت میں قدر مشترک ہونے کے باوجود ان دونوں شعبوں کے درمیان ایک آہنی حد فاصل قائم کر چکا ہے اور ’’سرعت نگاری‘‘ نے ادب کی حکمت وتدبر اور دانش و کاوش سے مملو نگارشات پر مادی فوقیت حاصل کر کے ادیب کو صحافی کے مقابلے میں بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔

ہر چند کہ ادب یا ادب کی مختلف اصناف سے متعلق اکثر اہل علم وقلم اس معاشرتی ناانصافی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے کہ ’’وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے‘‘ لیکن وہ معاشرے جو کسی نظریاتی، دینی یا اخلاقی بنیاد سے وابستگی کا ’پرِ افتخار‘ اپنی کلاہِ اقتدار میں سجائے ہوئے ہیں انہیں ہرگز یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ قرطاس وقلم کے امین اُس طبقہ سے صرف نظر کریں یا اغماض برتیں جو نہ صرف معاشرتی اقدار کی تربیت و پرورش کا گراں بہا فریضہ انجام دے رہا ہے بلکہ وقتی مصلحتوں سے ماورا ہو کر ابدی حقیقتوں کی تلاش وجستجو سے افراد معاشرہ کو حکیمانہ رہنمائی بھی مہیا کر رہا ہے اس کے برعکس المیہ بلکہ سفاک المیہ یہ ہے کہ تمام تر توجہ اور ’’نوازش ہائے بے جا‘‘ کا مستحق صرف اُس طبقہ کو قرار دیا جائے جو قلم کے استعمال کے ذریعہ ’’جلالِ بادشاہی یا جمہوری تماشہ‘‘ جو بھی ہو اس کا پردہ چاک کرنے یا ’’رازہائے درون پردہ‘‘ کو افشا کر دینے کے امکان وصلاحیت پر قادر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ یہ تو سن سکتے ہیں کہ حکومت نے صحافیوں کے لیے ’’تازہ بستیاں‘‘ آباد کرنے کا اہتمام کیا ہے ان کے بچوں کے لیے وظائف مقرر کیے ہیں۔ ملازمتوں میں کوٹہ مختص کیا گیا ہے۔ سرکاری تقاریب میں مدعو کیا گیا ہے۔ زمین وفضا کی سفری سہولتوں سے نوازا ہے، غیر ملکی دوروں پر ’’قرب

شاہی’’ کا شرف بخشا گیا ہے۔ سرکاری عمال کے فرائض کی بجا آوری کو بھی اگر ‘‘آزادیٔ صحافت’’ میں سدِ راہ سمجھا گیا ہے تو ملک کے اعلیٰ ترین مناصب سے بھی معذرتیں کی گئی ہیں لیکن ایسا کہاں ممکن کہ آپ یہ بھی سنیں کہ وہ لوگ جو معاشرے میں علم وحکمت کی پہچان اور دانش وذہانت کی آبرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے قلم نے پوری بے لوثی سے معاشرتی اقدار کو سنوارا اور زندگی کی نوع بہ نوع جہتوں کی تزئین کا فرض انجام دیا ہے انہیں بھی کسی ایسی ‘‘عنایات خسروانہ’’ سے نوازا گیا ہے جن کا سزاوار ان کے ہم قلم ارباب صحافت کو قرار دیا گیا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۴ء)

بین المملکتی ادب

ہر چند کہ ادب جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ مقامی حالات و واقعات سے ماورا اپنے بنیادی خدوخال مرتب کر سکے البتہ عالمگیریت یا آفاقیت کے عوامل ادب کو صرف اسی وقت اپنی گرفت میں لیتے ہیں جب ادب تخلیق کرنے والے اذہان انسانیت کو ایک نا قابل تقسیم وحدت کی حیثیت سے اپنا موضوع فکر بنائیں ایسی صورت میں جغرافیہ اپنی شناخت تو ضرور برقرار رکھتا ہے لیکن حیاتِ انسانی کے وسیع تر کینوس میں تحلیل ہو کر اُن اقدار کے تابع ہو جاتا ہے جو رنگ و نسل کے امتیازات کو پس پشت ڈال کر صرف اور صرف عالم انسانیت کی ترجمانی اور حیاتِ انسانی کی عکاسی پر قادر ہوں۔

اس سال مارچ میں پاکستان کو سارک ممالک کے ادیبوں اور اہل قلم کی ایک توجہ طلب کانفرنس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ سارک میں یعنی جنوبی ایشیا کی علاقائی تعاون کی تنظیم میں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، مالدیب، نیپال اور بھوٹان شامل ہیں۔ یہ ممالک مربوط شکل میں جنوبی ایشیا کا ایک ایسا نقشہ مرتب کرتے ہیں جس پر تاریخی و جغرافیائی، تہذیبی و معاشرتی اور لسانی و ادبی مماثلتوں اور یکسانیتوں کے منتشر نقوش اس خطۂ ارضی کے پس منظر و پیش منظر کو رنگا رنگی میں یک رنگی (Unity in diversity) عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نوع کے سیاق و سباق کی تشکیل سے ایک ایسا ادب وجود میں آسکتا ہے جسے اس خطہ کے حوالے سے بین المملکتی ادب کہا جا سکے، اہل قلم اُن واشگاف و برملا حقیقتوں کو اپنے افکار کا موضوع بنا سکتے ہیں جو تمام خطہ میں اقدارِ مشترکہ کی حیثیت رکھتی ہوں چنانچہ کانفرنس میں اس امر پر کامل اتفاق پایا گیا کہ غربت و جہالت کے بیکراں اثرات نے سارک ممالک کے عوام کی زندگیوں کو ایک کربِ مسلسل سے دوچار کر رکھا ہے اور یہ اذیت ناک عمل انسانی صلاحیتوں کو نہ صرف ابھرنے سے پہلے ہی نیست و نابود کر دیتا ہے

بلکہ معاشرہ کے تہذیبی وتمدنی مزاج اور معاشی ومعاشرتی توازن پر سفاک منفی رجحانات بھی مرتب کرتا ہے۔ ہر چند کہ ادب خواہ وہ افسانہ وناول کی شکل میں ہو یا نظم وغزل کی متنوع اصناف کی صورت میں ماحول میں ایک فکری ارتعاش یقیناً پیدا کرسکتا ہے لیکن وہ انقلاب جو انسانی حقوق کے احترام کی نوید لے کر معرض وجود میں آئے یا جو دولت کی ناواجب تقسیم کے بے رحمانہ نظام پر کاری ضرب لگائے، شاید اُس برق رفتاری سے برپا نہ ہو سکے جس کی اشد ضرورت ہے کہ مزاحم قوتیں اپنی جڑیں اتنی مضبوط بنا چکی ہیں کہ انہیں اکھاڑ پھینکنے کے لئے جدید ترین مادی وسائل کی ایک قوت لایموت درکار ہوگی۔

اندریں حالات قلم کا استعمال انتہائی حُزم واحتیاط کا متقاضی ہے اور فنکارانہ غور وفکر کے ساتھ ساتھ مدبرانہ حکمت عملی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ایسے حالات مین غیر متوازن تحریریں طبقاتی تقسیم اور باہمی منافرت کے منظرنامہ پر منتج ہوتی ہین جن سے انسانی وحدت وعظمت کا پامال ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے جو ہر تعصب سے آزاد کسی بھی اہل قلم کا مدعا نہیں ہوسکتا چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے سارک ممالک کے اہل قلم کے درمیان انفرادی اور اجتماعی روابط کا فروغ ازبس ضروری ہے جس کے لیے ہر ملک میں جہاں مناسب وقفوں سے سیمینارز اور کانفرنسوں کا انعقاد مددگار ثابت ہوسکتا ہے وہاں متعلقہ حکومتیں اہل قلم کو سفر وقیام کی ایسی سہولتیں مہیا کرسکتی ہیں جس کے نتیجہ میں اہل قلم کی بین المملکتی نقل وحرکت میں اضافہ ایک دوسرے سے فکری اور جذباتی قرابتیں پیدا کرنے اور تہذیبی وثقافتی رویوں میں ہم آہنگی کی فضا کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کرسکتا ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تک سارک تنظیم کا کوئی بھی باوسیلہ وبااثر رکن اہل قلم کو سیاسی ترغیبات سے اپنا ’آلۂ کار‘ بنانے کی کوشش نہ کرے اور ایسا نہ ہو کہ ایک ملک کی مخصوص تہذیب وثقافت اور تمدن ومعاشرت کو اہل قلم کے استحصال کے ذریعہ سارک ممالک کے چپہ چپہ پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہمارے ان خدشات کو بدقسمتی سے جو بنیاد فراہم ہوتی ہے وہ خود ہمارے درمیان ایسے ‘‘نحیف الضمیر’’ اشخاص کی موجودگی کے باعث ہے جو ایک غیر ملکی مشاعرہ یا کسی نام نہاد بین

الاقوامی کانفرنس کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے اپنا ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کا وقار بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اور ایک مخالف نظریے کے حامل سامعین کی خوشنودی کے لیے اپنے ہی بنیادی اقدار و نظائر کو ہدف تنقید بناتے ہیں یہ لوگ پیشہ ور قلم فروش ہیں اور جن کا منتہائے مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی رُطب ویابس تخلیقات کے غیر ملکی زبانوں میں تراجم اور اپنے ''اعزاز'' میں تقاریب کا بہر قیمت بندوبست کر کے اپنی '' کلاہِ دانش'' میں ایسے سرخاب کے پر سجا کر واپس لوٹیں تو اہل وطن انہیں عظیم شاعر اور بین الاقوامی ادبی شخصیت سمجھنے پر مجبور ہو جائیں ہمیں افسوس ہے کہ لاہور میں منعقد ہونیوالی سارک ادبی کانفرنس بھی اگر تمام نہیں تو بعض ایسے افراد کے شوقِ فضول کی نذر ہو کر رہ گئی جو صرف ذاتی مفادات کے تحت متحرک و سرگرداں رہے اور یرغمالی کانفرنس کوئی ایسا جامع چارٹر دینے سے قاصر رہی جو مستقبل کے لیے ایک حقیقی بین المملکتی لائحہ عمل کا نقیب بن سکتا بہرحال یہ بھی کیا کم ہے کہ:

'نشستند و گفتند و برخاستند'

(اپریل۔ جون ۲۰۰۴ء)

مغرب میں اُردو زبان وادب کے امکانات

نواب مرزا داغ دہلوی اُردو نام کی جس زبان کو جانتے تھے اس کی دھوم ہندوستان میں مچی ہوئی تھی۔ یہ امر ان کیلئے یقیناً باعث فخر بھی تھا اور وجہ امتیاز بھی کہ ''وہ ہی'' اس زبان کو جاننے کا دعویٰ کر سکتے تھے یعنی

اُردو ہے جس کا نام ''ہمیں'' جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ کی شاعری ان تمام جہتوں کی نقیب نظر آتی ہے جو سلاست و روانی، برجستگی و بے ساختگی، شوخی و شرارت اور معاملہ بندی ہی نہیں بلکہ خلوت وجلوت کے رموز و نِکات، روز مرہ ومحاورہ کے نت نئے اسالیب اور معاشرتی وتہذیبی نزاکتوں اور باریکیوں کی جملہ لطافتوں کو احاطہ کیئے ہوئے تھیں، یہ تمام اوصاف شاعر کی اُردو زبان پر تخلیقی گرفت اور ہمہ گیر تنوعاتی صلاحیت کے مرہون منت تھے جسے غالب، ذوق، مومن، انشاء، جرأت وآتش اور مصحفی ومیر جیسی عظیم ہستیوں کا پس منظر حاصل تھا جو اُردو زبان کے سفرِ ارتقاء میں سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے تھے۔

لیکن بعد میں اُردو زبان نے جس برق رفتاری سے قبولِ عام اور شہرتِ دوام کے ہفت خواں طے کیئے وہ بذاتِ خود ایک سحر انگیز حقیقت ہے۔ خواص کے حلقہء باریابی سے نکل کر اور عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر اُردو نے اجارہ شکنی کا بھی عظیم کارنامہ انجام دیا نیز مستقبل کے افق کو نوید کامرانی دیکر تابناک بنا دیا چنانچہ آج اُردو ایک عالمی زبان کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے جو کم وبیش ایک ارب انسانوں کے درمیان رابطہ اور اظہار وابلاغ کا مسلمہ ذریعہ ہے اس کی دھوم اب صرف جنوبی ایشیا ہی میں نہیں بلکہ چار دانگ عالم میں سنی جاسکتی ہے۔

اُردو زبان کی اس ہمہ جہتی و ہمہ گیری کا بنیادی سبب اس کی تحلیل وانجذاب کی لسانی

صلاحیت ہے جو اسے ایک ممتاز عالمی زبان کا مرتبہ عطا کرتی ہے اس کے نتیجہ میں جہاں اس میں رابطہ کی زبان کی حیثیت سے بے کراں وسعت پیدا ہوئی ہے جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان یا بولی اس کی حریف نہیں بلکہ حلیف ہے وہاں بتدریج اس میں ایک مشترک عالمی تہذیب وثقافت کی تشکیل کے اجزاء پرورش پا رہے ہیں، اُردو میں تخلیق کیا جانے والا ادب جغرافیائی حدود وقیود سے ماورائیت کے واضح اور برملا اشارے دے رہا ہے۔ دوسری زبانوں کی اصنافِ ادب اُردو ادب میں منتقل ہو رہی ہیں جبکہ دیگر معروف عالمی زبانوں میں اُردو اصناف ادب کے تراجم لسانی عالمگیریت کے خدوخال مرتب کر رہے ہیں۔ اُردو صحافت جس میں سمعی و بصری ذرائع ابلاغ بھی شامل ہیں ایک زبردست قوت بن کر ابھری ہے اور ''ہفت کشور کی بے تیغ و تفنگ تسخیر'' اس کا مقدر بنتی جا رہی ہے۔

ہمارا یہ احساس اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی تقویت حاصل کر رہا ہے کہ مغرب جس کی زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب ومعاشرت بھی جو جنوبی ایشیا پر اپنا مکمل تسلط جما چکے تھے اور جن کی گرفت سے ہماری حیاتِ اجتماعی کے مظاہر بلکہ اذہان تک آج بھی آزاد نہیں ہو سکے ہیں خود اُردو زبان وادب کی سحر انگیز آفاقیت کے زیر اثر آتا جا رہا ہے اس کا سہرا بالخصوص جنوبی ایشیا سے نقلِ مکانی کر کے مغرب کی طرف جانے والوں کے سر ہے جن میں پاکستانی تارکین وطن زیادہ سرگرم و متحرک نظر آتے ہیں، ترکِ وطن ایک مادی مجبوری سہی لیکن حبِ وطن کا نقش ان سفیرانِ وطن کے دلوں پر اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں وہ لوگ اب لاکھوں سے بھی متجاوز ہو چکے ہیں، جو اپنے ساتھ اپنی ذہنی وعلمی صلاحیتوں کے علاوہ اپنی تہذیب وثقافت بھی لیکر گئے ہیں اور سرزمینِ وطن سے ذہنی وروحانی رشتے ''بُعدِ منزل'' کے باوجود مزید مستحکم ہوئے ہیں اسی لئے اپنی شناخت کو قائم ودائم رکھنے کا احساس اور بھی شدید نظر آتا ہے۔ امریکہ میں صرف شکاگو سے دو درجن سے زائد اُردو اخبار ورسائل شائع ہوتے ہیں جو اپنے لاکھوں قارئین میں اُردو زبان اور مشرقی تہذیب وثقافت کی روایات کے نادیدہ وغیر محسوس عمل کو پروان چڑھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ کینیڈا، یورپ اور اسکینڈینیویا کے ممالک سے بھی اخبارات ورسائل کی اشاعت کا ایک لامتناہی

سلسلہ وجود میں آ چکا ہے اور متعدد پرائیویٹ ٹی وی چینل شب و روز اُردو نشریات بین البراعظمی سطح پر اپنے کروڑوں ناظرین تک پہنچا رہے ہیں۔ مشاعروں کی روایت جو کبھی برصغیر کا طُرّۂ امتیاز بن گئی تھی اب تیزی سے مغربی ممالک میں جڑیں پکڑ رہی ہے۔

لیکن اس حیات افروز منظر کو داغدار بنانے کا فعل قبیح بھی بد قسمتی سے ہمارے ہی بعض عاقبت فراموش، ہوس گزیدہ اور شعور باختہ نام نہاد اہل قلم انجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سید عاشور کاظمی کی تازہ تصنیف جو مغرب میں اُردو زبان اور تہذیب و ثقافت پر ایک وقیع تحقیقی کاوش کی حامل ہے بعض تکلیف دہ گوشوں کی بھی نقاب کشائی کرتی ہے یہ تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے ''بیسویں صدی کے اُردو نثر نگار۔ مغربی دنیا میں'' اور ''بیسویں صدی کے اُردو اخبارات و رسائل ۔۔ مغربی دنیا میں'' عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ فاضل مصنف نے مغرب میں اُردو شاعری کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اس کی معقول وجوہ کا چبھتا ہوا احساس ہمیں بھی اپنے ایک حالیہ مشاہدہ میں ہوا بلکہ چند روز قبل کراچی کے اخبار ''ڈان'' میں شائع ہونے والے اپنے انگریزی کے ایک کالم (نقطۂ نظر) میں انتظار حسین صاحب نے بھی اس ''سہو دانستہ'' پر روشنی ڈالی ہے اور ان پیشہ ور ''دیباچہ نگاروں'' کو بے نقاب کیا ہے جو ذہن فریب ''شاعرانہ عظمتوں'' کا لبادہ زیب تن کر کے آئے دن امریکہ و یورپ میں اپنے فنِ دریوزہ گری کے جوہر آزمانے کے لئے سفرِ بے رخت پر کمر بستہ رہتے ہیں اور وہاں اُن معصوم و بے ریا لوگوں کو جو شاعر بننے کے ''خبط زر فشاں'' میں مبتلا ہیں اور جو شعر کی ابجد تک سے واقف ہونے کی سعیٔ نامشکور تک کے روادار نہیں اپنی ہوس زر کا سفاکانہ ہدف بناتے ہیں اور وہ بیچارے برضا و رغبت نہ صرف اپنے خون پسینے کی کمائی ان کی نذر کر بیٹھتے ہیں بلکہ ان کے اعزاز میں مشاعرے منعقد کر کے خود بھی بحیثیت شاعر سندِ اعتبار حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں، ایسے نوجوان اکثر ''مطبوعہ دواوین در بغل'' ادبی محفلوں میں بے سروپا ''دیباچوں'' کی عبرتناک بیساکھیوں پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید اقبال نے انہیں کے لئے کہا تھا کہ:

''نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب'' [۵]

سعدیؒ تو اپنے سفر چہل سالہ کے تجربات و مشاہدات کا گنج گرانمایہ آئندہ نسلوں کو منتقل کر کے جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر گئے مگر ہمارے قلم پیشہ زائرینِ مغرب جن کا اپنا انشاء و املا تک درست نہیں اصلاح شعر کے نام پر شاعری (جسے حافظ نے ''جزوے ست از پیغمبری'' کہا) کا حلیہ بگاڑ کے ادب کی کونسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ تقریظ نویسی کو وسیلۂ معاش بنانا اور وہ بھی ان معصوموں کا مجرمانہ استحصال کر کے جنہیں خود ہی پتہ نہیں کہ وہ تین تین چار چار شعری مجموعوں کے خالق کس طرح بن بیٹھے کہاں کی شرافت ہے' ادب کے ان سوداگروں کا کردار یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ واپسی پر وطن کے رسائل و جرائد میں رطب و یابس سے مملوان تحریروں کو بمعاوضۂ خطیر چھپوانے کا ٹھیکہ لے کر بھی آتے ہیں اور اگر کبھی یہ ''معصومان ادب'' سرزمین وطن پر قدم رنجہ فرمائیں تو بین الاقوامی شہرت کے حامل دانشور اور قلمکار کے طور پر اُن کی پذیرائی کے لئے اعزازیہ محافل کا انعقاد بھی انھیں کا ذمہ ٹھہرتا ہے:

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے   ناطقہ سر بگریباں کو اسے کیا کہئے

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۴ء)

مافیا

زیر نظر اداریہ کا عنوان (مافیا) اطالوی زبان کا لفظ ہے جو لغوی حیثیت بھی رکھتا ہے اور تلمیحی پس منظر کا بھی حامل ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق مافیا ’’مجرموں کا بین الاقوامی گروہ اصلاً سسلی سے تعلق رکھنے والا، اب اٹلی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی موجود ۲۔ خفیہ طور پر اثر ورسوخ اور دباؤ سے کام لینے والا گروہ۔ لفظاً دھونس دینے والا‘‘ کم وبیش یہی مفہوم ومعنی کئی دیگر لغات میں دیئے گئے ہیں۔ البتہ بہ اعتبار ہجے یہ لفظ 'Mafia' اور 'Maffia' دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں میں اس لفظ نے اس انداز سے عالمگیریت کا مقام ومرتبہ حاصل کیا کہ دنیا کی متعدد زبانوں نے اس لفظ کو اپنا لیا۔ چنانچہ اردو میں بھی یہ لفظ بعینہٖ منتقل ہو گیا اور اس کا استعمال زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے بکثرت ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجوہ میں اصول و قانون اور اخلاقیات پر بے اصولی، لاقانونیت اور ذاتی مفادات کو فوقیت دینا سب سے واضح انداز میں سامنے آیا۔ یہ عمل اس برق رفتاری سے آگے بڑھا کہ اس عفریت سے زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا بالخصوص ادب اور سیاست وصحافت میں مافیا کی اثر پذیری نے حالات کو اور بھی دگرگوں کر دیا۔ سیاست میں ایک مستقل بحران نے جنم لیا جو وطنِ عزیز کے رگ وپے میں پیوست ہو کر رہ گیا اور ایک طاقتور مافیا نے جمہوریت کے نام پر رائے عامہ کو یرغمال بنا لیا جس کے منحوس اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں مرتب ہوئے بلکہ ملک میں ہر سطح کی انتظامیہ کو بددیانتی اور نااہلیت کا زہر پلا کر مستقلاً مفلوج کر دیا گیا اور ملکی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئی۔

ادب وصحافت کا یہ اعزاز کہ اس نے آزادی کی تحریک کو اپنی جملہ توانائیوں کو بروئے کار لا کر پروان چڑھایا۔ حصولِ آزادی کے کچھ عرصہ بعد ہی سے دھندلانا شروع ہو گیا اور اب عالم یہ ہے کہ یہ دونوں شعبے بھی اجارہ داریوں کے زندانی بن کر رہ گئے ہیں۔ ’’پرورشِ لوح وقلم‘‘ کا عہد (Commitment) ہماری ادبی وشعری تاریخ کا نقطۂ عروج تھا جسے ایک عظیم انسان اور عظیم شاعر نے اس طرح نبھایا کہ حیدرآباد جیل سے ایک آواز بلند ہوئی:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے   کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

* * *

لیکن فیض کے فکر و فن کی عظمت کو خراج تحسین پیش کرنے میں یہ معاشرہ کماحقہٗ، اپنا فرض ادا نہیں کر سکا اور نئی نسل بہ استثنائے چند اقبال کے بعد اُفقِ ملّی پر طلوع ہونے والے اس کوکبِ درخشاں سے اکتسابِ نور نہ کر سکی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بعض تملق پرست حاشیہ نشینوں نے ان کے انداز و اُسلوب پر شبِ خون مارنے کی منافقانہ جسارت کی لیکن بقول کسے جو زندگی بھر کوشش کے باوجود سگریٹ سے خاک جھٹکنے کا فیض جیسا سلیقہ نہ اپنا سکے۔ وہ فیض کے فکر و فن کی نقالی کیا کرتے! ان پست قامتوں نے اپنا قد کاٹھ بڑھانے کے لئے سیاسی بیساکھیوں کا ضمیر فروشانہ استعمال کیا اور میڈیا کے استحصال کے ہنر میں خود کو طاق بنا لیا۔ یہ جب کبھی خود پر گھیرا تنگ ہوتا دیکھتے تو وطن سے راہ فرار اختیار کرتے اور دیارِ غیر میں سیاسی پناہیں مانگتے۔ یہی نہیں بلکہ خود کو باغیانہ شاعری کا نقیب بنا کر پیش کرتے بلکہ دشمن ملک کے سامعین و ناظرین سے وطن مخالف ہرزہ سرائیوں پر داد و تحسین حاصل کرتے حالانکہ افلاسِ فکر و فن کے مارے ہوئے یہ دریوزہ گر نام نہاد شاعر سطحیٔ جذباتیت سے بڑھ کر نوجوان نسل کو کچھ نہ دے سکے۔ انہوں نے سیاست، صحافت اور ادب کا ایک مکروہ اور قبیح امتزاج پیدا کیا جس میں ایک موثر ترین مافیا کے تمام وصف مجتمع ہو گئے چنانچہ اس مافیا نے جب چاہا حُب وطن کا روپ دھارا اور جب چاہا بغاوت کا علم بلند کیا اور ہر اُس آستان پر سرِ تسلیم خم کیا جہاں ان کے کاسۂ گدائی کو ذاتی مفادات کی بھیک میسّر آ سکتی تھی:

نیلام جو ناموسِ قلم کرتے رہیں گے   سر ہونگے فرازان کے جو خم کرتے رہیں گے

* * *

اہلِ قلم اور اہلِ ہنر ملک و ملت کا سرمایہ ہی نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار کے ترجمان کی حیثیت سے تکریم و تحسین کے بھی مستحق ہوتے ہیں چنانچہ وطنِ عزیز میں حکومتی سطح پر ہر سال اعتراف علم و فن کے طور پر ''عطائے اعزازات'' کا اہتمام کرنا یقیناً ایک مبارک روایت ہے جس کو ایک شفاف اور اعتماد آفریں نظامِ کار کے تحت جاری رہنا چاہئے۔ لیکن بد قسمتی سے عملاً ایسا ممکن نہیں ہو سکا اور ہر

سال ۱۴ اگست کو جن ناموں کا اعلان کیا جاتا ہے اور جو ہستیاں ۲۳ مارچ کو صدرِ مملکت کے دستِ مبارک سے حصولِ اعزازات کا شرف حاصل کرتی ہیں ان میں بہت کم تعداد حقیقی استحقاق سے بہرہ مند نظر آتی ہے جبکہ ایک بھاری اکثریت ''بندر بانٹ'' سے مستفیض ہوتی ہے اور وہ کہ جو کہہ سکیں کہ ''مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است'' خال خال فہرستِ اعزاز میں جگہ پاتے ہیں اور ایسے بکثرت نظر آتے ہیں جن کا کہا ہوا ہر مصرعہ ''اُمّ الخبائث'' کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں ''اعزازِ مکرّر'' سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے کہ وہ ''مکرّر ارشاد'' کے شاعرانہ تفاخر کے متمنی رہتے ہیں۔

ادبی مافیا کے یہ لوگ علمی، ادبی اور شعری ''عظمت'' کے پُرفریب خول زیبِ تن کیے اعلیٰ سرکاری مناصب پر بھی قابض نظر آتے ہیں۔ ویسے تو ان کے اس وسیلۂ روزگار پر کسی کو معترض نہیں ہونا چاہیئے کہ ہمارے معاشرے میں اہلیت ولیاقت سے محروم لوگ خاص طور پر سرکاری وسائل معاش کے لئے اہل گردانے جاتے ہیں کہ ملازمتوں کے عقبی دروازے یا رشوت وسفارش کی بیساکھیاں انہیں ہمیشہ میسر رہتی ہیں تاہم یہ سب کچھ ایک غیر شفاف طریقِ انتخاب کا شاخسانہ ہے حالانکہ ملکی آئین کے تحت جب پبلک سروس کمیشن جیسے ادارے موجود ہوں تو یہ بات ہرگز قرینِ انصاف نہیں کہ دیگر اہل شہریوں کو عام مقابلہ کے معروف ومروّج مواقع سے محروم کر دیا جائے اور دباؤ یا سفارش کی بنیاد پر پسندیدہ لوگوں کو ایسے قومی سطح کے اداروں کا سربراہ بنا دیا جائے جنہیں وہ ذاتی مقاصد کی ترویج کے لئے استعمال کریں جبکہ یہ عین ممکن ہو سکتا ہے کہ ان سے کہیں بہتر اور باصلاحیت لوگ دستیاب ہوں۔ ماضیٔ قریب کے تناظر میں ایسی علمی و ادبی قدآور شخصیات کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے دل ودماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ کسی ایسے رتبہ پر فائز ہوں جس پر دوسروں کو مقابلے کا موقع نہ دیا گیا ہو۔ اس ضمن میں ممتاز حسن، شیخ محمد اکرام، قدرت اللہ شہاب اور مختار مسعود جیسی ذہین وزیرک اور صاحبانِ علم وحکمت شخصیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے تو پھر کیوں اس دور میں ایک صریح ظلم وناانصافی کا مسلسل ارتکاب کیا جا رہا ہے اور وہ بھی پوری دیدہ دلیری کے ساتھ؟

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء)

’ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا‘

قانون وانصاف کی حکمرانی ہر مہذب معاشرہ کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ یہ وصف جہاں افراد معاشرہ کو عزت نفس اور احساسِ تحفظ عطا کرتا ہے وہاں ایک ایسی اجتماعی فضا کی تربیت و پرورش کا اہتمام بھی کرتا ہے جس کے نتیجہ میں امکانات ومواقع کی بلا تخصیص وامتیاز دستیابی سے ہر کہہ دمہ یکساں طور پر استفادہ کر سکے۔ چنانچہ ایسے ہی معاشرے انسانی عظمت کے نگہبان دامین بھی ہوتے ہیں اور کارکشا وکارساز بھی۔ وطن عزیز کہ جسے عالمگیر صداقت پر مبنی ایک نظریۂ حیات نے بنیاد فراہم کی ۔ نصف صدی سے بھی متجاوز مدت بیت جانے کے باوجود ایسے معاشرہ کے ابتدائی خدوخال تک ابھارنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ بدقسمتی ہی نہیں ایک دلخراش المیہ بھی ہے۔

آج جب کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم وآویزش کی فضا نے عالمی امن کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے اور طاقت کے عدم توازن نے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ٹھہرادی ہے۔ لازم تھا کہ ہم اپنے طرزِ حیات کو نہ صرف امن وسلامتی کا پاسدار ثابت کرتے بلکہ اپنے معاشرتی رویوں سے اپنے مہذب ومتمدن ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتے۔ ہم حُسنِ ظن رکھتے تھے کہ ہمارا موجودہ نظام حکمرانی جن ارباب بست وکشاد کے اخلاصِ عمل کا رہین منت ہے ان کے اہداف میں انصاف وقانون کی حکمرانی سرفہرست ہے۔ لیکن ایک حالیہ واقعہ نے جو کسی طرح سانحہ سے کم نہیں ہمارے حسن ظن ہی کو نہیں (بلکہ کسی بھی سیاسی اندازِ فکر سے قطع نظر جو ہمارا شعبہ نہیں) ہمارے ایقان واعتماد کو بھی متزلزل کر کے رکھ دیا ہے بالخصوص جب کہ اس تناظر نے اہل قلم کے حوالے سے جنم لیا ہے۔ حکومت کا ادب وفن کے لیے نرم گوشہ اور اہلِ قلم کے لیے عزت وتکریم کا اہتمام یقیناً قابل ستائش سمجھا جانا چاہئے لیکن پذیرائی کا یہ انداز کسی مخصوص شخص کو قانون سے ماورا ٹھہرائے تو انتہائی قابل مذمت بھی ہے ’زیر نظر صورت حال میں متعلقہ وفاقی وزارت کے عمال نے ایک رائج الوقت قانون کا درست اور بلا استثناء استعمال کیا اور پارلیمان کی متعلقہ قائمہ کمیٹی کی ہدایات پر جن کا اپنا

ایک جمہوری تقدس بھی ہے عمل کیا جو کسی بھی سطح کی عدالتِ قانون سے سندِ اعتبار حاصل کر سکتا ہے لیکن بد قسمتی سے سربراہ حکومت نے جنہیں عوام الناس میں اپنے اوصاف حمیدہ کے باعث اعتماد و احترام حاصل ہے محض اس لئے ایک مطلقاً قانونی اقدام کو کالعدم قرار دیدیا کہ اس سے ایک ایسا شخص متاثر ہو رہا تھا جو ادب کے حوالے سے سرکار کا اعزاز یافتہ بھی ہے اور اثر و رسوخ کا حامل بھی۔ چنانچہ قانون وانصاف کی اس بے حُرمتی پر اہل نظر کبیدہ خاطر ہی نہیں بلکہ حیران و ششدر بھی ہیں، جب کہ اسی سانحہ کے مضمرات بے شمار دیگر دادخواہوں کو مایوسی و بے اعتمادی کے آسیب میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ بقول محسن احسان:

وہاں پر ضابطے کی دھجیاں اڑتی ہی رہتی ہیں   جہاں انصاف بکتا ہے جہاں آئیں نہیں رہتا
ذرا سی منصفوں سے آشنائی کی ضرورت ہے   پھر ایسے مجرموں کا جرم بھی سنگیں نہیں رہتا

مستزاد یہ کہ اس عنایت خسروانہ سے نوازا جانے والا شخص خوب جانتا ہے کہ مطلوبہ سرکاری سہولت کے لیے وہ ہرگز کوئی قانونی استحقاق رکھتا ہے نہ جواز بلکہ اس نے ایسی ہی ایک نجی مالکانہ سہولت کو جسے اسے زیر استعمال نہیں آنا چاہیے تھا حصول زر کا ذریعہ بنایا ہوا ہے، یہی نہیں بلکہ چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ گُل بکف قاصدانِ حکومت معذرت خواہی کے لیے پہنچے اور قانون شکنی کو استحقاق قرار دیتے ہوئے قانون کے گریبان کو چاک کرنے والے کی ’’تالیف قلب‘‘ فرمائی۔ حرص وہوس کا یہ سفاکانہ انداز کسی بھی حقیقی فن کار یا اہل قلم کے شایان شان نہیں کہ قلم یا فن تو صداقتوں کا امین ہوتا ہے چنانچہ یہ شرمناک مثال ان بے وسیلہ لوگوں سے نظام عدل پر اعتماد کا آخری حوصلہ بھی چھین سکتی ہے جو قانون پر اثر انداز ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں نہ طاقت۔

ہم اب اپنے اس حُسنِ ظن پر بھی پشیمان ہیں کہ قومی سطح کے مناصب جلیلہ پر جن پر قوم کے ہر مجاز فرد کا یکساں استحقاق ہے ایک شفاف نظام انتخاب کے ذریعہ اہل ترین اشخاص کو متمکن کیا جائے گا کہ کوئی بھی دوسرا طریق امانت میں خیانت کے مترادف ہے لیکن ہم علم وفن اور ادب و دانش کے حوالے سے دیکھتے ہیں کہ ایسے تمام اداروں پر دباؤ اور اثر و رسوخ کے توسط سے اکثر

ایسے ہی لوگ قابض ہیں جو قانون کو موم کی ناک سے زیادہ اہمیت دینے کے روادار نہیں کیا اس انصاف باختہ نظام کو مافیا کی بالادستی سے تعبیر نہیں کیا جائے گا؟ کیا تطہیر و اصلاح کی تمام توقعات اس طرح پیوندِ زمین ہو کر نہیں رہ جائیں گی؟ اگر ہمارے اہلِ قلم اور اہلِ فن جرأت و صداقت پر قادر ہیں اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں تو انہیں اس صورتِ حال کا نوٹس لینا ہوگا۔ کالی بھیڑوں کی نشاندہی کرنا ہوگی طبلہ و سارنگی کے زور پر شاعری کا کاروبار کرنے والوں کو آئینہ دکھانا ہوگا اور میڈیا کے پروردہ مافیا کو بے نقاب کرنا ہوگا ورنہ ہر آنیوالے سال کا ۲۳ مارچ بعض تہی ضمیر سینوں پر اعزازات کے دمکتے نشان آویزاں دیکھے گا جنہیں نہ صرف قانون سے ماورائیت کا لائسنس سمجھا جائے گا بلکہ قومی امانتوں پر بھی اجارہ داری کا وسیلہ بنایا جائے گا۔ (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء)

بین الاقوامی اردو کانفرنس۔۔۔ ’افسوں بھی افسانہ بھی‘

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کو پہلی بار ۹ سے ۱۳ مارچ ۲۰۰۵ء تک بین الاقوامی سطح کی اُردو کانفرنس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کانفرنس جس وسیع پس منظر کے ساتھ منعقد ہوئی وہ تمام تر اُردو زبان کی عظمت و آفاقیت سے مملو نظر آتا ہے۔ یعنی تحریک پاکستان کو توانائی بخشنے اور کامیابی سے ہمکنار کرنے کا منفرد اعزاز رابطہ کی زبان کے طور پر اردو کو حاصل ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے سربراہ مملکت حضرت قائد اعظمؒ نے اردو کو مملکت کی قومی زبان اور دفتری و سرکاری امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں واحد وسیلہ اظہار قرار دیا۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے پنجاب میں اپنی گورنری کے دوران دفتری زبان کے طور پر اردو کے نفاذ کے لیے مجلس زبان دفتری کے قیام کا حکم جاری فرمایا جو آج تک ’بقید حیات‘ ہے اور جس نے دفتری اصطلاحات و محاورات کو اردو میں ترجمہ کرنے کا انقلاب آفریں کام انجام دیا۔ دفتری لفظیات پر مشتمل لغت مرتب کی۔ سرکاری عمال کی تربیت کے لیے ایک مسلسل عمل کا آغاز کیا۔ اردو ٹائپ کار اور مختصر نویس تیار کیے ادھر بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کی قیادت میں اور ان کے بعد اردو زبان و ادب کے فروغ کے ادارے وجود میں آئے جن میں نابغہ روزگار شخصیات کے لسانی و علمی اجتہاد کے نتیجہ میں اردو اُن تمام اوصاف سے مُتصف ہوگئی جو کسی بھی عالمی سطح کی پُروقار زبان کی شناخت ہو سکتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں آیا جس نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی سربراہی کے دوران اور بعد میں آغاز کار سے آج تک ترجمہ و تحقیق اور لغت سازی کے شعبوں میں ٹھوس مواد مہیا کر کے قومی زبان کے طور پر اردو کے ہمہ گیر استعمال اور دفتری و سرکاری زبان کی حیثیت سے ہر حجت تمام کر دی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۸۳ء میں اپنے قیام سے ابتک وفاقی حکومت کے تقریباً ساڑے چار ہزار افسروں کو اردو میں دفتری امور انجام دینے کی تربیت مہیا کر چکی ہے۔ جامعہ عثمانیہ (دکن) میں ہر نوع کے تعلیمی نصاب پر اردو کی مکمل گرفت اور سابق ریاست

بہاولپور میں جو اب وطن عزیز کا ایک گراں مایہ حصہ ہے اردو کے دفتری زبان کی حیثیت سے متعلق بیشتر مواد آج بھی محفوظ ہے بلوچستان میں دفتری زبان کے طور پر اردو کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا بلکہ کانفرنس کے دوران ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے تو بلوچستان میں اردو کے آغاز و ارتقاء پر نہایت مدلّل گفتگو کی۔ اور اب صوبہ سرحد کی حکومت بھی دفتری امور کو اردو میں انجام دینے کے کام کا آغاز کر چکی ہے۔ ان عوامل کے ساتھ ساتھ ملک کے آئین (۱۹۷۳ء) میں واضح کیا گیا کہ آئندہ پندرہ سال کی مدت میں یعنی ۱۹۸۸ء تک قومی زبان اردو کو جملہ دفتری امور کی انجام دہی اور سرکاری مراسلت نیز ہر سطح پر اظہار خیال کا ذریعہ بنا دیا جائے گا۔

اس رجائیت پرور پس منظر کے ساتھ کانفرنس کے متعینہ مقاصد میں اردو کے نفاذ کو اولیت دینا بلکہ نصب العین قرار دینا متوقع تھا کہ ملک کا آئین تک جو کسی بھی مہذب معاشرہ میں تقدس و احترام کا مستوجب سمجھا جاتا ہے اس امر کی ضمانت دے چکا ہے۔ بلکہ نفاذ اردو کی حد آخر یعنی ۱۹۸۸ء کو گزرے بھی کم و بیش سترہ سال ہو چکے ہیں لیکن کانفرنس کے اختتام پر جاری ہونے والے ۱۷ نکاتی اعلامیہ میں ایسے کسی بھی قطعی مطالبہ سے افسوسناک اغماض برتا گیا، کانفرنس کی مجلس انتظامیہ کی ایک خاتون رکن نے یہ جواز پیش فرمایا کہ یہ داخلی یا مقامی نوعیت کا معاملہ تھا جسے بین الاقوامی سطح پر زیر بحث لانا مناسب نہ تھا۔ بصیرت و حکمت کے فقدان کی اس سے کم مایہ مثال اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہی تو ایک نادر موقع اور تاریخ ساز لمحہ تھا جب پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد پرستارانِ اُردو کے بین الاقوامی اجتماع کا محور و مرکز بنا ہوا تھا اور جس میں بھارت، موریشس، جاپان، روس، برطانیہ، امریکہ اور چین سے مندوبین اور وفود شریک تھے۔ ان میں ساہتہ اکادمی بھارت کے سربراہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سارک رائٹرز کانفرنس کے انڈین چیپٹر کی چیئر پرسن اجیت کور، بھارت ہی کے ممتاز دانشور اور مبلغ اردو شمس الرحمٰن فاروقی، لندن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر نشین ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، جرمنی کی پروفیسر ڈاکٹر کرسٹینا، جاپانی دانشور محقق سونومی سویامنی اور روس کی معروف اردو سکالر نیز فیض احمد فیض مرحوم کے فکر و فن کی ماہر و مبلغ لڈمیلا ویسانو داجیسی اردو پرست و اردو نواز شخصیات کی تائید و حمایت سے (جس میں کسی بھی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی)

پاکستان میں اردو کے نفاذ کو یقینی بنایا جاسکتا تھا اور عالمی احترام وشہرت کی حامل ان ہستیوں کے واضح اعلانات سے اخلاص وذہانت پر مبنی منصوبہ بندی کر کے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا کہ ''اردو سرحدوں کو نہیں مانتی'' (ڈاکٹر نارنگ) وہ دنیا کی چوتھی (ڈاکٹر میتھیوز) اور ایشیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان (اجیت کور) ہے نیز اردو کی ہئیت وترکیب اس کے زندۂ جاوید ہونے کا ثبوت ہے بلکہ ڈاکٹر نارنگ نے تو اردو کو 'تاج محل' قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا کہ ''اردو ایک اندازِ نظر، جینے کا سلیقہ اور اُسلوب زیست ہے'' جاپان کے مندوب کا یہ اعلان کہ ان کے ملک میں تقریباً ایک صدی سے اردو کی تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور جاپان کی ترقی اپنی قومی زبان ہی کو ذریعہ تدریس بنانے کی مرہونِ منت ہے'' ہمارے خفتہ ضمیروں کو جھنجھوڑنے اور ہماری قومی غیرت کو بیدار کرنے کا سبب بننا چاہئے تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ ہماری بساط سیاست کے وہ خود ساختہ مہرے جنھیں سوائے نفاذ اردو کے آئین کا ہر نکتہ ازبر ہے اس طرف بھی ازرہ مروّت توجہ دے سکتے اور اس طرح ہمارے قومی تشخص کی شیرازہ بندی ہو سکتی تھی۔

اس مجرمانہ تغافل کا ذمہ دار کون ہے؟ اس ضمن میں قومی میڈیا میں بھرپور ردعمل کا اظہار کیا جاچکا ہے کہ کس طرح چند افراد نے اس کانفرنس کو اپنی پسند و ناپسند اور ذاتی مقاصد کے حصول کے تابع بنالیا تھا۔ ابتداً تاثر دیا گیا تھا کہ کانفرنس کے افتتاح واختتام کے اجلاسوں کی صدارت صدر محترم اور وزیراعظم خود بہ نفس نفیس فرمائیں گے لیکن سعی بسیار کے باوجود منتظمین کو صرف ایک وزیر مملکت میسر آسکے جو حسب روایت خطابت کے جوہر دکھا کر چلے گئے۔ کانفرنس میں اظہار خیال کے جو پہلو سامنے آئے وہ اس امر کی واضح غمازی کر رہے تھے کی اردو زبان کی آغوش تربیت میں تہذیب وثقافت اور آداب معاشرت کے جو رجحانات پرورش پاتے رہے ہیں ان کے واضح تشخص کو بین المملکتی خیرسگالی کے نام پر مسخ کیا جائے اور جس طرح ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط نے اردو زبان وتہذیب کا حلیہ بگاڑ دیا ہے ویسا ہی ایک عمل پاکستان میں دہرایا جائے۔ کانفرنس کے دوران ہی اخبارات میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ بھارت کی ساہتیہ اکادمی اور پاکستان میں ورلڈ پنجابی کانفرنس کے سربراہوں کے درمیان معاہدہ کے تحت ایک مشترکہ کمیشن نصابی کتب

کی تدوین کا کام انجام دے گا۔ انگریزی زبان سے اردو کو عالمی سطح پر لاحق خطرات کا ذکر کیا گیا جب کہ کانفرنس کے موسسین میں ایک ایسا ٹی وی چینل بھی شامل تھا۔ جس کے پروگراموں میں انگریزی الفاظ اور جملوں کی بھرمار سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ پروگرام کی زبان اردو ہے یا انگریزی؟ نجی شعبہ کا ایک ادارہ ”گریپ وائن“ کے نام سے کانفرنس کی انتظامیہ پر قابض رہا تا کہ ”ستارہ شکنی کے ذریعہ آفتاب سازی“ کے مفادات حاصل کر سکے۔

مغاں ز دانۂ ، انگور آب می سازند　　ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

یہی نہیں بلکہ جہل و بے ہنری کے وہ مظاہر سامنے آئے جنہوں نے کانفرنس میں شریک اکثر صاحبان علم کی طبیعتوں کو مکدّر کر دیا۔ کانفرنس کے پروگراموں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ادب اور مشاہیر ادب کے بارے میں جو کتابچہ نما دعوت نامہ جاری کیا گیا وہ نہ صرف جہل گزیدہ بلکہ علم باختہ طرز نگارش کا مرقع تھا۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۱۔ ”کروڑہا نفوس“ (کروڑ ہا بنا کر فارسی دانی کا مظاہرہ کیا گیا)

۲۔ ”مطمع خیال ونظر“ (مطمح کی جگہ مطمع کا استعمال صاحب تحریر کی علمی بے بضاعتی کو ظاہر کر رہا ہے)

۳۔ ”بغاوتوں سے گُلبلا اٹھا“ (محاورہ سے بے خبری نے بلبلا کی جگہ گُلبلا لکھوا دیا)

۴۔ ”قطب شاہ ولی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں“ (اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا نام قطب شاہ ولی نہیں بلکہ سلطان قلی قطب شاہ تھا)

۵۔ ”جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی“ جامعہ اور یونیورسٹی میں صاحب تحریر یقیناً ایک کے معنی سے نابلد ہیں)

۶۔ ”بزم گاہ“ (گویا صاحب تحریر کے نزدیک ”مقتل گاہ“ بھی درست ہوگا)

۷۔ ”چمن آرائی سے سجائی گئی“ (چمن آرائی اور سجائی۔ سبحان اللہ!)

۸۔ ”مرثیے کی پُر اثر ترین خاصیت سے“ (موثر ترین کے بجائے پُر اثر ترین کہہ کر اردو زبان کو نوازا گیا ہے)

۹۔ ”نابغہ روزگار ڈرامے“ گویا ڈرامے بھی شخصیات ہوئے کہ نابغۂ روزگار ٹھہرے)

۱۰۔ ”محفل رقص وسماں“ (سماع کو سماں لکھنے پر اناللہ وانا الیہ راجعون ہی کہا جا سکتا ہے)

۱۱۔ ”تہذیبی کھانوں کا اہتمام“ (صاحب تحریر نے کھانوں کی ایک نئی قسم دریافت کی ہے)

۱۲۔ ”خسرو کی دائمی اور پکی حیثیت میرے گھر میں برقرار رہی اور یہ فقط مجھ ہی پر ’منتج‘ نہیں برصغیر پاک وہند میں ایسے ان گنت گھرانے آباد ہیں“ (اس بے سروپا عبارت میں خدا معلوم ”منتج“ کے کیا معنی صاحب تحریر کے ذہن میں ہیں۔

۱۳۔ ”نازک اندام پیکر“ (مترادف المعنی الفاظ، ’اندام اور پیکر‘ سے بے خبری جہالت کی انتہا ہے۔)

الامان والحفیظ ! یہ تو صرف چند نمونے ہیں دعوت نامہ اور بھی مضحکہ خیز الفاظ اور طفلانہ طرز تحریر سے داغ داغ نظر آتا ہے۔ کیا یہ بین الاقوامی سطح کے علمی اجتماع کی بدترین توہین نہیں؟ کیا یہ پاکستان اور پاکستان کے اہل قلم کی رسوائی اور بے توقیری کا باعث نہیں؟ بالخصوص جب کہ وفاقی سطح کے تین علمی ادبی اور لسانی عظمت کے نگہبان نام نہاد ادارے اکادمی ادبیات پاکستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن اور مقتدرہ قومی زبان کانفرنس کے داعیوں میں شامل ہیں یہی نہیں بلکہ ان اداروں میں سے ایک کے سربراہ کی تصویر اس ”عجوبہ روزگار“ دعوت نامہ کی زینت ہے اور وہ بھی اس طرح کی اقبال وفیض کے درمیان۔ اس جسارت برہم کوئی بھی تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں کہ جوش، حفیظ اور فراق کے علاوہ اردو غزل کے عناصر اربعہ اصغر جگر حسرت اور فانی کی روحوں کو ہم مزید مضطرب کرنا نہیں چاہتے۔ دعوت نامہ میں مرحوم مشاہیر ادب میں پہلا ہی نام غلط املاء کا شکار ہو گیا ہے۔ یعنی مسعود سعد سلمان لاہوری (۴۳۸ھ تا ۵۱۵ھ) کو مسعود سد سلمان لکھا گیا ہے اور محترمہ قرۃ العین

حیدر کو زندہ و سلامت ہونے کے باوجود اس فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

قومی ذرائع ابلاغ نے جس برملا انداز میں کانفرنس کے ناقص، انتظامات اور پروگراموں پر تنقید کی ہے وہ چشم کشا بھی ہے اور باعث عبرت بھی۔ انتہا تو یہ ہے کہ چند دن قبل اکادمی ادبیات جس مقامی شاعر کو اس کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں علامہ اقبال ایوارڈ عطا کر چکی ہے اسے مشاعرہ میں مدعو کیے جانے کا اہل نہیں سمجھا گیا جب کہ خود اکادمی کے سربراہ رونق محفل تھے۔ ایک اور سربراہ ادارہ نے ایک نشست کی صدارت فرمائی اور اپنے ایک ہم عصر اور کانفرنس میں رفیق کار کے بارے میں جو فیصلہ صادر فرمایا (حاجی و ملّا کی ستائشِ باہمی کا بے محل انداز) اس کی طرف موقر انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کی ایک تازہ اشاعت میں جناب انتظار حسین نے جو خود بھی کانفرنس کی نشستوں میں شریک رہے نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔

> " In his presidential address, he paid glowing tributes to Ghalib, Iqbal, Faiz and saved some of his adulatory comments for a fourth poet whose name he was going to announce later. He assertively announced that after Ghalib, Iqbal and Faiz, the fourth spoch making poet was Ahmad Faraz. The poets present at the occasion appeared to be disturbed by this announcement"

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے　　ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اردو کانفرنس بین الاقوامی سہی لیکن کیا واقعی اسے قومی ہونے کا بھی اعزاز حاصل تھا جب کہ اندرونِ ملک سے ایسی مستند و نابغہ اور بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیات کانفرنس کی عقبی نشستوں پر بھی نظر نہ آئیں جو پاکستان کی پہچان اور پاکستان جن کا سرمایۂ افتخار رہے۔ ان ہستیوں میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا جمیل الدین عالی، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر خیال امروہوی، عبدالعزیز خالد، ادا جعفری،

ثاقبہ رحیم الدین، حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی جیسے نام بھی شامل ہیں۔

کسی پہ بند کرے در، کسی پہ باز کرے   جو آئے جی میں تو پستی کو بھی فراز کرے
”خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے“

(اپریل۔ جون ۲۰۰۵ء)

اہلِ قلم اور ذرائع ابلاغ

ذرائع ابلاغ نہ صرف تشہیر وترسیل بلکہ علم وادب کے فروغ وارتقا میں ہمیشہ سے بنیادی کردار کے حامل رہے ہیں۔ قرطاس وقلم اور لفظ ومعنی کے ربطِ باہم نے جب بھی تخلیق کا روپ دھارا ابلاغ کے ذرائع نے اسے تمام ممکنہ جہتوں کے ساتھ امانت کے طور پر تاریخ کی تحویل میں دے دیا' یہ امانت عہد بعہد تلاش وتحقیق کے ایک مسلسل عمل کے ذریعہ تشنگانِ علم وادب کو سیراب کرتی رہی اور اس طرح روشنی کا یہ سفر عصرِ رواں کو بھی اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھ رہا ہے، البتہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اقدار میں شکست وریخت کا ایک خاموش عمل زہراب کی مانند اہل قلم کے رگِ وپے میں بھی پیوست ہوتا جارہا ہے اور تخلیقات کا معیار مستثنیات سے قطع نظر رُوبہ انحطاط ہے۔

اسباب وعلل کی جستجو ہمیں ماضی قریب سے ماضی بعید تک لے جاتی ہے چنانچہ تاریخی سیاق وسباق کے ساتھ اک منظر نامہ ذہن میں اُبھرتا ہے جس کے مطابق علوم وفنون اور شعروادب میں عظیم وقدآور شخصیات سے ماضی کے ادوار جلوہ بار نظر آتے ہیں۔ تخلیق واختراع کا معیار ایسا کہ آنے والے ہر عہد کے لیے نمونۂ کمال! لیکن پرانے چراغوں سے جب نئے چراغ روشن ہوئے تو وہ ماحول کو اس قدر منور ومستنیر نہ کر سکے جیسا کہ ان کے پیش رو کر گئے تھے۔ یہی نہیں کہ غالب واقبال کے پائے کے لوگ دوبارہ منصّۂ شہود پر نہ آسکے بلکہ جوش، فیض اور فراق جیسی ہستیوں کے نعم البدل تو کیا ان کے فکروفن سے قریب تر وارثان کم سواد بھی پیدا نہیں ہوسکے تقسیم برصغیر کے بعد یہ عمل تیزی سے اپنی بساط بچھاتا گیا اور تہذیب ومعاشرت کی اقدار میں تنزل وانتشار کے ساتھ شعروادب کے تخلیق کاروں کے رویے تبدیل ہوتے گئے اس تبدیلی کا اولین سبب یہ تھا کہ دنیا علم وحکمت کے دور سے نکل کر مادّیت کی طرف سفر کا آغاز کر چکی تھی دوسری طرف نظام تعلیم ان تبدیلیوں کے بتدریج تابع ہوتا چلا گیا اور مسند افتخار حصول علم سے حصول زر کو منتقل ہوگئی دوسرا بڑا

سبب ذرائع ابلاغ میں آنے والا سریع الحرکت انقلاب ثابت ہوا جس کی طنابیں عہد امروز کے ہر شعبہ زندگی میں پیوست ہوچکی ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ ایک ناگزیر عمرانی ومعاشرتی عمل سے کس طرح متصادم ہونے کی راہیں تراشی جائیں بلکہ لمحۂ فکریہ اگر ہے تو یہ کہ ٹیکنالوجی اور سائنسی عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے اُس کردار کو کس طرح زندہ ومحفوظ رکھا جائے جو افراد اور معاشروں کی تہذیب نفس کرتا ہے اس ضمن میں ذرائع ابلاغ خصوصاً الیکٹرونک میڈیا موثر ثابت ہوسکتا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ خود ایسی تند وتیز ہواؤں کی زد پر ہے کہ کسی بھی سمت کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔

اخبارات ریڈیو اور ٹیلیوژن صرف کثیر الجہت ہی نہیں ہوچکے ہیں بلکہ تحریص وترغیب کا منبع و محور بھی بن چکے ہیں جس کے نتیجہ میں ہمارے دانشور طبقے یا بالخصوص اہل قلم کا اس سحر سامری کی گرفت میں آجانا اس لیے ایک المیہ ہے کہ نہ تو علوم کی جانب سنجیدہ رویے فروغ پا رہے ہیں اور نہ ادب میں زِہرہ گداز سعی وکاوش کا وہ ماحول پنپتا نظر آتا ہے جو ہمارے بیشتر اہل فکر ودانش کا نشان امتیاز تھا اس کی جگہ ایک ہمہ گیر سطحیت کارفرما نظر آتی ہے جو اُس حلقۂ مستثنیات کو بھی محدود سے محدود تر کرتی چلی جارہی ہے جو آج بھی ظلمت گزیدہ فضا میں روشنی کی ایک نحیف کرن بن کر زندہ ہے اس دور کے اختصاص یافتہ فن کار وہ ہیں جو میڈیا پر مسلط ہیں یا میڈیا کی اُس تحریص و ترغیب کا صیدِ زبوں بن چکے ہیں جس کے تقاضے ہی یہ ہیں کہ اخبارات کو جواہر پاروں اور خذف ریزوں میں امتیاز کیے بغیر صفحات کی شکم پُری کے لیے کسی بھی نوع کا مواد میسر آجائے نتیجہ یہ ہے کہ ہر کس و ناکس کو اہلِ قلم ہونے کا دعویٰ ہے اور رطب و یابس ہی نہیں بلکہ مہملات سے روزناموں کے نام نہاد ادبی صفحات بھرے ہوتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ لکھنے والوں کو گوشۂ گمنامی سے تصاویر کے ذریعہ کوچۂ رسوائی تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ردِّ عمل کے طور پر کم علم وکج فہم نوواردان بساطِ ادب کی ایک بہت بڑی تعداد سہل الحصول تشہیر کے اس نظام سے وابستہ ہوجاتی ہے اور یہی نہیں صاحب دیوان بن جانے کا خبط بھی ان نوواردانِ حواس باختہ کے اذہان پر مسلط ہوجاتا ہے ہر روز دواوینِ نظم وغزل منظرِ عام پر آتے ہیں۔ تقاریب رونمائی منعقد ہوتی ہیں بعض پیشہ ور مقررین اور

فلیپ نگاران مطبوعات کا مطالعہ کئے بغیر تقریر وتحریر کے جادو جگاتے ہیں ظاہر ہے کہ ثقہ اہل فکرودانش کبیدہ وآزردہ ہوکر گوشہ نشینی ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔

یہی حال ریڈیو اور اس سے کہیں زیادہ ٹیلی ویژن کا ہے جو صوت وآہنگ کی مرصع کاری اور عکس وتصویر کی نظر افروزی کے جال اس حد تک دراز و بسیط کر چکے ہیں کہ اکثر سنجیدہ اہل قلم کو بھی اس دام تشہیر میں گرفتار دیکھا گیا ہے جو ہر قیمت پر الیکٹرانک میڈیا کے ثمرات سے بہرہ مند رہنا چاہتے ہیں اور اس اندازِ نمائش کو باعث افتخار سمجھتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کا یہ عمل جہاں ان کی عزت نفس کو مجروح کرتا ہے وہاں ادب کی اقدار بھی ہیجان وخلفشار کا شکار ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس صورت حال کا تشویشناک پہلو یہ ہے کہ میڈیا کے اس سیلاب میں جو خس وخاشاک بہہ کر آئے ہیں انہیں کو مقتدرانِ وقت نے اس عہد کا نمائندہ سمجھ لیا ہے اور انہیں کمالِ فن کے منصب پر فائز کر کے اعزازاتِ فاخرہ سے بھی نوازا گیا ہے۔ نقد وتجزیہ کے فرائض انجام دینے والوں سے سرزد ہونے والی کوئی بھی کوتاہی مستقبل کے مورخ کو اعصاب شکن تشکیک میں مبتلا کر سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ایک سنگین لمحۂ فکریہ ہے سب اہل فکرودانش کے لیے اور اُن اداروں کے لیے جن کو ادب کی اجارہ داری سونپی گئی ہے کہ زوال وانحطاط کا یہ بے لگام طوفان کیونکر زنجیر کیا جاسکتا ہے۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۵ء)

عالم کی موت

آسمان زیادہ سفاک ہے کہ زمین۔ یہ بحث بنی نوع انسان کے حوالہ سے اردو اور فارسی ادب میں بالخصوص ایک مستقل روایت بن گئی ہے۔ انسان کی ہر ابتلا کو فلک ستم پیشہ سے منسوب کیا جاتا رہا ہے اور زمین کو مہتّم گردانا جاتا رہا ہے کہ بے شمار گردوں مآب ہستیاں پیوند خاک ہوتی رہی ہیں یعنی

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

غالب نے تو خاک کو 'لیئم' کہہ کر اُس شدید ترین ذہنی کرب کا اظہار کیا ہے جو نابغۂ روزگار ہستیوں کے اُٹھ جانے سے انسانی معاشرہ کا مقدر بنتا رہا ہے۔ لفظ لیئم ایک ایسے کردار کی نشاں دہی کرتا ہے جو کسی نعمت سے نہ خود بہرہ مند ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو ہونے دیتا ہے چنانچہ خاک سے غالب کا یہ استفسار بجا ہے کہ "تو نے وہ گنجِ گراں مایہ کیا کئے" جو زمین کی تہوں میں کبھی نہ واپس لوٹنے کے لیے روپوش ہو چکے ہیں چنانچہ ایسا ہی ایک گنجِ گراں مایہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء کی ایک ستمگر ساعت میں زمین کی آغوشِ ابد میں آسودۂ خواب ہو گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں کا سانحۂ رحلت اردو زبان و ادب میں ایک عہد کے اختتام کا مظہر سہی لیکن ان کی ضیا بار شخصیت اور خرد افروز ورثۂ علمی کا فیضان ایسے ان گنت چراغ روشن کر گیا ہے جن سے علم و ادب کے آفاق منور و مستنیر ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو یہ اختصاص حاصل تھا کہ آپ نے دنیا میں غالبًا سب سے زیادہ ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات کی نگرانی فرمائی۔ چنانچہ جنوبی ایشیا (پاکستان۔ بھارت اور بنگلہ دیش) میں اردو اور فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز حاصل کرنے والے حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو یا تو براہ راست ڈاکٹر صاحب کے تلامذۂ ارشد میں شامل ہیں یا مرحوم ان کے مقالات کے نگران و ممتحن رہے ہیں اس حقیقت کے ثبوت میں جن

مُفتخر بذّات شخصیات کی نشاں دہی کی جاسکتی ہے ان میں دیگر کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ڈاکٹر الیاس عشقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مرحومین میں ابنِ انشاء، ڈاکٹر وفا راشدی اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن جیسے اکابر ادب نمایاں ہیں جو ایک عظیم ادبی ورثہ نسل نو کے حوالے کر گئے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ عددی اعتبار ہے ترجمہ اور تصنیف و تالیف پر مشتمل کتب کا اعزاز پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ کے معاصرین اور خود قبلہ ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ کو ان کی کم و بیش یک صد کتب سے بھی متجاوز کتب منصۂ شہود پر لانے کی صورت میں حاصل ہو لیکن موضوعات اور تخلیقی و تحقیقی انفرادیت کے اعتبار سے موصوف کی متعدد کتب کو ہماری ادبی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۴۷ء میں مشہور فارسی شاعر حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ) پر اپنے تحقیقی مقالہ پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ حاصل کیا لیکن ۱۹۵۶ء میں موصوف کو جن تین تحقیقی کتب پر ناگپور یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا ان میں آپ کا چونکا دینے والا مقالہ ”فارسی پر اردو کا اثر“ بھی شامل تھا کہ اس سے قبل اور تا حال کوئی سکالر اس قدر زہرہ گداز موضوع پر تحقیق کی علمی جسارت نہیں کر سکا، ڈاکٹر صاحب کی مترجمہ اور مولفہ و مصنفہ کتب میں جو انگریزی اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں ہیں بعض نہایت اہم موضوعات پر تحقیقی نگارشات شامل ہیں جنہوں نے ہمارے ادب کو گنجینۂ معارف بنا دیا ہے ان میں متعدد دیگر کے علاوہ ”اقبال اور قرآن“۔ ”معارفِ اقبال“ اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات“ اور ”مطالب القرآن“ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

قبلہ ڈاکٹر صاحب نو دہائیوں سے متجاوز اپنی شائستۂ مقاصد عمر عزیز میں کثیر الجہت شخصیت کے حوالے سے جانے اور پہچانے گئے وہ دیگر اوصاف حمیدہ کے علاوہ تقویٰ و علم کا ایک منکسر الذات اور دلنواز سراپا تھے چنانچہ عربی زبان کا وہ محاورہ کہ ”موت العالِم موت العالَم“ ان کے سانحۂ رحلت کا عنوان بن گیا ہے وہ ایک سر برآوردہ محقق اور علمی شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک برگزیدہ و باطن افروز بزرگ بھی تھے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے۔

''کہ سالک بے خبر نبود ز رسم و راہ منزل ہا''

وہ منبع رُشد و ہدایت ہی نہیں سر چشمۂ محبت و اخوت بھی تھے جس نے برصغیر میں ان کے حلقہ ارادت و عقیدت کو بیکراں وسعتوں سے ہمکنار کیا بلکہ تزکیۂ نفس اور تطہیر روحانی کے جذبوں کو فروغ بخشا وہ مدّت العمر تک جامعہ سندھ سے وابستہ رہے، چنانچہ حیدر آباد ان کے علمی و روحانی فیوض و برکات سے بہرہ مند رہا اور ان کی عملی زندگی ہر نوع کے تعصّبات سے ماورا ہر طبقۂ فکر و نظر کے لیے واجب التعظیم ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تقلید بنی رہی۔ اردو اور سندھی لسانیات کی تفہیم کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے مرتب کردہ لغات ''اردو سندھی لغت'' اور ''سندھی اردو لغت'' ان دونوں عظیم المرتبت زبانوں کے فروغ و ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ایک عظیم ورثہ چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن رہگزار وقت پر ان کے نقوش پا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو چکے ہیں موت کے سفاک ہاتھ ان کے جسد خاکی کو اپنی آہنی گرفت میں لے چکے ہیں لیکن ان کا روحانی اور علمی ورثہ لازوال ہے جس کے آگے موت بھی اپنی شکست تسلیم کر چکی ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۵ء)

’کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار‘

حادثات ارضی ہوں کہ سماوی، انفرادی ہوں یا اجتماعی، بنی نوع انسان کی ہمت و طاقت، حکمت و دانش اور تفکر و تدبر کے لیے چیلنج بن جاتے ہیں آئین فطرت امتحان و آزمائش کے ذریعہ اُس شاہکار ازل کی صلاحیتوں کو میزانِ شب و روز میں تولتا رہتا ہے جسے اشرف المخلوقات ٹھہرایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی تضادات سے عبارت ہے اور تغیر کائنات کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں   ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

چنانچہ اس نظام قہر و مہر میں رب ارض و سما کا جو فلسفہ کارفرما ہے اُس کا جواز زندگی کے ہر شعبہ کے عمل ارتقا سے فراہم ہوتا ہے جس نے آج انسان کو خلا کے دور میں پہنچا دیا ہے اور حیرت انگیز و کثیر الجہت اختراعات کا ایک ایک نقش تاریخ کی پیشانی پر ثبت کر دیا ہے۔ حوادث کسی بھی نوع کے ہوں زندگی کی قوتِ پنہاں کو مہمیز کرنے کا سبب بنتے رہتے ہیں۔ وطنِ عزیز کی تاریخ کا خوفناک ترین زلزلہ جس نے ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی صبح کو صبح بے نور بنا کر رکھ دیا اسے اپنی بے پناہی کے اعتبار سے عالمی سطح کے ان سانحات میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ دیواروں کی جگہ در اور دروں کی جگہ دیواریں قائم ہو جانا غالب کی فکر کا شعری مبالغہ سہی لیکن ہمارے لیے آج یہ ایک دلگداز اور روح فرسا حقیقت ہے۔ زمین کی ایک جنبش نے سیکڑوں بستیوں کو پیوندِ خاک کر دیا۔ ہزاروں انسانوں کو وادیٔ مرگ میں دھکیل دیا۔ لاکھوں جسموں کو اپاہج بنا دیا اور اک ساعت بے رحم نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان بے شمار انسانوں کو بے یار و مددگار وقت کے گرم و سرد تغیرات کے حوالے کر دیا۔ کوئی گروہ کوئی قبیلہ کوئی قوم یا ملک تنہا ایسی قہرناکیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے چنانچہ ایسے ہی پُر آشوب لمحات میں وحدت انسانی کا احساس بیدار ہوتا ہے بقول

سعدی شیرازی:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند   که در آفرینش زیک جوہراند
چو عضوے بدرد آورد روزگار   دگر عضوہا را نہ ماند قرار

یہی رجحان دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے قومیتوں اور جغرافیائی حد بندیوں کے تصورات تحلیل ہونے لگتے ہیں اور ایک قدرِ مشترک تمام عالمِ انسانیت کو متحد کر دیتی ہے حالیہ سانحہ کے بعد جو مظاہر دیکھنے میں آئے ان سے بھی یہ بھرپور تاثر ملا ہے کہ اہلِ وطن ابتلا کی اس گھڑی میں خدمت و ایثار کے جذبوں سے سرشار ہیں انہوں نے بحیثیت قوم خود کو ازسرِنو دریافت کیا ہے اور انسان دوستی کی لازوال تاریخ رقم کی ہے۔ لہٰذا اس بلائے ناگہانی کے نقصانات اپنی جگہ مگر انسانی ہمدردی۔ اخلاص و ایثار اور یگانگت ویکجہتی کے جو نئے افق ہماری قومی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں ان کو تابناک تر بنانے کا فریضہ ہمارے اہلِ قلم انجام دے سکتے ہیں جس طرح دوسری جنگِ عظیم کے بعد بالخصوص جو عالمی ادب تخلیق ہوا اس کے نتیجہ میں انسانی المیوں کو اجاگر کیا گیا اور بیک وقت عالمِ انسانیت کو ایک ایسے مستقبل کی نوید بھی دی گئی جس نے غمزدہ دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیئے۔

ایسا ہی ادب اس سانحہ کے بعد تخلیق ہونا شروع ہو چکا ہے جس کا اندازہ زیرِ نظر شمارہ میں ایک مخصوص گوشے (قہر آشوب) کی تحریروں سے کیا جاسکتا ہے پُرعزم و باہمت قومیں ہی تباہی کی خاکستر پر مستقبل کی تعمیر کیا کرتی ہیں بقول حکیم الامت:

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار   تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

اسی کے ساتھ زندگی کی سفاکانہ حقیقتوں کا ادراک بھی بہت ضروری ہے کہ یہی مقتضائے فطرت ہے چنانچہ علامہ زندگی کی اس روش کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ انسان کہیں خود فریبیوں یا

خوش گمانیوں ہی کی نذر ہو کر نہ رہ جائے ''بانگ درا'' کی ایک نظم میں فرماتے ہیں جس سے بڑی حد تک ہمارے حالیہ سانحے کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر   آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت   گلشن ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں   کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایّام ہیں
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت   دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں   ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

زندگی کے اسی قنوطی پہلو سے رجائیت کے سرچشمے بھی پھوٹتے ہیں جن کے روبرو زلزلوں بجلیوں اور قحط جیسی ''دخترانِ مادرایّام'' کو سرنگوں ہونا پڑتا ہے عزم و ہمت کے نئے باب رقم ہوتے ہیں تاکہ زندگی کو طوق گلو افشار سے نجات دلائی جا سکے قرطاس و قلم نئی حقیقتوں کا ادراک اور ان سے نبرد آزما ہونے کی فاتحانہ سوچ کو بیدار کر سکیں یہ عمل جاری ہو چکا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے اہلِ فکر و دانش قوم میں عزت نفس کے احساس کو بھی مزید مستحکم کرنے کے لیے اپنا فرض ادا کریں گے اور قوم کے اربابِ فن اور ارباب قلم انفرادی و اجتماعی خوداعتمادی کی روحِ خوابیدہ کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی سعی کا آغاز کریں گے۔ کہ غیور دلوں کے نہاں خانوں سے یہ آواز بدستور آرہی ہے

نگاہیں جس کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر   اُسے ماضی کی بے رحمی کو دہرانا نہیں آتا

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۶ء)

معاصر ادب میں فکری و نظریاتی اعتدال کی ضرورت

عالمِ انسانیت کو آج جن سنگین اور سنجیدہ تر مسائل کا سامنا ہے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان تمام عوامل کو متحرک کرنے کی ضرورت ہے جو ہمہ گیر بھی ہوں اور موثر بھی۔ ان میں ادب و صحافت جن میں سمعی و بصری ذرائع ابلاغ بھی شامل ہیں سریع التاثیر کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تبدیلی لانے والی یہ قوتیں بھی ناہموار، شدید اور غیر معتدل رویوں کا شکار ہو چکی ہیں جس کے نتیجے میں دنیا ایک ایسے ہلاکت آفریں لمحے کے تصور سے لرزہ براندام ہے جو مادی ارتقاء کے ہمہ جہت نظامِ موجود کو دفعتاً خاکستر میں تبدیل کر سکتا ہے۔

تبدیلی لانے والی ان قوتوں میں سرِ دست ادب ہمارا موضوع گفتگو ہے جس کا تاریخی تناظر میں اگر جائزہ لیا جائے تو بتدریج روبہ انحاطاط نظر آتا ہے۔ یہی نہیں کہ فنی و علمی معیار ہی شکست دریخت کا شکار ہوا ہے بلکہ موضوعات کی متانت و معنویت بھی متاثر ہوئی ہے فکر و احساس میں توازن کا عنصر کم سے کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ تعّقل کیشی جو کبھی ادب عالیہ کی شناخت تھی رفتہ رفتہ ہیجان پرور رویوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے چنانچہ یہ صورتحال اہل دانش کے لیے لمحۂ فکریہ بن گئی ہے مادی طاقت کا توازن جس سُرعت سے محدود تر ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے اس نے اخلاقیات ہی نہیں انسانی اقدار کو بھی پسِ پشت ڈال دیا ہے اور لگتا ہے کہ محبت و عافیت کی جگہ نفرت و جدال اور تفکر و تعقل کی جگہ ہیجان و انتشار معاصر تخلیقی اذہان کو اپنی گرفت میں لے چکے ہیں جنوبی ایشیا جسے ہم اپنا گرد و پیش قرار دے سکتے ہیں اصنافِ ادب کی کم عیاری کا عجیب روح فرسا نقشہ پیش کر رہا ہے جس سے کوئی بھی صنفِ ادب محفوظ نظر نہیں آتی۔

کیا وجہ ہے کہ افسانہ کی صنف میں سجاد حیدر یلدرم اور منشی پریم چند کے بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی جیسے نام ابھرے جنہیں احمد ندیم قاسمی،

خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، غلام عباس اور انتظار حسین جیسے ناموں نے تسلسل عطا کیا لیکن بعد میں افسانے تو لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں لیکن افسانوی افق پر ایک لکیر ہے جو کبھی بلندی کی طرف اُبھرتی تو ہے یا ٹھہر جاتی ہے لیکن یہ لکیر اب نشیبی رجحان اختیار کر چکی ہے۔ اسی طرح مولوی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور عبدالعلیم شرر، ناول کی صنف کے فقیہانِ گراں مایہ خیال کیے جاتے ہیں جن کے بعد اس صنف کا جلال و جمال، جن ناموں کے رہین منت رہا ان میں قرۃ العین حیدر، احسن فاروقی، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، انتظار حسین اور بانو قدسیہ جیسے نام ہیں لیکن ناول کی صنف معیار کے اعتبار سے آج تقریباً معدوم ہو چکی ہے یہی حال طنز و مزاح کی دنیا کا ہے کہ رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری اور ابن انشاء کے بعد مشتاق احمد یوسفی پر آ کر نظریں ٹھہر جاتی ہیں یا اس شمع کو جن ناموں نے فروزاں رکھا ان میں حالیہ برسوں میں شفیق الرحمان، کرنل محمد خاں اور عطاالحق قاسمی یا دو ایک نام اور لیے جا سکتے ہیں شامل ہیں۔ امتیاز علی تاج اور آغا حشر نے ڈرامہ کو معراجِ کمال کو پہنچایا لیکن آج یہ صنفِ ادب بھی جاں بلب نظر آتی ہے۔ رہا صنفِ شعری کا سوال تو یہ ایک نظر افروز طویل کہکشاں ہے جو میر و غالب حالی، اقبال اور جگر و جوش سے فیض و ناصر کاظمی تک بے شمار تاباں و رخشندہ ستاروں پر مشتمل ہے لیکن عہد حاضر تک پہنچتے پہنچتے یہ منظر بھی اس طرح دھندلا گیا ہے کہ ہئیت و اسلوب اور مواد کے اعتبار سے نظم اور غزل منجملہ دیگر اصناف سخن مسلسل انتشار و بے جہتی کے عمل سے (بہ استثنائے چند) دو چار ہیں۔

ادبی جرائد و رسائل کا یہ حال ہے کہ یا تو کم وسیلہ ہونے کے سبب یا عصر حاضر کے خارجی عوامل سے مغلوب ہو کر وہ بہت کم توفیق رکھتے ہیں کہ ادب میں زوال و انحطاط کا جو رجحان پیدا ہوا ہے اُسے زنجیر کر سکیں ان میں بعض تو اخباری صنعت کی طرح اپنے خدوخال تبدیل کرنے کے عمل سے گزر رہے ہیں جب کہ ہمارے کچھ معروف اہل قلم ادب کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کی بجائے اخباری کالم نویسی اختیار کر چکے ہیں کہ یہی ایک موثر وسیلہ معاش بھی ہے اور ''شہرت و معرفت'' کا زینہ بھی۔ نئی نسل کو نہ درست سمت میں رہنمائی مل رہی ہے اور نہ وہ سنجیدہ مطالعہ کی عادی رہی نتیجہ یہ ہے کہ معاصر تخلیقات میں نہ فکری اعتدال و توازن ہے نہ محبت اور رواداری کا وہ پیغام جس

کے ذریعہ ہمارے صوفی شعراء نے معاشرہ کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنا دیا تھا سر سید، حالی اور اقبال قصۂ پارینہ بنتے جا رہے ہیں اور وہ تحریکیں جو ہماری ادبی تاریخ کے سنگ ہائے میل تھیں یعنی ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق ان کی باقیات صرف چراغ سحری بن کر زندہ ہیں چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبی رویوں کا از سر نو جائزہ لیا جائے جو قومی و بین الاقوامی سطح کے اجتماعات یا ادبی وثقافتی اداروں کے ذریعہ ممکن ہے جو فی الحال بے عملی و بے حسی کا شکار نظر آتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم ملک کے ممتاز دانشور اور بین الاقوامی مُدبر صاحبزادہ یعقوب خاں کے اُس خطبہ کا حوالہ دینا چاہیں گے جو انہوں نے سہ ماہی ''الاقرباء'' کی ایک حالیہ تقریب میں اہل علم، اہل دانش اور اہل قلم کے روبرو ارشاد فرمایا جو مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بلیغ اشارات و معانی کا ایک جہان سموئے ہوئے تھا۔ رامپور اور لوہارو کے تہذیبی، ثقافتی اور علمی و ادبی ورثہ کے امین اور لسانیات قدیم وجدید پر گہری نظر اور دسترس رکھنے والے صاحبزادہ صاحب نے ادب کو معاشرہ کی تہذیبی وثقافتی نشوونما میں بنیادی مگر خاموش اور موثر کردار ادا کرنے والا عامل قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

> ''حقیقی ادب کی بنیاد ہمیشہ انسانی وحدت پر قائم ہوتی ہے لیکن عالمی وسعتوں نے انسانی وحدت کو مختلف جغرافیائی، لسانی، معاشرتی اور تہذیبی وثقافتی اکائیوں میں بانٹ دیا ہے ادب انسانی وحدت کے حوالے سے ان تمام اکائیوں کا ترجمان ہوتا ہے چنانچہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں تخلیق پانے والے ادب کو جہاں بنیادی اقدار کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے وہیں اُسے مقامی رنگ وآہنگ کو بھی اپنی آغوش میں پروان چڑھانا ہوتا ہے۔''

چنانچہ ادب میں عالمگیریت، مشروط ہے، ذیلی تہذیبوں سے جسے ہمارے اہل قلم ایک تحریک کے طور پر اپنا کر پروان چڑھا سکتے ہیں تاکہ ہماری تہذیب وثقافت نیز عقیدوں اور رویوں پر شدت وعدم اعتدال کے الزامات خود بخود دم توڑ جائیں۔ (اپریل۔ جون ۲۰۰۶ء)

تعلیم اور قومی تشخص۔۔۔ نظام و نصاب کے مسائل

خود آگہی اور خدا آگہی کا واحد ذریعہ حصول علم ہے جو فرد اور جمعیت دونوں کی ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ عمل کثیر الجہت بھی ہے اور لامتناہی بھی۔ اول الذکر صورت میں سمت اور ترجیحات کا تعین، تہذیب و معاشرت اور عقائد و نظریات کے حوالے سے کیا جاتا ہے تاکہ فرد یا جمعیت کی شناخت ممکن ہو سکے چنانچہ اس تناظر میں اقوام و ملل جہاں اجتماعی تعلیم کے لیے حکمت عملی مرتب کرتے وقت جدید ترین علوم و معارف سے بہرہ مند رہنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں وہیں اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ایک توانا احساسِ تشخص عطا کرنے کی خاطر اپنی مخصوص روایات پر مبنی تاریخ کے مطالعہ کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ یہ اہتمام ملکی سطح پر صرف آزاد اقوام کے نصاب ترجیحات کا تو بالعموم حصہ ہوتا ہے لیکن وہ قومیں اور معاشرے جو حریتِ فکر و عمل کی نعمت سے محروم ہیں ایک اجنبی نظام کے تابع رہنے پر مجبور ہوتے ہیں چنانچہ جنوبی ایشیا کی اقوام کا عہد غلامی میکالے کے مسلط کردہ نظام و نصاب تعلیم میں مقید رہا جس کے مقاصد محکوم اذہان کو غیر ملکی مفادات کے سانچوں میں ڈھالنا تھا البتہ سرکاری سطح سے قطع نظر نجی دائرہ کار میں مسلمانانِ برصغیر نے دینی و اخلاقی تعلیم کا جو ایک وسیع و عریض نظام قائم کیا اور اسلامی تاریخ کی تدریس کے ذریعہ اپنے نونہالوں کے اذہان و قلوب کی جس طرح تربیت کی اُس کے نتیجہ میں تسلیم کیا گیا کہ مسلمان برصغیر میں ایک باقاعدہ قوم کے اوصاف سے متصف ہیں اور اسی بنا پر بدترین اکثریتی سازشوں اور حکومتی رکاوٹوں کے باوجود پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

از کفِ دشمن گرفتم جام را من شناسم گردشِ ایام را

نجی شعبہ میں فکر و عمل کا یہ انقلاب جس کے نتیجہ میں ایک نظریاتی مملکتِ خداداد کا قیام تاریخ

کا ایک ناقابل فراموش واقعہ بن گیا وہ ہمارے بزرگوں کی دانش و حکمت اور اخلاص و ایثار کا فیضان تھا چنانچہ آزادی کے فوراً بعد جن اولین بیانات و خطابات اور پیغامات میں حضرت قائد اعظمؒ نے قوم کو مخاطب فرمایا اُن میں نومبر ۱۹۴۷ء میں منعقدہ پہلی تعلیمی کانفرنس کے نام پیغام کے درج ذیل الفاظ آج بھی اپنی معنویت کا واسطہ دے دے کر قوم سے اخلاصِ عمل اور ملّی حمیت و غیرت کے ملتجی نظر آتے ہیں:

> ''آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کی اہمیت اور صحیح طرز تعلیم کسی تاکیدِ مزید کے محتاج نہیں۔ ایک صدی سے زیادہ غیر ملکی حکمرانی کے دور میں ہمارے عوام کی تعلیم پر جو توجہ دی گئی وہ ناکافی تھی۔ ہم اگر حقیقی معنوں میں ٹھوس اور تیز رفتار ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس مسئلہ سے اخلاصِ نیت کے ساتھ نمٹنا ہوگا اور ایک ایسی حکمت عملی اور نظام مرتب کرنا ہوگا جو ہمارے لوگوں کے ذہنی و فطری میلانات کے مطابق ہو۔ ہماری تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو اور اُن تمام جدید وارتقائی عوامل سے مطابقت رکھتا ہو جو دنیا بھر میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ ہماری مملکت کے مستقبل کا انحصار اُس طرز تعلیم پر ہوگا جو ہم اپنے بچوں کو دیں گے اور پاکستان کے مستقبل کے شہریوں کی حیثیت سے جس طرح ہم انہیں پروان چڑھائیں گے۔''

قائداعظم نے اپنے پیغام میں تین اہم نکات پر قوم کو متوجہ فرمایا:

(الف) تعلیمی نظام اور حکمتِ عملی اہل پاکستان کے ذہنی و فطری میلانات کے مطابق ہو

(ب) ہماری تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو۔

(ج) اُن تمام جدید وارتقائی عوامل سے مطابقت رکھتی ہو جو دنیا بھر میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔

چنانچہ جس کانفرنس کو یہ پیغام دیا گیا اُس کا بنیادی تصور بھی یہی تھا کہ آزادی کے بعد مملکت کے نظریاتی وسیاق وسباق میں تعلیم سے متعلق نئی حکمتِ عملی کے تازہ خدوخال کیا ہوں جو عالمی

تناظر میں قومی ضروریات اور امنگوں کی عملی تعبیر کہے جاسکیں اس کے بعد ۱۹۹۸ء کی قومی تعلیمی کانفرنس (جس کی سفارشات ۲۰۱۰ء تک کی مُدّت کا احاطہ کرتی ہیں) تک گزرتے ہوئے مہ و سال کے درمیان کم وبیش آٹھ یا نو ایسی دستاویزات مرتب کی گئیں جنہیں قومی حکمت عملی کا ترجمان تو کہا گیا لیکن نصف صدی سے بھی متجاوز قیمتی وقت کے ضیاع کے بعد جب ایسی ہی قومی سطح کی کانفرنس گذشتہ مئی ۲۰۰۶ء میں منعقد کی گئی تو جو منظر نامہ پیش نظر تھا وہ یہ تھا کہ تعلیم ہماری قومی ترجیحات میں پست سے پست تر ہو چکی تھی۔ اخلاقی، علمی اور نظریاتی اجزائے ترکیبی سے بسُرعت محروم ہو کر تجارتی اور کاروباری حیثیت اختیار کر چکی تھی اور قوم بدستور دوہرے نظام تعلیم کی سفّا کی سے دوچار تھی جس نے طبقاتی رویوں اور سوچ کو پروان چڑھا کر قوم کے مجموعی اتحاد ہی کو نہیں بلکہ حکمت ودانش کے قومی اثاثہ کو دونیم کر کے رکھ دیا تھا، چنانچہ یہ تھا وہ منظر نامہ جو ارباب حل وعقد اور ماہرین تعلیم کے لیے لمحۂ فکریہ تھا اور سنگین چیلنج بھی۔

ہماری بدقسمتی کہ ہم من حیث القوم اُن اوصاف سے بوجوہ تہی دامن نظر آتے ہیں جو ایک غیور قوم کی پہچان ہوتے ہیں۔ ان وجوہ میں ہوسِ جاہ وزر اور اقوام مغرب کی نسبت ذہنی مرعوبیت اور احساسِ کمتری سرفہرست ہیں جو نتیجہ ہیں تقریباً چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود بھی وہ نظام تعلیم نافذ نہ کرسکنے کا جس کی طرف حضرت قائداعظم نے واضح اشارہ فرمایا تھا کہ:

”ہماری مملکت کے مستقبل کا انحصار اُس طرزِ تعلیم پر ہوگا جو ہم اپنے بچوں کو دیں گے“

آج کیفیت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی دینی وملی اقدار سے ناآشنا اور مغربی اطوارِ زندگی کے گرویدہ ہیں، ہمارے دانش ور اور صاحبانِ فکر بے اعتمادی کا شکار ہیں اور ہر عہد میں مسند اقتدار پر متمکن طبقہ کبھی ذاتی مفادات کے گرداب سے باہر نہیں نکل سکا چنانچہ تازہ ترین تعلیمی پالیسی بھی اُن مقاصد کی تکمیل سے قاصر نظر آتی ہے جو قیام پاکستان کو جواز مہیا کرتے ہیں اور جو اقبال وقائد دونوں کی آرزوؤں کے مظہر تھے۔ خود سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ملک میں ایک کروڑ تیس لاکھ نونہالانِ قوم ایسے ہیں جو مکتب ومدرسہ کی صورت سے بھی آشنا نہیں جب کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دس سال سے متجاوز ناخواندہ افراد کی تعداد تقریباً ”پانچ کروڑ“ ہے جو ملکی آبادی کا ایک تہائی ہے۔

جدید علوم سے قوم کو آراستہ کرنا یقیناً ایک بہت بڑی ضرورت ہے اور بحیثیت بین الاقوامی ذریعۂ اظہار انگریزی زبان کی اہمیت بھی مسلّم لیکن اپنی زبان اپنی تاریخ و روایات اور سب سے بڑھ کر اپنے دینی و ملی اثاثہ کو پس پشت ڈال دینا جو ہماری قومی شناخت کے ضامن ہیں کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہماری اسی کج فہمی کے باعث آج نہ ملک کی جغرافیائی حدود وہ ہیں کہ جو تھیں اور نہ نظریاتی استحکام کے لیے وہ تڑپ زندہ ہے جس نے دنیا کے نقشہ پر ایک عظیم مملکت اسلامیہ کا اضافہ کر کے تاریخ کا رُخ موڑ دیا تھا۔

آج سے بہتر تو ہم اس وقت تھے جب ہندو اور انگریز دونوں ہمارے دینی و ملی تشخص کو مٹا دینے کے درپے تھے لیکن ہمارے بزرگوں نے اپنی تاریخ اور ماضی سے بیگانہ نہ ہونے دیا، مولانا محمد علی جوہر، نے جن پر ''مدرسہ و خانقاہ کی تہمت'' بھی نہ تھی اور جو علی گڑھ اور آکسفورڈ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنے دینی و ملی تشخص کے بھی نمائندہ ترجمان تھے۔ ۱۹۲۰ء میں مسلمان قوم کو ایسا نصاب تعلیم دیا تھا جسے آج بھی ہمارا رہبر و رہنما ہونا چاہئے۔ کہ یہی ہمارے ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے پیوستہ و ہمکنار کر سکتا ہے۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی مولانا مرحوم کے مجوزہ نصاب تعلیم کی بہترین تجربہ گاہ ثابت ہوئی۔ جامعہ نے ایسی عظیم المرتبت اور جامع الصفات شخصیات پیدا کیں جنہیں دنیائے معارف میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا جوہر کے مجوزہ نصاب تعلیم کے نمایاں خدوخال یہ ہیں۔

(۱) قرآن کریم سے بخوبی واقفیت بتدریس ترجمۃ القرآن (۲) عربی زبان کی تعلیم (۳) دینیات کی تعلیم جو غیر مسلموں کے لیے لازمی نہیں (۴) ذریعۂ تعلیم مادری زبان (۵) مغربی زبانیں (اختیاری) (۶) دین و مذہب کی تعلیم کے علاوہ جغرافیہ، سیاست و مدنیات، طبیعیات، کیمیا و حیاتیات، معاشیات، ریاضیات، منطق و نفسیات نیز علوم اسلامیہ، تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، ادبیات اور قانون وغیرہ۔

سائنس کی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں مولانا مرحوم اپنی کتاب بعنوان ''قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام'' مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں رقمطراز ہیں:

''ہماری خواہش ہے اور اس امر کی سخت ضرورت بھی ہے کہ مسلمان سائنس میں نسبتاً زیادہ دلچسپی لیں اور اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تجویز ہے کہ منزل اول میں بھی سائنس کی تعلیم کا بحیثیت ایک لازمی مضمون انتظام کیا جائے تا کہ آئندہ علمی عمارت کے لیے یہ ایک بنیاد کا کام دے۔''

مولانا کے نصاب میں مجوزہ مدارج تعلیم درج ذیل ہیں:

(۱) مدتِ تعلیم ایک سے دو سال اور بچے کی عمر کے ساتویں سال تک (۲) مدت تعلیم پانچ سال، عمر کے آٹھویں سال سے بارہویں سال کے اختتام تک (۳) مدت تعلیم پانچ سال عمر کے تیرہویں سال سے سترہویں سال تک (۴) مدت تعلیم تین سال یعنی عمر کے اٹھارویں سال سے بیسویں سال کے ختم تک (اعلیٰ تعلیم) مولانا کی متذکرہ کتاب جو تقریباً نایاب ہو چکی تھی ۱۹۸۱ء میں صادقیہ پبلیکیشنز ۴۲۱ پارک بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے دوبارہ طبع ہو چکی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا حصول حکومت کی دسترس سے باہر نہ ہوگا۔ مولانا کا بھی سرسید کے بقول یہ تصور تھا کہ:

''سائنس ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگی اور فلسفہ ہمارے بائیں ہاتھ میں اور ہمارے سر پر ایک تاج ہوگا جس پر ''لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ'' لکھا ہوگا۔''

پاکستان کا قیام اسلامی تصور حیات کے رہین منت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ہمارا آئین اس حقیقت کی ضمانت ہے کہ حضور اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق ''علم مسلمان کی میراث ہے'' تو پھر کیوں ہماری مقتدر ہستیاں اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ طرز عمل اپنائے ہوئے ہیں ہمارا دین جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے ہرگز جدید علوم سے اغماض پر راغب نہیں کرتا اور نہ کسی بھی زبان بشمول انگریزی سے عصبیت کا درس دیتا ہے لیکن ہمارا دین ہمیں بے شناخت و بے چہرہ بھی رکھنا نہیں چاہتا اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے نظام و نصاب تعلیم کو از اول تا آخر اپنے نظریۂ حیات کی بنیاد فراہم کریں اور اعتدال و توازن کے اسلامی شعائر کو اپنائیں، مولانا جوہرؒ کے مجوزہ نصاب تعلیم سے ضروری اضافہ و ترمیم کے ساتھ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور تعلیم کی پہلی منزل

سے دین و اخلاقیات کا درس دے کر ہی ہم مستقبل کے غیور اور روشن خیال شہری پیدا کر سکتے ہیں، جس کے قائداعظمؒ آرزومند تھے۔ اردو زبان کے بارے میں بھی ہمیں اپنا رویہ بہتر بنانا ہوگا کہ یہ بہر اعتبار ایک عالمی زبان کے معیار و منزلت سے ہمکنار ہو چکی ہے، یہی ہماری قومی زبان ہے اور اسی کو سرکاری زبان بھی ہونا چاہئے۔ اردو کا حق ہے کہ اُسے پاکستان میں ہر سطح پر لازمی زبان کا درجہ دیا جائے اور دیگر زبانوں بشمول انگریزی کو اختیاری حیثیت دی جائے کہ یہی اک طریقہ ہے قومی تشخص کی بازیافت کا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　　　نیست ممکن جُز بہ قرآں زیستن

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء)

'غزالاں تم تو واقف ہو۔۔۔۔!'

اردو ادب میں غزال و غزل کی روایتوں کا رمز شناس، افسانہ و افسوں کی کیفیات کا ترجمان اور نقد و نظر کی بصیرتوں کا امین جسے دنیا احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے فانی تھا اور فنا ہو گیا لیکن رہگزار وقت پر اپنے فکر و فن کے وہ نقوش ثبت کر گیا جو تابناک ہی نہیں ابدی بھی ہیں۔ کوئی بھی خطہ زمین مشرف بذّات نہیں ہوتا بلکہ شخصیتوں کا فیضان اسے شرف عطا کرتا ہے چنانچہ شہرتِ دوام اب ضلع خوشاب کی پسماندہ سرزمین کے قریۂ گمنام کا جسے مقامی دیہی آبادی ''انگہ'' کے نام سے پہچانتی ہے نہ صرف مقدر بن چکی ہے بلکہ عالمی سطح پر ادب کے حوالوں میں قاسمی کی پاکستان سے نسبت ہمارے قومی افتخار کی علامت بھی بنی رہے گی۔

مرحوم کی طویل ادبی زندگی نہ صلہ و ستائش کی تمنا کی مظہر ہے اور نہ ذاتی نمود و نمائش کی آئینہ دار بلکہ ایسے سنگ ہائے میل سے عبارت ہے جو انہیں بین الاقوامی سطح کا فنکار قرار دیتے ہیں، ان کی فکری اور نظریاتی آفاقیت کے جلی عنوانات میں سب سے زیادہ مسحور کن پہلو ان کی انسان دوستی کا ہے جو اُن کی تمام تخلیقات میں روح بن کر سرایت کیے ہوئے ہے۔ افسانہ نگار قاسمی ہو یا شاعر و نقاد احمد ندیم وہ شخص اپنی ژرف نگاہی کے سبب زندگی کی نازک ترین حقیقتوں کا ترجمان بن کر ابھرا اور حقیر سے حقیر واقعات کی تہہ میں اُتر کر بے نام جذبوں اور بے سہارا آرزوؤں کو امر کر گیا۔ وہ ایک ''غریب و غیور'' فنکار تھا جسے نہ عُسرت احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکی نہ وقت کی سرد مہری اُس کی سرگرمِ عمل زندگی کو شکست دے سکی۔ قاسمی صاحب کا تمام فن اسی حقیقت کا گواہ ہے ان کے اپنے الفاظ میں:

''میری خود نوشت میری نظموں، غزلوں، قطعوں، افسانوں اور مضمونوں میں موجود ہے ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک خود نوشت میں ہونا چاہیے وہ حالات اور ماحول جن سے میری

> شخصیت صورت پذیر ہوئی وہ تضادات جن میں مجھے پھنسنا پڑا، وہ ثقافتی روایات جن میں میرے بچپن کی تربیت وتہذیب ہوئی وہ نظریات ومعتقدات جن کی توانائی نے مجھے زندگی اور انسان سے لازوال محبت کرنا سکھایا، وہ رشتے اور رابطے وہ اپنائیتیں اور بے گانگیاں وہ کامرانیاں اور محرومیاں وہ اندھا دھند پیار اور بے سبب نفرتیں جن سے زندگی کی رنگا رنگی عبارت ہے۔۔۔ ان سب کی محض جھلکیاں ہی نہیں، جزئیات کی حد تک مکمل تفصیلیں میرے شعروں اور افسانوں میں جمع ہیں'' [1]

پُرجہت زندگی کا یہی وہ تنوع تھا جس نے ایک کم سواد قریے میں جنم لینے والے لڑکے ''احمد شاہ'' کو ادبی شہرت ومنزلت کی حدود سے ماورا کر کے بیکراں بنا دیا۔ یہ وہی احمد شاہ تھا جس کی ابتدائی پہچان یہ تھی کہ ''موٹے موٹے نقوش کا ایک صحت مند لڑکا اپنے گاؤں کی پہاڑیوں اور وادیوں میں جھاڑیوں کی خشک ٹہنیاں اور مویشیوں کا خشک گوبر چُنتا تھا'' (مکتوب [1] بنام صہبا)

چنانچہ وقت اپنی تمام تر سفاکیوں کے باوجود گواہ ہے کہ وہی احمد شاہ جو خشک گوبر چُنتا تھا، جب احمد ندیم قاسمی بن کر فن کے افق پر طلوع ہوا تو دنیا نے اس کے فن کو خراج تحسین پیش کیا اور اُس کے افسانوں اور نظموں کے مجموعے روسی، چینی اور یورپ کی کئی زبانوں نیز فارسی میں ترجمہ ہوئے اور مختلف جامعات میں اُس کے فکر وفن پر تحقیقی مقالات لکھے جانے کے علاوہ اس کی زندگی ہی میں تاشقند یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس لکھا گیا۔ ''انسان عظیم ہے'' اور ''پتھر'' جیسی نظموں کے علاوہ ''ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد'' ''اور ''پرمیشر سنگھ'' جیسے افسانوں نے ندیم کو عالمی شناخت عطا کی، یہی نہیں بلکہ ہمارا ادب جو معاصرانہ رقابت ومنافقت اور ہوس وحسد کی کریہہ الاصل روایتوں سے آلودہ نظر آتا ہے قاسمی کے لیے اپنے دامن میں عظیم معاصرین کے گلہائے ستائش بھی لیے ہوئے ہے جو اُس جیسے منفرد اہل قلم کا حق تھا۔ ان میں عظیم معاصرین کے گلہائے ستائش بھی لیے ہوئے ہے جو اُس جیسے منفرد اہل قلم کا حق تھا۔ ان مداحوں میں جوش وفیض،

---

[1] مکتوب بنام صہبا لکھنوی مدیر 'افکار' کراچی مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۴ء

راشد و حفیظ جیسی ''نابغۂ شعر'' ہستیوں کے علاوہ معروضی تنقید کے اکابر میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور پروفیسر مجتبیٰ حسین جیسی شخصیات شامل ہیں جنھوں نے قاسمی صاحب کی عظمتِ فن اور انسان دوستی کو برملا خراج تحسین پیش کیا ہے۔

مشاہدہ اور تجربہ کسی بھی فنکار کا سرمایہ ہوتے ہیں اور قاسمی صاحب اس سرمایہ کے امین بھی تھے اور قاسم بھی۔ اُن کا سرمایۂ فکر و فن زندگی کے وہ تمام نشیب فراز ہیں جن کی آغوش میں انہوں نے اپنے شب و روز بسر کئے وہ تمام تلخ و شیریں حقیقتیں ہیں جو ان کے افسانوں اور کہانیوں میں تحلیل ہو گئیں اور جذبہ و احساس کی وہ تمام صداقتیں ہیں جو شعر کے حسین قالب میں ڈھل گئیں۔

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں   کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

انہوں نے اپنے تیشۂ فکر اور قلم کی کاٹ سے معاشرہ کے ناسوروں پر نشتر زنی کا عمل نہایت ذہانت و ذکاوت اور فنکارانہ بصیرت سے انجام دیا وہ ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں اپنی بھرپور عملی صلاحیتوں کے ساتھ شریک تھے انہوں نے خونِ دل سے نخل ادب کی آبیاری کی اور عصری رجحانات کی اس انداز سے تہذیب و تربیت کی کہ مورّخ ایک رجحان ساز اہل قلم کی حیثیت سے انھیں ایک بلند مقام و مرتبہ دینے پر مجبور ہے، زندان و سلاسل بھی اُن کی قلمی زندگی کے اس عظیم تسلسل کو شکست نہ دے سکے اور کردار کی استقامت ہمیشہ ان کا نشانِ امتیاز بنی رہی۔

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم   وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

انجمن ترقی پسند مصفین کا منشورِ فکر و فن وہ جن الفاظ مین بیان کرتے ہیں دراصل وہ ان کی اپنی ذات و صفات کے ترجمان ہیں:

غبارِ راہ سہی ہم نشانِ راہ بھی ہیں   جہاں گزیدہ بھی ہیں اور جہاں پناہ بھی ہیں
یہ سب درست کہ معتوب بھی تباہ بھی ہیں   شبِ سیاہ جہاں میں نوید راہ بھی ہیں

عوام دوست ہیں یعنی گناہگار ہیں ہم   مورخوں سے مگر اس کے دادخواہ بھی ہیں
لبوں پہ گیت تو ہاتھوں میں ہے عنانِ حیات   کہ ہم تمدن و تہذیب کی سپاہ بھی ہیں
یہ انقلاب کی ہے اولیں جھلک کہ ندیم   ہماری کھوج میں شاہانِ کج کلاہ بھی ہیں

ندیم کی عظمت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اگرچہ شاہان کج کلاہ کے سامنے انہوں نے کبھی اپنا سرِ غیور خم نہیں کیا لیکن وطن کی محبت مٹی کی خوشبو بن کر ہمیشہ اُن کے رگ و پے میں خونِ گرم کی طرح گردش کرتی رہی اُنہوں نے ترکِ وطن کا کبھی تصور تک نہیں کیا۔

رہونگا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں   جوان وادیوں، بلوان کوہساروں میں
یہ کچے مٹی کے گھر یہ غریب رشتہ دار   یہ آڑی ترچھی سی بوسیدہ چھپّروں کی قطار
صبیح بچوں کے جھمگٹ یہ تنگ گلیوں میں   یہ پھول بننے کے انداز تازہ کلیوں میں

آج کے ادب اور ادیب دونوں کو اُس قلم کی حُرمت، لفظ کی صداقت، جذبہ و فکر کی طاقت اور کردار کی عظمت و استقامت کی ضرورت ہے جو قاسمی صاحب اپنے قابلِ تقلید ورثہ کی شکل میں لکھنے والوں کی نئی نسل کو سونپ گئے ہیں۔

ہر چند ان کی زندگی میں بھی بعض معاصرین کو ان سے اختلاف رہا اور ہو سکتا ہے کہ سمندر میں اُتر جانے والے اس دریائے ہنر کو بعد میں بھی ہدفِ تنقیدی بنایا جائے لیکن شاید اس حقیقت سے انکار نہ کیا جا سکے گا کہ قاسمی ایک عظیم فنکار مُحب وطن شاعر اور انسان دوست قلمکار تھا جس کی رحلت سے پاکستان کا ادبی منظر اپنی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی سے محروم ہو گیا ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی   دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۶ء)

ادب کا نوبل انعام۔۔۔ معیار و ملحوظات

گزشتہ ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ زندگی کے اہم ترین شعبوں میں نمایاں ترین خدمات انجام دینے والوں کو ہر سال عالمی سطح پر اعزازتِ استحسان و تکریم سے نوازا جاتا ہے جس کا اہتمام سکینڈینیویا کے ملک (Scandanavian Country) سویڈن کی ایک اکیڈیمی کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ عام تاثر یہی ہے کہ انعام یافتگان کے تعین سے قبل اُن کی متعلقہ شعبہ میں خدمات اور کارکردگی کو ایک سخت ترین معروضی معیار کے تحت تنقید و تجزیہ کی میزان سے گزارا جاتا ہے چنانچہ امن عالم اور فلاحِ انسانی جیسے شعبوں کے علاوہ ادب کے شعبہ میں بھی عطائے اعزاز کا جسے نوبل انعام (Nobel Prize) کا نام دیا گیا ہے سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب اس سلسلہ کا آغاز ہوا تو پہلا نوبل انعام فرانس کے معروف اہلِ قلم فرینکوکس آرمنڈ (Francoks Armand) کو جس کا قلمی نام سُلی پروڈھومے (Sully Proucdomme) تھا اس اعتراف کی بنا پر دیا گیا کہ اُس کی شعری نگارشات اعلیٰ ترین فکر، فنکارانہ عبارت اور دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کے امتزاج کا نمونہ ہیں۔ اور اب ادب کا تازہ ترین نوبل انعام برائے سال ۲۰۰۶ء ترکی کے گزشتہ چند برسوں میں عالمی شہرت حاصل کرنے والے ادیب اُرحان پاموک (Orhan Pamuk) کو دیا گیا ہے۔

پاموک کا نام بین الاقوامی منظر پر اُس وقت خاص طور پر اُبھر کر آیا جب ۱۶ دسمبر ۲۰۰۵ء کو ترکی میں اُس کے خلاف اس الزام کے تحت ایک فوجداری مقدمہ کی کاروائی کا آغاز ہوا کہ وہ ملک کے تشخص کی توہین کا مرتکب ہوا ہے اس الزام کا پس منظر یہ تھا کہ اُس نے سوئٹزرلینڈ کے ایک اخبار کو اپنے انٹرویو میں ترکی کو جنگ عظیم اول میں دس لاکھ آرمینیوں کے قتل عام اور ماضی قریب میں تیس ہزار کُردوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ پاموک کے ناولوں کے مطالعہ سے ترکی کے تشخص کی کیثرالجہتی سے متعلق جو ملوکیت سے مملوپُر ثروت ماضی پر مبنی ہے مصنف کی ایک ذہنی

تلاش اور جستجو کا واضح احساس ہوتا ہے چنانچہ ترکی کے ماضی پر اس تنقیدی رویے کو مغرب میں پذیرائی ملی اور چونکہ ترکی یورپی یونین میں شمولیت کے لیے درخواست دے چکا تھا اس لیے از رہ مجبوری ترکی نے یورپی یونین کے دباؤ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور ۷ فروری ۲۰۰۶ء کو پاموک کے خلاف الزامات واپس لے کر مقدمہ ختم کر دیا۔

اس پس منظر کے ساتھ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۲۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء کو جب پاموک کو نوبل پرائز سے نوازا گیا تو اُسی روز فرانس کی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں ایک بل کی منظوری دی گئی جس کے تحت آرمینی قتل عام کی تکذیب کو قابل تعزیز جرم قرار دیا گیا جب کہ ترک حکومت آرمینی قتل عام کے لیے شورش پسندوں کو متّہم گردانتی ہے۔ حالات و واقعات کا معروضی جائزہ لینے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ پاموک کی تحریروں میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام اور لادینیت کا تصادم، روایت و جدت اور جدید ترکی کی جانب سے مغربی سانچوں میں ڈھلنے کی جارحانہ کاوش نمایاں موضوعات ہیں اس کے ناولوں میں جو اظہار رائے کی آزادی کے مظہر ہیں مشرق و مغرب کے تصادم و تضادات کو وجہ نزاع نہ بنانے کے پیغام کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے پاموک اعتدال کے نقطۂ نظر اور انسانی یاسیت سے لگاؤ کے ایک مخصوص رجحان کا حامل نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُسے مغرب میں محبوب گردانا گیا لیکن ہم وطنوں میں بوجوہ معتوب! تاہم اُس کی فنکارانہ صلاحیتوں بلکہ ”معجزاتِ قلم“ کا برملا اعتراف کیا جاتا ہے۔

یہ تمام متذکرہ وجوہ اس واضح حقیقت کو تقویت پہنچاتی ہیں کہ سویڈن کی اکیڈیمی کے عطائے اعزازات کا پیمانہ اور معیار و ملحوظات معروضی کم اور داخلی زیادہ ہیں یہی وجہ تھی کہ پاموک کے لیے نوبل انعام کے اعلان پر خود اس کے اہل وطن ورطۂ حیرت میں تھے کہ اس انعام کا مستحق شام کے معروف و مقبول شاعر علی احمد سعید کو سمجھا جا رہا تھا جب کہ یاسر کمال جیسے بین الاقوامی صلاحیت کے حامل عظیم ناول نگار کو یہ انعام کئی دہائیوں قبل مل جانا چاہئے تھا ایک تازہ مثال انڈونیشیا کے ناول نگار پراموئیدیا انامتا توئیر (Pramoedya Anamta Toer) کی ہے جن کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ انہیں نظر انداز کر کے صریح ناانصافی کی گئی چنانچہ انعامات کے تعین میں فکری و نظری

عصبیت کی کارفرمائی پر اس لیے بھی یقین آجانا چاہیے کہ گزشتہ ایک صدی سے بھی متجاوز مدت میں جنوبی ایشیا میں اگر کسی کو نوازا گیا تو وہ صرف رابندر ناتھ ٹیگور تھے جنہیں ۱۹۱۳ء میں نوبل انعام کی شکل میں سُرخاب کا پُر عطا کیا گیا اور اس سے قبل یا بعد بشمول علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر اور اہلِ قلم کسی کو مستحق نہیں گردانا گیا فیض مرحوم بھی لینن پرائز کے تو حق دار ٹھہرائے گئے لیکن نوبل پرائز کی اُن کی آرزو تشنۂ تکمیل رہی۔

ارفع ادب کے ضمن میں ہمارا ذہن تین بنیادی خصوصیات کو تسلیم کرنے پر مائل نظر آتا ہے یعنی (۱) زمان و مکاں سے ماورائیت (۲) آفاقیت اور (۳) انسانیت۔ لیکن محسوس ہوتا ہے کہ سویڈن کی اکیڈمی کے صاحبانِ مقتدر خود فکری افلاس کی حد تک ذہنی تنگ دامانی کا شکار ہیں، انہیں ادب عالیہ کی یہ تین اقدار صرف نام نہاد اور بے لگام آزادئ اظہار رائے کے حق اور ان کے اپنے تعبیر کردہ حقوق انسانی میں نظر آتی ہیں جب کہ بالخصوص اسلام کو ''مذہب محض'' قرار دینا جہل یا عصبیت کی بدترین شکل ہے کہ مبادیاتِ اسلام کا سرسری مطالعہ ہی اُس کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا تیقن فراہم کرتا ہے اور متذکرہ تین اوصافِ ادب کا علمبردار نظر آتا ہے۔ بقول اقبالؒ:

مکّہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم !

لہٰذا ہمیں ہرگز تعجب نہیں کہ گزشتہ ایک صدی میں صرف ۱۹۸۸ء میں مصر کے نجیب محفوظ کو بوجوہ نوبل انعام کا سزاوار ٹھہرایا گیا گزشہ ایک سو پانچ برس کے انعامات میں صرف سات یا آٹھ انعامات ایسے نظر آتے ہیں جو ترقی پذیر دنیا کے ممالک کے حصے میں آئے جن میں دو بار جنوبی افریقہ اور دو بار ہی جاپان کے اہل قلم شامل ہیں باقی تمام انعامات اہلِ مغرب کی نذر ہوئے جن میں ایسے نام بھی نظر آئیں گے جو صرف خطابت کی بنا پر نوازے گئے۔

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

اور حان پاموک جن کا تعلق اگرچہ تیسری دنیا کے ایک اہم ملک سے ہے پاکستان میں نسبتاً

کم متعارف ہیں ان کے ناولوں کے تراجم دنیا کی کم وبیش چالیس زبانوں میں ہو چکے ہیں جن میں انگریزی زبان کے پانچ تراجم شامل ہیں۔ ہمارے ہم وطن پروفیسر عمر میمن اُن کے ایک ناول کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے بھی اس طرف توجہ دی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاں زبان وادب سے متعلق ادارے بالخصوص وہ جو سرکاری سرپرستی میں قائم ہیں اور قومی زرمفوضہ کا ضیاع زیادہ اور درست استعمال کم کر رہے ہیں، اُنھیں بین الاقوامی ادب پاکستان کی قومی زبان میں منتقل کرنے کے اہداف تفویض کیے جائیں اور ان میں سے بعض سربراہان کو ذاتی نشرواشاعت کے لیے اپنی منصبی حیثیت کو استعمال نہ کرنے کی ہدایت کی جائے چنانچہ اس طرح ممکن ہو سکے گا کہ ہمارے اہل قلم جو فکروفن کی بے پایاں صلاحیتوں سے بہرہ مند ہیں ادب میں بین الاقوامی رجحانات وموضوعات سے زیادہ تفصیلاً متعارف ہوسکیں اور عالمی سطح کے اُس قلم قبیلہ کے شانہ بشانہ آسکیں جس کی گرفت میں نبضِ عالم بھی ہے اور نظمِ عالم بھی۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

’ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے‘

ابھی قاسمی صاحب کا غم تازہ تھا کہ وقت نے یکے بعد دیگرے کئی زخم اور لگائے اس طرح ۲۰۰۶ء کا سال جاتے جاتے اردو ادب کی کہکشاں سے کچھ ایسے ستارے توڑ کر لے گیا جن کے بعد روشنی تو ہے مگر بہت مدّھم بہت نحیف! شوکت صدیقی اور منیر نیازی رخصت ہوئے تو ۲۰۰۷ء نے آغاز ہی میں وہ سفّاکی دکھائی کہ محسن بھوپالی اور الیاس عشقی کی مفارقت نے شعر و ادب کو نڈھال کر کے رکھ دیا۔ محسن تو ویسے بھی ’حیات وموت‘ کے اس سنگم سے گزرنے کے منتظر بیٹھے تھے۔

بیٹھا ہوں بلاوا مرا! جب تک نہیں آتا
صحرا کی امانت ہوں سرِ گنجِ بہاراں

محسن بھوپالی (عبدالرحمان) نے بہ اعتبار پیشہ انجینئر ہونے کے باوجود بھرپور شعری و ادبی اور ثقافتی زندگی گزاری ان کا نام مشاعروں کی فہرست شعرا کی زینت سمجھا جاتا تھا۔ وقت کے ہر نشیب وفراز سے بڑے دلیرانہ انداز سے گزرے۔ رفاقتوں اور رقابتوں دونوں ہی کا قرض ادا کیا۔ فکر شعر کو زندگی کے تلخ وشیریں حقائق پر مرتکز رکھا اور ’’نیرنگئ سیاست دوراں‘‘ کو بھی بحیثیت شاعر آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے عہد کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی ویسے بھی محسن جو سرمایۂ فکروفن نسلِ نو کے سپرد کر گئے ہیں وہ اُن کے نام کو زندہ رکھے گا۔ ان کی تقریباً دو درجن تصانیفِ نظم ونثر میں اُن کے پہلے مجموعۂ شعری ’’شکستِ شب‘‘ اور ’’نظمانے‘‘ سے صرفِ نظر ممکن نہیں کہ اس نئی صنفِ سخن کے حسنِ ایجاد کا سہرا ان کے سر تھا۔ ڈاکٹر الیاس عشقی بھی جنھیں علمی وادبی حلقے ریڈیو پاکستان کے حوالے سے بہتر جانتے ہیں ایک محقق اور صاحب نظر ادیب کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے زیر نظر شمارہ میں بھی سرمد کی رباعیات کے اردو تراجم پر اُن کا محققانہ تبصرہ اُن کی وسعتِ مطالعہ اور نقد ونظر کی صلاحیتوں کا مظہر ہے یہی غالباً اُن کی آخری تحریر ہے۔

شوکت صدیقی ہمارے ایسے ناول نگار تھے جن کی بصیرتِ فکر اور بلاغتِ نظر سے اُن کی قابلِ رشک فن کارانہ عظمت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اہلِ وطن ‘‘خدا کی بستی’’، ‘‘تیسرا آدمی’’، ‘‘اندھیرا اور اندھیرا’’ اور ‘‘راتوں کا شہر’’ جیسی ناول وافسانہ کی صنفِ ادب میں لازوال تحریروں کو کبھی نہ بھلاسکیں گے ‘‘خدا کی بستی’’ اور ‘‘جانگلوس’’ کی ٹیلیوژن پر ڈرامائی تشکیل نے شوکت صدیقی کے نام کو زندۂ جاوید بنادیا ہے۔ وہ عوام کے دکھ درد خصوصاً معاشی مسائل کی سحر انگیز عکاسی کے ماہر تھے۔ قلم کی ایسی طاقت اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو ودیعت فرماتا ہے وہ خوش نصیب ہوتے ہیں اور زندۂ جاوید بھی۔

اسی کہکشاں کا ایک ستارہ منیر نیازی بھی تھے جو اپنی شخصیت اور فن کے اعتبار سے منفرد کہے جاسکتے ہیں۔ منیر حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے اُس عہد کی۔ ناقابلِ فراموش یادگار تھے جس میں ناصر کاظمی، انتظار حسین، انجم رومانی، شہزاد احمد اور احمد مشتاق وغیرہ نمایاں اہلِ قلم تھے۔ منیر نیازی کا پہلا شعری مجموعہ ‘‘تیز ہوا اور تنہا پھول’’ شائع ہوا تو اُس کے بعد سے ان کی شناخت کے خدوخال اور واضح ہونا شروع ہوئے اور یہ سفر جب نوے کی دہائی میں ‘‘کلیاتِ منیر’’ کی اشاعت پر منتج ہوا تو وہ شہرت کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے شہرت کی اس معراج تک پہنچنے میں اُن کے اُن گیتوں اور غزلوں کا بنیادی کردار ہے جنہیں نسیم بیگم، نور جہاں اور مہدی حسن جیسے عظیم فنکاروں نے نغمہ و موسیقی کے سحر انگیز زیروبم میں ڈھال کر امر بنادیا۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۷ء)

اُردو۔۔۔ مخالفوں اور منافقوں کے درمیان

ایک خبر نے جو صرف چند ہفتے قبل اخبارات کی زینت بنی۔۔۔ ''گرمیِ نشاطِ تصور'' کو اس طرح مہمیز کیا کہ دل باغ باغ ہو گیا۔ وطن عزیز میں اُردو کے نفاذ کا مژدۂ جانفزا اور وہ بھی معتبر ترین سرکاری سطح کے حوالے سے یعنی ۱۹۷۳ء کے آئین میں پندرہ سال کی مدت ۱۹۸۸ء میں ختم ہونے اور مزید اٹھارہ یا انیس برس تک معرض التواء میں رہنے کے بعد کابینہ کی ایک کمیٹی نے آخرِ کار اُن تمام تجاویز و سفارشات کا جائزہ لیا جو اُردو کو سرکاری حیثیت عطا کرنے کے ضمن میں اب تک ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزر چکی ہیں تا کہ کابینہ کے آئندہ اجلاس میں انہیں حتمی منظوری کے لیے پیش کر دیا جائے۔ اب تک منصۂ شہود پر آنے والے تمام اقدامات میں یہ تازہ ترین اقدام سب سے زیادہ امید افزاء بلکہ یقین افروز نظر آیا اور وہ اس لیے کہ اس کمیٹی کو یہ فریضہ سونپنے کے احکام جناب وزیر اعظم نے خود صادر فرمائے۔ اس کے باوجود ایک مسلمہ آئینی شق پر سالہا سال گزر جانے کے باوجود عملدر آمد نہ ہونا خود ہیئت مقتدرہ کے نظام ترجیحات میں آئین کے تقدس سے برملا اغماض کی سنگین اور نا قابل رشک مثال ہے۔ اردو کے سرکاری و دفتری زبان کے طور پر رائج کے جانے کے لیے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے وساتیر میں بھی متعلقہ مشمولات سے انحراف کیا گیا، جواب ہماری ملکی تاریخ کا ایک تنفر آفریں باب بن چکا ہے۔ بہر حال تازہ صورت حال نے ایک بار پھر رجائیت کا جواز مہیا کیا۔ ملکی وساتیر کی تاریخ میں یہ اختصاص صرف ۱۹۷۳ء ہی کے آئین کو حاصل ہوا کہ آرٹیکل ۲۵۱ کے ذریعہ قومی پارلیمان نے مکمل اتفاق رائے سے طے کیا کہ

(۱) اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور آئندہ پندرہ برس میں اس کے سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال میں لائے جانے کے لیے قطعی اور حتمی اقدامات کئے جائیں گے۔

(۲) تاہم اس مدت میں اردو کے مکمل نفاذ تک انگریزی پر بقدر ضرورت انحصار کیا جا سکے گا۔

(۳) اردو کی قومی حیثیت کو ہدف تعرض بنائے بغیر کوئی صوبائی مجلس قانون ساز قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کی تدریس، ترویج اور استعمال کے لیے قانون سازی کر سکتی ہے

ان آئینی تعینات کے بعد کسی نوع کے اختلاف کی ہر ممکنہ گنجائش ختم ہو چکی تھی بایں ہمہ اردو کے نفاذ کا عمل منافقانہ رویوں کا شکار بنا رہا، تاہم کچھ ایسے اقدامات کئے گئے جو متعینہ مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے صدر نشیں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم تھے، چنانچہ انگریزی سے اردو میں تراجم اور اصطلاحات سازی کے عمل کا آغاز ہوا۔ لغات کی تدوین کے ساتھ ساتھ دفتری عمّال کی تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا بلکہ اس کام کا آغاز تو پنجاب میں سردار عبدالرباب نشتر مرحوم کی گورنری کے عہد میں سرکاری طور ''مجلسِ زبان دفتری'' کے قیام کے ساتھ ہی ہو چکا تھا جس کے پہلے معتمد حکیم احمد شجاع مرحوم تھے اور اسّی کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں راقم الحروف کو بھی معتمد کی حیثیت سے فرائض انجام دینے کا شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ اسی دور میں صوبہ کے تمام اضلاع میں ڈپٹی کمشنر صاحبان کی سربراہی میں نفاذِ اردو کی مجالس قائم کی گئیں اور صوبائی سطح پر نیز اضلاع میں نہایت سبک رفتاری سے پیشرفت ہوئی۔ اصلاحات کے استناد کا کام دفتری لغات کی ترتیب و تدوین۔ اردو مختصر نویسی کی تربیت اردو ٹائپ رائٹر کے تیز تر استعمال کا مسلسل عمل مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ اس سے قبل ۱۹۵۹ء میں جسٹس (ریٹائرڈ) محمد شریف کی سربراہی میں نفاذ اردو کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے ایک کمیشن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا اور مجلس ترقی ادب لاہور نے اپنی مطبوعات کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو بیش بہا ذخیرہ مہیا کرنے کا بیڑہ اٹھایا نیز اردو ترقیاتی بورڈز کے ذریعہ ایسے اقدامات کئے گئے اور مرکزی و صوبائی پبلک سروس کمیشنر کے ذریعہ مقابلے کے امتحانات میں انگریزی کے متبادل کے طور پر اردو کے اختیاری استعمال کے لیے راہ ہموار کرنے کی مساعی کی گئیں۔ اعلیٰ عدالتوں میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کے عدالتی زبان کے طور پر استعمال کے

محرکات وضع کیے گئے۔ اس سلسلہ میں تحریک آزادی کے زعماء پروفیسر عبدالستار خیری اور ڈاکٹر عبدالجبار خیری کے خانوادے کے چشم و چراغ اور پاکستان کے معروف قانون داں جناب حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ نے بھرپور قانونی چارہ جوئی کے بعد یہ استحقاق حاصل کر لیا کہ وہ پاکستان کی تمام عدالتوں بشمول عدالت ہائے عالیہ و عظمیٰ میں اردو کو ذریعۂ تحریر و تقریر کے طور پر استعمال کریں گے کہ یہ زبان آئین کے تحت ملک کی قومی زبان قرار دی جا چکی ہے۔ چنانچہ خیری صاحب کی اس تاریخی کامیابی کے بعد اب ملک کی کوئی بھی عدالت عالیہ ہو یا عدالت عظمیٰ اردو نہایت سُرعت کے ساتھ ہمارے وکلاء کا ذریعہ اظہار بنتی جا رہی ہے۔

اس تمام پس منظر میں ایک بے جواز تضاد جو سامنے آیا ہے وہ یہ کہ ایک طرف تو آئینی و انتظامی ضمانتیں مہیا کی جا رہی ہیں دوسری طرف عملاً صورتحال یہ ہے کہ قیام پاکستان کی چھ دہائیاں مکمل ہونے کو ہیں لیکن اردو نہ تو عملاً قومی منزلت پر فائز ہو سکی ہے اور نہ دفتری نظام میں وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال میں آسکی ہے حالانکہ اس حقیقت سے کسی کا انکار نہیں کہ یہ تحریک پاکستان کی زبان تھی اور قیام پاکستان کے عوامل میں ایک اہم اور بنیادی عنصر بھی۔ اسی سبب ۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ نے نہایت واضح اور دوٹوک الفاظ میں اعلان فرما دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان کا شرف صرف اور صرف اردو کو حاصل ہوگا کہ یہی قومی اتحاد و استحکام کی ضامن ہے۔ بایں ہمہ حکومت میں انگریزی اقتدار و روایات کے ہاتھوں اپاہج ہو جانیوالے اذہان اور حکومت سے باہر عصبیت زدہ اور مفلوج الفکر عناصر نیز وہ سیاسی گماشتے جنہوں نے کبھی اس مملکت کے نظریاتی تشخص کو تسلیم نہیں کیا ہمیشہ اردو کی راہ میں مزاحم بنے رہے۔ مخالفت اور منافقت کی یہ قوتیں آج بھی اس خرد باختہ دلیل پر انحصار کر رہی ہیں کہ اردو چونکہ پاکستان کے کسی بھی صوبہ کی زبان نہیں ہے اس لیے قومی زبان قرار پانے کا استحقاق نہیں رکھتی حالانکہ برصغیر کی تاریخ شاہد ہے کہ اس زبان کو ہمیشہ مسلم تہذیب و ثقافت اور آدابِ معاشرت کا نمائندہ قرار دیا گیا اور اب یہ زبان بین الاقوامی سرحدیں عبور کر کے عالمی زبانوں میں 'رابطہ کی زبان' کے طور پر ایک قابل رشک مقام حاصل کر چکی ہے۔

اس ضمن میں سب سے دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے میں علمی تحقیق کی بنا پر اہلِ دانش یہ ثبوت فراہم کرتے رہے ہیں کہ اردو کا آغاز ان کے صوبے سے ہوا۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد اردو کو دفتری زبان کے منصب پر فائز بھی کر چکے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کا مقالہ ''پنجاب میں اردو''، جو ہماری ادبی و لسانی تحقیق کا سنگ میل ہے ثابت کر چکا ہے کہ اردو کے آغاز و ارتقاء کا سہرا پنجاب کے سر ہے۔ پیر حسام الدین راشدی کی تحقیق کی روشنی میں یہ اعزاز سندھ کو حاصل ہے بلکہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ''اردو اور سندھی کے روابط'' اس نقطہ نظر پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صابر اپنی تحقیق سے ثابت کرتے ہیں کہ اردو کا مولد و منشاء بلوچستان ہے جہاں مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ عربی و فارسی کے لسانی اثرات اس خطۂ ارضی میں پہنچے اور مقامی زبانوں سے اختلاط کے نتیجہ میں جس زبان کو نشوونما ملی وہی اردو کہلائی۔ صوبہ سرحد کے حوالے سے فارغ بخاری کا تحقیقی دعویٰ ہے کہ اردو نے اس کوہستانی خطہ میں جنم لیا جہاں پشاور نے اسے اپنی آغوش میں پال پوس کر بڑا کیا کیونکہ حقیقت میں 'ہندکو' اردو کی ابتدائی شکل ہے۔ شمالی علاقہ جات کے بارے میں بھی جو تحقیق منظر عام پر آئی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کثیر اللسانی خطہ میں بھی اردو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔ غرض اردو کی جڑیں پاکستان کے چپہ چپہ میں پیوست ہیں تو پھر کیوں اس ملک میں اردو کو اس کے جائز مقام و منصب سے محروم رکھا جا رہا ہے؟

کابینہ کی کمیٹی کا تازہ اقدام بھی ماضی کی دیگر مساعی کی طرح نقش بر آب بنتا جا رہا ہے کہا گیا تھا کہ کمیٹی کی اس رپورٹ پر کابینہ آئندہ اجلاس میں فیصلہ کر لے گی لیکن کابینہ کے اس مدت میں کئی اجلاس ہو جانے کے باوجود یہ معاملہ زیر غور نہیں آیا۔ کیا اس صورتحال کے پس منظر میں کوئی سازش کارفرما ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یقیناً ہے کیونکہ اردو کو دفتری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے لیے جو کام ہونا چاہئے تھا وہ ہو چکا ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے دفتری قواعد و ضوابط اور احکام و ہدایات کی جملہ کتب انگیزیزی سے اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں عمال حکومت کے دفتری امور کے اردو میں انجام دینے سے متعلق بار بار تربیتی کورس مکمل کرائے جا چکے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ اچانک

ایک صبح نوخیز کے ساتھ ہی اردو کے مکمل نفاذ کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ یہ اقدام انگریزی زبان سے کسی مخاصمت پر محمول نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ انگریزی ایک بین الاقوامی ذریعہ اظہار کے طور پر ہمارے لیے ناگزیر ہے اور علومِ جدیدہ میں مہارت و آگہی کے لیے موثر وسیلہ بھی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنے قومی تشخص کو پس پشت ڈالتے ہوئے قومی تقاریب میں بھی انگریزی زبان کو وسیلۂ اظہار بنانے پر فخر محسوس کریں۔ یہ طرزعمل تو ہماری قومی غیرت کے منافی ہے۔ ہندوستان میں جہاں اردو کو مسلم تہذیب و معاشرت کا ترجمان قرار دے کر بدترین تعصب و تنگ نظری کا ہدف بنایا گیا وہاں بھی آج بہار اور یوپی میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ جنوبی ریاستوں اور مہاراشٹر میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جا چکا ہے، یہی نہیں ۱۹۹۸ء میں حیدر آباد (دکن) میں مولانا آزاد میموریل یونیورسٹی کے قیام ہی سے سائنس اور دیگر تمام مضامین میں تعلیم اردو میں دی جا رہی ہے لیکن افسوس کہ پاکستان میں اردو مسلسل سازشوں کا شکار ہے:

از دشمناں بُرند شکایت بہ دوستاں
چوں دوست دشمن است شکایت کجا بُرم

(اپریل۔ جون ۲۰۰۷ء)

ادب اور اظہارِ رائے کی آزادی

بعض الفاظ اپنے معنوی اور عملی 'برعکس مضمرات' کے باوجود اس درجہ خوش آہنگ اور سحر آفریں ہوتے ہیں کہ دانش وفراست کے تمام دعاوی مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قبولِ عام اور شہرت دوام کی قوتیں انہیں ناقابل تسخیر بنا دیتی ہیں اور اس کے باوجود کہ ناقابل تردید تجربات اُنہیں محدود ومشروط کر دینے کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ اپنی عالمگیریت اور جبروتی قوت برقرار رکھتے ہیں اِنہیں الفاظ میں ایک لفظ 'آزادی' ہے جس کے جلال و جمال سے متاثر ہو کر اختر شیرانی مرحوم کہہ اُٹھے تھے کہ:

عشق وآزادی بہارِ زیست کا سامان ہے　　عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی　　لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

انسانی حقوق کے ضمن میں آزادی کا تصور نہ صرف سرفہرست ہے بلکہ اسے ازلی اور ابدی حیثیت بھی حاصل ہو چکی ہے زندگی کا ہر شعبہ چاہے وہ سیاست ہو یا معیشت' ادب ہو یا ثقافت حُریتِ فکر وعمل کا داعی ہے، اس ضرورت کا شدید احساس اُس وقت بھی ہوا جب انسانی حقوق کے عالمی اعلان کو مدوّن کیا گیا اور آرٹیکل ۱۹ کے ذریعہ اظہارِ رائے کی آزادی کی ضمانت دی گئی یہی ضمانت انسانی حقوق کے یورپی کنونشن کے آرٹیکل ۱۰ کے ذریعہ بھی مہیا کی گئی۔ اس طرح اظہارِ رائے کی آزادی کو بین الاقوامی قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ لامحدود اور غیر مشروط آزادی کا تصور قدیم یونانی تصور جمہوریت کا مرہونِ منت ہے۔ تاہم بیشتر ممالک بالخصوص مغرب میں عملی تجربات کی روشنی میں مطلق آزادی کے تصور کو محدود ومشروط کر دینے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس ضمن میں قانون سازی کا عمل متحرک کیا گیا۔ اس کے باوجود کہ امریکی آئین میں آزادیٔ رائے کے حق کی قطعیت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن بعض حالتوں میں اسے محدود کرنے کی ذمہ داری حکومت پر

ڈال دی گئی ہے جیسا کہ صدر روزویلٹ کے درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

‘‘نراجیت کے استیصال سے تقابل کی صورت میں ہر دوسرے سوال کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ نراجیت پسند شخص انسانیت کا دشمن ہے وہ بنی نوع انسان کا دشمن ہے۔ اس کا جرم ہر دوسرے جرم سے زیادہ سنگین ہے۔ اگر کوئی تارکِ وطن نراجیت پسند ہے تو اسے ہمارے ساحلوں پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور کسی بھی ایسے اخبار اور جریدے کو خواہ اس کا تعلق امریکہ سے ہو یا باہر سے اس ملک میں اشاعت کی ہرگز اجازت نہیں ہونا چاہیے جو نراجی خیالات کی تشہیر کرتا ہو۔’’

یہی نہیں بلکہ مغربی دنیا نے ماضی ء بعید سے لیکر ماضی ء قریب اور عہد حاضر تک مختلف آزادیوں پر قدغن عائد کرنے کے اقدامات کیے جن میں نازی جرمنی میں ‘‘یہودیوں کے قتل عام’’ سے متعلق قانون سے لیکر جس کے تحت قتل عام سے انکار قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا مذہب کی تنقید و تنقیص، بغاوت، نسل پرستی دہشت گردی اور صحافتی احتساب جیسے قوانین کو پوری قوت سے نافذ کیا لیکن دوعملی اور منافقت کو بدستور اپنا شعار بنائے رکھا دوسرے مذاہب کی اہانت وتوہین سے نہ صرف اغماض برتا گیا بلکہ ان جرائم کے مرتکب افراد اور اداروں کو ترغیباً نوازا گیا۔ مشرقی اقدار و روایات اور اخلاقیات کی تکذیب کرنے والوں کی سرپرستی کی گئی چنانچہ اس تناظر میں ہمارا ادب بھی اس یلغار کی زد میں آ گیا۔

تاریخ عالم میں ‘خطبہ ءعرفات’ حضور اکرمؐ کا عطا کردہ بہت بڑا ‘منشور انسانیت’ ہے جو فکر و عمل کی ایسی آزادی کی ضمانت فراہم کرتا ہے جو نہ صرف فطرت سے ہم آہنگ ہے بلکہ مہذب انسانی معاشرہ میں حقوق و فرائض کے تعین سے متوازن زندگی کے خدوخال مرتب کرتا ہے اور ادب ہی نہیں ابلاغ واظہار کی ہر صنف کو فطری حدود و قیود میں رہ کر تخلیق و ایجاد کے بے پناہ امکانات عطا کرتا ہے۔ مختلف زبانوں میں لکھا جانے والا ادب اپنی جغرافیائی حدود میں نمو پذیر ہونے والی تہذیب و معاشرت’ رسوم و رواج اور انسانی رویوں کا ترجمان ہوتا ہے اور اُس پر ان بنیادی آدابِ معاشرت اور اخلاقی تعینات کا احترام لازم ہوتا ہے جو مسلمہ عالمگیر انسانی اقدار سے

متصادم نہ ہوں۔ چنانچہ یہیں سے جغرافیائی حدود و قیود سے ماورا عالمی ادب وجود میں آتا ہے جسے ہم انسانی وحدت کا آئینہ دار کہہ سکتے ہیں۔ فکر کی آزادی کو لوح و قلم کے توسط سے قارئین تک پہنچانا ادیب کا بنیادی حق ہے لیکن اسے بقول اقبال یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ:

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے   موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

* * *

بے لگام فکری آزادی کا ابلاغ ادب میں نراجیت کو جنم دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ادب معاشرہ میں تہذیب نفس کے فرائض انجام دینے کی بجائے ان اقدار کی شکست و ریخت کا سبب بن جاتا ہے جو معاشرے میں اخلاقی نظم و ضبط کی ضامن ہیں۔ جنس کے حوالے سے ہمارا افسانہ ماضی و حال کے تناظر میں ایک حد تک اخلاق باختہ رویوں کا مظہر بنا رہا ہے جس نے غیر محسوس طور پر معاشرہ میں ایسے کرداروں کو جنم دیا جنہیں ننگِ انسانیت ہی کہا جا سکتا ہے۔ معاشرتی رشتوں کی تقدیس بری طرح پامال ہوئی اور توجیہہ یہ پیش کی جاتی رہی کہ ادب معاشرتی حقیقتوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اخلاق باختگی کا یہ سیل بے مہار ہماری اصنافِ شاعری پر بھی حملہ آور ہوا جس کے نتیجہ میں ابتذال نے ایک حد تک لطافتِ شعری کو مسخ و مجروح کیا لیکن ایک اور بڑی یلغار نے شاعری کو پراپیگنڈے کے اجزائے ترکیبی کے ذریعہ رمزیت و اشاریت اور تشبیہ و استعارہ کے حسن سے محروم کر دیا۔ چنانچہ پیرائیہ اظہار کی اس تبدیلی نے جسے آزادی رائے کے استعمال کا نتیجہ قرار دیا گیا ایک ادیب یا شاعر اور عملی سیاستدان کے فرق کو مسمار کر کے رکھ دیا حالانکہ جگر مرحوم نے کہا تھا:

اُن کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں   میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

* * *

بلاواسطہ طرز اظہار سے جہاں لطافتِ شعری پر ضرب پڑی وہیں ہماری شعری روایت کا حسن بھی متاثر ہوا ہے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک کی بنیادوں میں اگر جھانکا جائے تو ایک ایسا منظر سامنے آ جاتا ہے جس نے ہمارے ادیبوں کے اذہان کو اجنبی اقدار و نظریات کی طرف راغب کیا اور ان کے شعور کو طبقاتی کشمکش کے شاخسانے سے دوچار کر دیا ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب

قلمکار خود نظریاتی افلاس کا شکار ہو یا اپنی معاشرتی اقدار سے نا مطمئن ہو۔ یہ ہر دو رویے خود اپنی شناخت کی نفی یا تکذیب پر منتج ہوتے ہیں اس اعتبار سے اگر معروضی تجزیہ کیا جائے تو اقبال حقیقی ترقی پسندی کے اوصاف سے بہرہ مند نظر آتے ہیں انہیں اپنے نظریہء حیات پر کامل اعتماد تھا اور وہ اس یقین سے سرشار تھے کہ ان کے نظریے نے جس آزادی اظہار کی ضمانت فراہم کی ہے اس کے حسن کو بعض فطری تحدیدات نے اسی طرح دوبالا کیا ہے جس طرح ضروری قطع و برید کے ذریعہ ایک باغبان چمن آرائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ انہوں نے اجنبی یا بدیسی نظریات کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرتے ہوئے اُس حقانی نظامِ حیات کی عملیت کو آشکار کیا جو ان کا اپنا اثاثہء فکر تھا، چنانچہ یہ بنیاد فراہم کر کے اقبال نے نژادِ نو کو جس حریتِ فکر و عمل کا پیغام دیا وہ ''آئین کی پابندی'' سے مشروط ہے اور ذہنی افلاس و مرعوبیت کی جگہ خود اعتمادی و تفاخرِ ملی کے جذبات سے عبارت۔

اس گفتگو سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ادب کو تنوعات فکر سے محروم کر کے یکسانیت کا شکار کر دیا جائے بلکہ مُدعا یہ ہے کہ جس طرح فن کے سانچوں میں ڈھل کر کوئی بھی شے حسن صورت کا شاہکار بن جاتی ہے اسی طرح اظہار رائے کی آزادی کو اخلاقی، نظریاتی اور معاشرتی مبادیات سے مشروط کر کے ادب کو نئے آفاق کی وسعتوں سے ہمکنار کیا جائے، چنانچہ ادب میں یہ رویہ ہماری شناخت کا بھی ضامن ہوگا اور بقا کا بھی۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۷ء)

‘ چراغ تیز ہوا نے بجھا دیئے کیا کیا ’

تیز ہوا نے ۲۱۔ اگست ۲۰۰۷ء کو جس چراغ کو بجھا دیا اُسے وقت کے نفسِ ناطقہ نے خود ’’اردو ادب کا دیا‘‘ ٹھہرایا تھا جس کے بعد ہر سمت سے تاریکیوں کی ایک یلغار دکھائی تو دیتی ہے لیکن روشنیوں کا وہ ورثہ جو قرۃ العین حیدر نسلِ نو کو سونپ گئی ہیں ایک جاوداں حقیقت ہے۔ اس ورثہ کی عہد بعہد منتقلی ہی ادبی جہتوں کے ارتقا کی ضامن ہے جس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ برصغیر میں سیاسی وسماجی آویزشوں کے پس منظر کے زیر اثر اردو ادب کی جس اہم صنف ’ناول‘ کا نذیر احمد، سرشار، شرر اور رُسوا جیسی ہستیوں کے ہاتھوں انیسویں صدی میں آغاز ہوا تھا بالکل اسی طرح یورپ میں ناول کی صنف کا آغاز ایک متوسط الحال طبقے کے وجود میں آنے نیز صنعتی انقلاب اور انقلابِ فرانس جیسے معاشی و معاشرتی تغیراتی عوامل کے مرہونِ منت ہے۔ بیسویں صدی میں ہمارے ناول کو فنی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے آگے بڑھانے کا سہرا پریم چند کے سر ہے۔ جسے جنگ عظیم کے بعد سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور عزیز احمد جیسے اہل قلم نے نئی وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار کیا، چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آزادی کے بعد خواجہ احمد عباس، جیلانی بانو اور خود قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ دیگر فن کاروں نے اس روشنی کو مدھم نہیں ہونے دیا جن میں بالخصوص راجندر سنگھ بیدی، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، احسن فاروقی، نسیم حجازی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، انور سجاد اور شوکت صدیقی شامل ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ اب یہ مستقبل کے قلمی رویوں پر منحصر ہے کہ جدید حسیّت اور رومانوی حقیقت پسندی کی جو شمعیں عینی آپا اپنی تحریروں کے ذریعہ روشن کر گئی ہیں اور جس تخلیقی طلسم کے حیطۂ اثر میں آ کر قارئین نسل در نسل سحر آگیں کیفیات سے لذت آشنا ہوئے ہیں انہیں تسلسل عطا کرنے میں ہمارے ناول اور افسانہ لکھنے والے کس حد تک اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں ورنہ اس اداریہ کا عنوان بننے والا حقیقت سے بہت قریب کیفی اعظمی کا شعر ایک خدشے ہی کا غماز

نہیں تنبیہ کا اشارہ بھی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی نگارشات کا عہد کم وبیش سات دہائیوں پر مشتمل ہے انہیں اہل دانش نے ''اردو ادب کی ورجینیا وولف'' کے خطاب سے نوازا۔ وہ ایک رجحان ساز عظیم مصنفہ قرار دی گئیں اور اگر وہ تہذیب و تاریخ کے ایک مخصوص شعور کی نمائندہ اور ایک مسلمان مہذب و اقدار شناس خانوادے کی رکن نہ ہوتیں تو کچھ عجب نہ تھا کہ مغرب کے اجارہ دارانِ سطوت ادب کا نوبل انعام ان کی نذر کرتے۔ بہر حال وہ سفر جس کا آغاز قرۃ العین نے گیارہ سال کی عمر میں نونہالوں کے لئے کہانیاں لکھ کر کیا وہ کم وبیش اُن کی پچاس مطبوعات پر منتج ہوا۔ بچوں کے رسالے ''پھول'' میں ان کا پہلا افسانہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۹ سال کی عمر میں ''میرے بھی صنم خانے'' لکھ کر اردو ادب میں تہلکہ مچا دیا۔ ۲۸ سال کی عمر میں وہ تخلیقی کارنامہ انجام دیا جو تاریخ میں سنگ میل بن گیا۔ ''آگ کا دریا'' نے اردو ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیا جس نے لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو مسخر کیا۔ یہ مبہوت کر دینے والی تصنیف (ناول) جوان کی خیرہ کن ذہانت کا شاہکار ہے ۱۹۵۹ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں انہوں نے تقسیم ہند کو تین ہزار سال پرانی تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں لندن ٹائمز کا تبصرہ اس ناول کے مقام و منزلت کا اس طرح تعین کرتا ہے

> ''آگ کے دریا کی اردو زبان میں وہی حیثیت ہے جو ہسپانوی ادب میں ناول ''تنہائی کے سو برس'' کی ہے''

ان کی فکری گہرائی، حسیاتی ترفع، تہذیبی و تاریخی شعور، علم و آگہی اور ذوق جمال ان کی تخلیقات کے نمایاں خطوط ہیں۔ تقسیمِ ملک کے نتیجہ میں رونما ہونے والے حادثات اور سماجی رویوں میں سرد مہری و بیگانگی پوری دانشورانہ بصیرت اور حسیت کی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ اُن کے ناول میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ''ستاروں سے آگے'' اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا پھر اس کے بعد عشق کے جتنے امتحاں آئے ان میں وہ کامران و سرخرو رہیں۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے اور ایک درجن ناول ان کی ادبی زندگی کو نقشِ دوام بخش گئے اور آج وہ عظیم ترین ناول نگار جو جامعہ ملیہ

اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہی ہے اُس کی زندگی دنیا بھر کے اعترافاتِ عظمت سے عبارت ہے۔ ہندوستان کے دو ارفع ترین اعزازات ''پدماشری'' (۱۹۸۵ء) اور ''پدم بھوشن'' (۲۰۰۵ء) کے علاوہ ساہیتہ اکادمی ایوارڈ، اُردو اکادمی بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور غالب ایوارڈ افسانہ و ناول کی دنیا میں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی اسنادِ اعتراف کہی جاسکتی ہیں۔

قرۃ العین جنہیں والہانہ محبتوں نے عینی آپا کا لقب عطا کیا اس اعتبار سے انتہائی خوش قسمت بھی تھیں کہ انہیں والدین کی طرف سے دانش وحکمت اور فکر وفن کی مخصوص صلاحیتیں وراثت میں ملیں ان کے والد سجاد حیدر یلدرم ان ہستیوں میں تھے جنہیں اردو ادب میں افسانہ نگاری کا سرخیل کہا جاسکتا ہے اور ان کی والدہ نذر سجاد حیدر بیسویں صدی کے اوائل میں ہم عصر افسانہ نگاروں میں اپنی شناخت بنا چکی تھیں۔ لکھنو کی تہذیب وثقافت نے ان کی تحریروں کو ایک مخصوص رنگ عطا کیا اور علی گڑھ جہاں انہیں ولادت کا شرف حاصل ہوا ان کی علمی کامرانیوں کا نقطہء آغاز بن گیا یہی وجہ ہے کہ وہ چنگاری جوان کے دل ودماغ میں روشن ہوئی اسی کا فیضان ہے کہ آج برصغیر میں مسلم تہذیب کی تاریخ ان کے ناولوں کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ ان کا نام تک ان کی پیدائش کے وقت فارسی زبان کی معروف ایرانی مصنفہ قرۃ العین طاہرہ کے نام سے ماخوذ ومعنون ہے۔ اُن کی اُردو، ہندی اور انگریزی زبانوں پر ماہرانہ گرفت، انگریزی ادب، آثار قدیمہ، کلاسیکل موسیقی، مصوری اور تاریخ سے بے پناہ لگاؤ ان کی وراثت کا فیضان ہے انہیں بجا طور پر اپنے عہد کی تہذیب وثقافت کا ضمیر تصور کیا جاتا ہے انہوں نے ''آگ کے دریا'' کا خود انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جبکہ ان کے کئے گئے دیگر اہم تراجم بھی ان کی عالمگیر شہرت کے ضامن بنے جن میں علی سردار جعفری کی معیت میں غالب پر ان کا انگریزی زبان میں اہم علمی کام بھی شامل ہے۔ انہوں نے متعدد عالمی یونیورسٹیوں میں بطور مہمان سپیکر لیکچر بھی دیئے جن میں کیلیفورنیا، شکاگو، وسکونسن اور اریزونا وغیرہ کی جامعات نمایاں ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک پاکستان میں قیام پذیر رہیں اس دوران انہیں سرکاری وغیر سرکاری زندگی کے مختلف النوع تجربات سے بھی گزرنا پڑا، انہیں میں ۱۹۵۹ء میں ''آگ کا دریا'' منظر عام پر آنے کے بعد کا وہ دل شکن تجربہ بھی شامل ہے جب انہیں ہدف

تنقید بنایا گیا اور مخالفین کی جانب سے پوری کوشش کی گئی کہ ان کے ناول کو متنازعہ بنا دیا جائے۔ یہ دور سیاسی و معاشی شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔

قرۃ العین جامعہ ملیہ دہلی میں پروفیسر ایمریطس کے منصب پر بھی فائز رہیں۔ معروف ادبی نقاد ضمیر علی بدایونی نے انہیں ایک استثنائی (Exceptional) ادیبہ قرار دیا ہے جو عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی پر سبقت رکھتی تھیں اور ارفع جدیدیت کی نقیب ہیں۔ ہمیں آصف فرخی کی اس رائے سے بھی پورا اتفاق ہے کہ اردو فکشن میں عینی کا وہی مقام ہے جو اردو شاعری میں اقبال کا ہے۔ پاکستان میں قیام کے دوران انہوں نے ادب میں بیش بہا افسانے لکھے ان کی تصانیف ''سیتا ہرن''۔ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' اور ''چائے کے باغ'' وغیرہ اس حقیقت کی مظہر ہیں۔ انہوں نے ہندوستان میں ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کو ''گردش رنگ چمن'' (۱۹۸۸) اور ''چاندنی بیگم'' (۱۹۸۹) میں منعکس کیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب جسے عالمگیر پذیرائی میسر آئی وہ ''کار جہاں دراز ہے'' عینی آپا نے اردو فکشن کو نیا رخ دیا اور اس کے معیار کو دنیا کی کسی بھی زبان کے ادب تک پہنچایا ہے۔ ہجرت کا بیکراں اندوہ ان کے ناول اور افسانوں کا بنیادی عنصر ہے اس تجربہ سے چونکہ وہ خود گزریں اس لئے ان کا یہ احساسِ کرب ان کی تحریروں میں روح بن کر سما گیا۔ دوسرا اہم عنصر جمالیات کے حوالے سے ان کا حقیقت پسندانہ رویہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول اور افسانوں کے جو غیر ملکی زبانوں میں تراجم ہوئے انہیں عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی اس کے علاوہ انہوں نے یورپ، روس اور امریکہ میں اپنے مقالات اور لیکچرز کے ذریعہ سامعین کی ایک بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا۔

قرۃ العین حیدر کے عہد میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی چالیس کی دہائی میں جب وہ اپنے معاصرین کے ہجوم میں جن میں سے بیشتر کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اپنی شناخت مستحکم کرنے کے عمل سے گزر رہی تھیں تو انہیں ان معاصرین کے معاندانہ رویوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، ہر چند کہ وہ اس تحریک سے دور دور رہیں لیکن ان پر پھر بھی طنز و تشنیع کے چھینٹے اڑائے گئے۔ عصمت چغتائی ان میں نمایاں تھیں اور وہ جس قدر نمایاں تھیں اسی قدر تضاد ان کے اور عینی آپا کے

نظریات میں پایا جاتا تھا۔ عصمت اور منٹو ادب کو زندگی کی ترجمانی کا حق دینے میں کسی بھی نوع کے حدود و قیود کے قائل نہ تھے جبکہ قرۃ العین کے یہاں احتیاط و توازن کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ قدیم و جدید کے درمیان سفر کرنے والی ایک صاحبِ نظر مسافر تھیں جس کا واضح اشارہ ''کار جہاں دراز ہے'' کے درج ذیل اقتباس سے ملتا ہے:

> ''القصہ عزیزو! اب وقتِ سحر، وقتِ مناجات ہے، دنیا آنی جانی ہے۔ یہ کاغذات بستے میں لپیٹ کر واپس طاق میں رکھ دو، اب طغرۂ شاہی اور مُہر قاضی، خادم شرع جمیل، رسول الثقلین کے بجائے اشٹام پیپر کا زمانہ آیا چاہتا ہے جو دُور کلکتے کے چھاپہ خانوں میں چھپنا شروع ہوگئے ہیں۔'' (اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷ء)

۲۰۰۸ء......زبانوں کا بین الاقوامی سال

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعہ ۲۰۰۸ء کو زبانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا ہے اس طرح دنیا بھر میں بولی جانے والی کم و بیش سات ہزار زبانوں کے لیے یہ خبر ایک مژدۂ جانفزا بھی ہے اور لمحہ فکریہ اس لیے بھی کہ عالمگیریت کا عفریت یک لسانی سامراجیت کو اس کرۂ ارضی کے چپّہ چپّہ پر مسلط کر دینے پر کمربستہ نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کہ تخمیناً دنیا کی ساڑھے چھ ارب آبادی میں صرف چند کروڑ نفوس ایسے ہیں جن کی مادری زبان انگریزی ہے لیکن لگتا یوں ہے کہ سارے جہان پر اس زبان کی حکمرانی ہے، کسی زبان سے تعصب کا رویہ روا رکھنا اگرچہ کسی طرح بھی مناسب نہیں لیکن کسی بھی زبان کی طرح انگریزی زبان کے بھی تہذیبی، ثقافتی اور معاشی و معاشرتی مضمرات ہیں اس لیے اس کا تغلّب دنیا کی دوسری زبانوں اور معاشروں کے لیے نہ صرف ایک چیلنج ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں اولاً تہذیبی تصادم اور آخر کار زبانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے لیے جرم ضعیفی کی سزا بن کر مرگِ مفاجات پر منتج ہوا ہے بہر حال عالمی تنظیم پر امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کی فیصلہ کن لسانی و سیاسی بالادستی سے قطع نظر یونیسکو (اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی و ثقافتی تنظیم) کا یہ اعلان خوش آئند ہے کہ ’’زبانیں افراد کی اجتماعی و انفرادی شناخت اور ان کی پُر امن بقائے باہمی کا لازمہ ہیں، یہ مقامی و عالمی ہم آہنگی کے تناظر میں تسلسل پذیر ترقیاتی عمل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں صرف کثیر اللسانیت کے ذریعہ ہی تمام زبانیں نظام عالمگیریت میں اپنا مقام حاصل کر سکتی ہیں‘‘۔

نظام عالمگیریت کے حوالے سے ہمارے ہی نہیں ترقی پذیر ممالک کے برحق و برمحل تحفظات نہایت واضح ہیں تاہم ہمیں توقع ہے کہ اقوام متحدہ چونکہ اپنے موثر و فعال ذیلی اداروں بالخصوص یونیسکو کے حوالے سے اپنی پیشرو تنظیم لیگ آف نیشنز پر برتری کی حامل ہے، اس لیے کثیر اللسانیت

اور ثقافتی تنوع کو نصب العین قرار دے کر عالمی سطح پر اس حقیقت کا ادراک سال ۲۰۰۸ء کے دوران عام کیا جائے گا کہ عالمگیریت کے پسِ پردہ طاقتیں دنیا بھر میں زبانوں کا حلیہ بگاڑنے پر تلی بیٹھی ہیں، انگریزی زبان کی بالادستی کو مستحکم تر کرنے کے لیے سات ہزار سے زائد زبانوں کو پس منظر میں دھکیلا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں یہ زبانیں دنیا کے معاشی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور ادبی منظر نامے سے غائب ہو رہی ہیں زبان صرف اظہار خیالات کا وسیلہ نہیں ہوتی بلکہ یہ خیالات کی تشکیل کی بھی ضامن ہوتی ہے جب ایک زبان مرتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص تہذیب و ثقافت اور طریقِ زندگی بھی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ تہذیبی تنوع لسانی تنوع کا مرہونِ منت ہوتا ہے چنانچہ ایک زبان کی برتری کے نتیجہ میں عالمی تمدن کی کثیر الجہتی کو نقصان پہنچتا ہے اس لیے مقامی زبانوں کا تحفظ مقامی ثقافتوں کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ افراد و اقوام کے درمیان ابلاغ اور باہمی تفہیم کی ناگزیریت کو تسلیم کیا جائے۔ انسانیت کے لسانی اور ثقافتی ورثے کے تحفظ نیز ان زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات کو توسیع دی جائے جو اس ورثے کے اجزائے ترکیبی قرار پاتے ہیں یہی نہیں بلکہ اس خطرے کا تدارک کرنا بھی لازم ہے جو ابلاغ عامہ کے حوالے سے عالمگیریت اور دنیا کی دوسری زبانوں کی قیمت پر یک لسانی یلغار کے باعث لسانی تنوع کے عمل کو درپیش ہے یہی یلغار علاقائی زبانوں کی نیست و نابود پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔

اس پُرخطر تناظر میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کثیر اللسانیت کو فروغ دینے کے لیے بین الاقوامی سطح پر سماجی، فکری اور ابلاغیاتی فضا پیدا کریں نیز کثیر اللسانی تعلیم کے ذریعہ کسی بھی مادری زبان سے وابستگی کے قطع نظر تمام شہریوں کو حصول علم کے مواقع فراہم کیے جائیں اور کثیر اللسانیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے حکمت عملی وضع کی جائے۔ اس ضمن میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ قدیم و جدید بڑی تہذیبوں کی زبانوں کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کے ذریعہ ادبی تعلیم کے تحفظ و ارتقا کو بھی یقینی بنایا جائے اس ضمن میں بلاشبہ ایک وسیع البنیاد علمدرآمدی میکانزم کی ضرورت پیش آئے گی جس کا اہتمام رکن ممالک کر سکتے ہیں اور جس کے لیے نیک نیتی اور اخلاص ناگزیر ہیں۔ جن کا اگر فقدان نہیں تو قحط ضرور نظر آتا ہے۔ اقوام متحدہ اگر یونیسکو کے ذریعہ

ایک موثر رابطہ کاری کا نظام قائم کرسکتی ہے تو مثبت نتائج کی بھی توقع بے محل نہ ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک جامع حکمتِ عملی کا نفاذ عجائب گھروں، لائبریریوں اور دستاویزی مراکز کے توسط سے ممکن بنایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ ادارے ثقافتی ورثے کے امین بھی ہیں اور معلوماتی نیٹ ورکس تک رسائی کے متحمل بھی ہوسکتے ہیں، یہی نہیں بلکہ تراجم کے وسائل و ذرائع کی توسیع کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کے ابلاغ و تفہیم کے عمل کو بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے

یونیسکو نے مادری زبانوں کو تحفظ فراہم کرنے اور ان کے فروغ و ارتقا میں کردار ادا کرنے کا بیڑہ اگرچہ ۱۹۹۹ء سے اٹھایا ہوا ہے لیکن اس ضمن میں جہاں ایک طرف سرد مہری کے رویے سامنے آئے ہیں، وہیں دوسری طرف بڑی طاقتوں کی عیارانہ سیاست نے بھی مطلوبہ مقاصد کے حصول میں موانع پیدا کیئے ہیں۔ یونیسکو کے ریکارڈ میں اس حقیقت کے باوجود کہ اردو عالمی سطح پر کثرتِ استعمال کے حوالے سے ایک ارب سے بھی متجاوز افراد کے درمیان بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اسے ’ہندوستانی‘ کا نام دیا گیا ہے جس کی ناقابلِ رشک وجوہ برصغیر کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ اُردو شمالی ہندوستان اور پاکستان کی فطری زبان ہے اور تمام جنوبی ایشیاء میں اس لیے مقبول ہے کہ اسے ایک بہت بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو روزمرہ کے معمولات، معاشرتی ضرویات و روابط اور کئی نسلوں کے مذاق فطری کی ترجمان بن چکی ہے اور یہ عملی تسلسل صدیوں پر محیط ہے۔ بھارت کے مشہور ادیب، دانشور اور نقاد شمس الرحمان فاروقی نے اپنی کتاب ’’اردو کی ابتدائی تاریخ‘‘ میں اردو کے ارتقاء کو کم و بیش پندرہ علاقائی زبانوں کا مرہون منت قرار دیا ہے لیکن پنجابی اور سندھی سمیت انہوں نے پاکستان کی کسی بھی علاقائی زبان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اب تک منظر عام پر آنے والی لسانی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ اردو کی نشو ونما میں پاکستان کے تمام خطوں میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں کا زبردست کردار ہے بلکہ اس ضمن میں کیئے جانے والے دعادی سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کی جڑیں پاکستان کی علاقائی زبانوں میں پیوست ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے ’’پاکستان میں اردو‘‘ کے زیر عنوان پانچ جلدوں پر مشتمل تحقیق شائع کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور اب یہ بات پایۂ ثبوت کو

پہنچ چکی ہے کہ سندھ، بلوچستان، پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد اور شمالی علاقہ جات اردو کے حوالے سے تاسیسی اہمیت کے حامل ہیں۔

یونیسکو کے ریکارڈ میں اردو کی جگہ ''ہندوستانی'' کے لفظ کا مزید ایک پس منظر یہ بھی ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں ہندو اکثریت نے اردو کو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت بلکہ ایک حد تک مذہب کا پروردہ خیال کیا حالانکہ اس زبان کے نشو و ارتقا میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی و سنسکرت کو بھی یکساں دخل حاصل رہا ہے بلکہ اردو ادب ہندو مسلمان اہلِ قلم کی یکساں میراث ہے، مہاتما گاندھی کو اردو زبان کی ہمہ گیریت کا اعتراف تھا لیکن ان کی سیاست کا تقاضا تھا کہ اردو کو ''ہندوستانی'' کا نام دیا جائے اور فارسی و سنسکرت کے دو رسم الخط تقسیم کا سبب بن جائیں۔ آنجہانی رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اگرچہ اردو کے مقام و منصب کی وکالت میں دلائل دیئے لیکن دو رسم الخط کی تجویز پر وہ بھی متفق تھے البتہ قرۃ العین حیدر نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اردو کو اغوا کر لیا گیا ہے اور نام ہندی رکھ دیا گیا ہے۔ بہرکیف ۱۹۴۹ء میں اردو کو ہندوستان سے بالکل خارج کر دیا گیا اور اردو رسم الخط کو ناپید کر دینے کی منظم کوششیں کی گئیں لیکن اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری ہمیشہ ہر نوع کے تعصّبات کو شکست دیتی رہی یہی وجہ ہے کہ آج بھارت کے دو بڑے صوبوں بہار اور یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل ہے۔ جنوبی ریاستوں اور مہاراشٹر نیز دہلی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا چکا ہے لیکن اس مسلسل جاری و ساری سانحے کو کیا کیجئے کہ آزادی کے بعد چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود بھی اردو کو سرکاری حیثیت میں، پاکستان میں داخل ہونے کی آج تک اجازت نہیں ملی اور تحریکِ پاکستان کی فاتح التواریخ یہ زبان جو ہمارے تہذیب و تمدن اور انداز فکر کی شناخت بن چکی ہے بدستور منافقتوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر میں اردو کی قومی و سرکاری حیثیت کو تسلیم کیا گیا لیکن اس پر عملدرآمد تو کجا یہ دونوں دستور ہی وقت کی آندھیوں میں ورق ورق ہو کر منتشر ہو گئے جبکہ ۱۹۷۳ء کے واضح دستوری اعلان (آرٹیکل ۲۵۱) کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ ملک میں متعلقہ اداروں نے جن میں مقتدرہ قومی زبان سرِ فہرست ہے اردو کو علمی و فنی لحاظ سے دنیا کی جدید ترین

اور ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا ہے حکمرانوں نے غیر اعلانیہ طور پر انگریزی زبان کو پاکستان کی اول اور سرکاری زبان کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ یہ رویہ ثقافتی اور ذہنی غلامی کا عکاس ہے جس نے ہماری نئی نسلوں کے فکری ارتقاء کو مجروح کیا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔

کیا اس صورتِ حال کا کوئی حل بھی ہے کہ نہیں؟ قومی اور بین الاقوامی سطح کی اس زبان سے ناروا سلوک کے نتیجہ میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے فروغ و ارتقاء کا عمل بری طرح مجروح ہو رہا ہے۔ انگریزی زبان سے مرعوبیت ہماری قومی بے حسی ہی نہیں بے غیرتی کی بھی مظہر ہے۔ مفلوج الفکر اذہاں اس صورتِ حال کے حق میں جو دلائل دیتے ہیں وہ یا تو اُنکے احساسِ کمتری کا شاخسانہ ہیں یا خرد باختگی کی پاداش! حالانکہ پاکستان کے متصل تو کیا دور دور تک کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اپنے عوام پر کسی غیر ملکی زبان کو مسلط کیا ہو بلکہ بھارت تو پاکستان سے کہیں زیادہ مختلف زبانیں بولی جانے والے علاقوں پر مشتمل ہے ہندی کو سب سے زیادہ مخالفت کا سامنا بنگالی اور دراوڑی بولی جانے والے علاقوں میں کرنا پڑا۔ لیکن ہندی ہی کو ملک کی قومی و سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ پاکستان میں اردو اور علاقائی زبانیں باہم شیر و شکر ہیں بلکہ ہر علاقائی زبان کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ اس نے اردو کے فروغ و ارتقاء میں تاسیسی کردار ادا کیا ہے کاش اردو کے لئے ۲۰۰۸ء کا سال مبارک ہو اور اُسے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اُسکی ہمہ گیریت کے حوالے سے تسلیم کیا جائے اور یونیسکو کے ریکارڈ کی تصحیح کر کے ''ہندوستانی'' کی جگہ اردو کو دی جائے جس کے نام میں یائے نسبتی (ی) کا کوئی بھی ایسا حوالہ موجود نہیں جو 'ہندوستانی' کی طرح اِسے کسی ایک ملک سے منسوب و معنون کر دے۔ بلاشبہ اُردو ایک بین الاقوامی زبان ہے چنانچہ اس کا حق ہے کہ اِسے اقوامِ متحدہ کی سرکاری زبانوں میں بھی شامل کیا جائے۔ (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء)

پاکستان میں اُردو ادبی تحقیق کا مستقبل

تحقیق، حقائق کی جستجو نیز معروضی ترتیب و تدوین اور رجحانات و امکانات کے تجزیے کا ایسا عمل ہے جو زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ارتقاء کا ضامن اور تاریخی تسلسل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ عمل ادب کے حوالے سے اور بھی اہمیت کا حامل اس لیے قرار پاتا ہے کہ اس کے تناظر میں معاشرے کے فکری و تہذیبی اور معاشی و معاشرتی رویوں کی شناخت ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اردو ادب کی تمام تاریخ محققین کی تجزیاتی بصیرت کی آئینہ دار ہے ہمارے اہلِ قلم کی کثیر الجہت فکری و فنی تخلیقات کی مظہر بھی ہے۔ اُردو ادب میں تحقیق کے حوالے سے برصغیر میں جو عظیم الشان کام ہوا ہے وہ اب تاریخ کا بیش بہا اثاثہ بن چکا ہے۔ یہ اثاثہ عہد بہ عہد ادب کے طلباء اساتذہ کے لیے سرچشمۂ فیض بنا رہے گا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ادبی تحقیق کے جس رجحان کا آغاز ہوا تھا وہ ترویج و ارتقاء کے ایک مسلسل عمل سے گزر کر بیسویں صدی عیسوی میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ اثر پذیر ہوا۔ معروف و مقتدر شخصیات اور اداروں نے کاوش و جستجو کے معیار کو قابل رشک بنا دیا اور تحقیقی روایت محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر سید عبداللہ نیز دیگر ایسی ہی ہستیوں کے ہاتھوں مستقبل کے لیے بھی رہنمائی کے خطوط واضح کرتی چلی گئی۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی مختلف اصناف ادب پر وقیع کام ہوا جن میں مرثیہ نگاری، ڈرامہ، داستان، افسانہ، ناول، سفرنامہ، انشائیہ، مثنوی، غزل، نظم، گیت اور رباعی وغیرہ شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شخصیاتی تحقیق کے ضمن میں ہمارے اہلِ قلم نے معاصر شخصیات کے علاوہ متقدمین و متوسطین پر بھی توجہ مرکوز کی جن میں، میر، سودا، غالب اور مومن کے علاوہ میر سوز، امیر مینائی، حالی، آزاد۔ اصغر گونڈوی، پریم چند، نذیر احمد، سرسید، شرر اور آغا حشر ہی نہیں بلکہ متعدد دیگر شخصیات پر اہم مواد مہیا کیا گیا۔ البتہ شعری اور نثری اسالیب پر توجہ کم تر رہی۔ اور اصولِ تحقیق

نیز مضمون کی ترتیب و تدوین پر بھی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ تاہم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا مقالہ ''فنِ تحقیق'' اور ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم کا مقالہ ''تحقیق اور اس کا طریقِ کار'' طلبا کی رہنمائی کے لیے آج بھی موجود ہیں۔

ان دنوں اعلیٰ تعلیم کے کمیشن میں ایک ''یک موضوعی مجلّہ'' (Monograph) ترتیب و تدوین اور اشاعت کے مراحل سے گزر رہا ہے جس کے ذریعہ پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے معیار و مقدار اور رفتار کا جائزہ لیا جانا مقصود ہے۔ علاوہ ازیں یہ اہم دستاویز دنیا بھر میں اسی (۸۰) سے زیادہ جن جامعات میں ادبیات کے موضوع پر ایم۔ فل۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد عطا کی گئی ہیں اُن کا بھی احاطہ کرے گی۔ امید ہے کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی زیرِ نگرانی یہ مجلّہ جلد ہی منصۂ شہود پر آسکے گا اور اس طرح ادبی تحقیق اب تک جن بلندیوں کو چھو چکی ہے ان سے ہمارے اہلِ قلم متعارف ہو سکیں گے۔

اس پس منظر کے ساتھ یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اردو ادبی تحقیق کے شعبہ میں جو کام ہو چکا ہے وہ وقیع بھی ہے اور وسیع بھی لیکن ہم نے پاکستانی جامعات میں حالیہ برسوں میں ہونے والے تحقیقی کام میں جس رجحان کے اثر و نفوذ کو محسوس کیا ہے وہ بہ اعتبارِ معیار حوصلہ افزا نظر نہیں آتا۔ اسی تاثر کو زیادہ واضح الفاظ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنی کتاب بعنوان ''پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار'' میں بیان کر دیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''انفرادی اور نجی سطح پر جو تحقیقی کام یہاں ہوئے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد کا موضوع فقط وہ ادیب اور شاعر ہیں جو کسی نہ کسی امتحان کے نصاب کا حصہ ہیں۔ نصاب کی امدادی کتب کو علمی اور ادبی کارنامے بنا کر پیش کرنے کا رجحان بھی عام نظر آتا ہے۔ چند نامی گرامی محققین کا مرغوب اندازِ تحقیق نکتہ چینی اور خوردہ گیری کا ہے۔''

چنانچہ ''خوردہ گیری'' نے تحقیق کے معیار کو پست سے پست تر کر دیا ہے جو مستقبل کے لیے ہرگز نیک فال نہیں۔ سہل انگاری اور علمی کوتاہ بینی رُطب و یابس کی تخلیق کا موجب بن سکتے ہیں۔ لیکن حقیقی تحقیق کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ بعض اداروں میں جو تحقیقی کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے

اس میں تو بڑی حد تک معیار و اعتبار کی صورت گری نظر آتی ہے لیکن جامعات کے حوالے سے محسوس ہوتا ہے کہ سارا زور مقدار پر ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات کے لیے شعر و ادب سے متعلق جن شخصیات کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا خود ان کی تخلیقی کم سوادی اظہر من الشّمس ہے۔ یہ حقیقت انتہائی تشویشناک ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے حصول کے لیے ازرہِ مصلحت ایسی شخصیات کے نام نہاد فکر و فن اور احوال و آثار پر تکیہ کرلیا جائے کہ جن کا اپنا مبلغ علم و دانش اور اثاثۂ تخلیق ایم۔ اے تو کجا بیچلرز ڈگری کے لیے بھی جواز مہیا نہیں کرتا۔ ہم اس نوع کی مثالیں پیش کرنے سے جن کی تعداد ایسی بھی کوئی کم نہیں بوجوہ محترز ہیں۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کو سال ۲۰۰۸ء کے دوران ڈاکٹریت کے تحقیقی مقالوں کے لیے رہنما خطوط متعین کرنا پڑے اور جامعات کو کہا گیا کہ ان رہنما خطوط پر ان کی روح کے مطابق عمل کیا جائے اور یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ وہ مسلم الثبوت ماہرین کے ذریعہ مواد کی تقویم و تشخیص کے علاوہ کم از کم ایک مقالہ کمیشن کے منظور شدہ کسی مجلّہ میں شائع ہونا بھی ضروری ہوگا۔ کمیشن کا یہ اقدام یقیناً لائق تحسین ہے جس سے اصلاحِ احوال کی صورت پیدا ہو سکتی ہے لیکن کمیشن نے سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق مضامین و موضوعات کو مرکز توجہ بنایا ہے جب کہ اردو ادب فہرست ترجیحات میں خاصا پس انداز نظر آتا ہے۔ اسی طرح کمیشن کی جانب سے جامعات میں معیار کو یقینی بنانے کے لیے جو Quality Assurance Cell قائم کیے گئے ہیں اُن کا محور و مرکز بھی سائنسی اور تکنیکی علوم ہیں جب کہ اردو ادبی تحقیق اس مربیانہ سلوک سے محروم نظر آتی ہے۔ پاکستان کی جامعات میں ڈیجیٹل لائبریریاں تو قائم کر دی گئی ہیں اور ان میں تئیس ہزار (۲۳۰۰۰) سے متجاوز جرائد بھی موجود ہیں لیکن یہ سب کچھ اردو محققین کے لیے نہیں۔ کاش ہمارے اربابِ بست و کشاد کو یہ احساس ہو جائے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے عصری تقاضے اپنی جگہ یقیناً درست و بجا لیکن ادب کا یہ کردار بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی معاشروں کی تمدنی و تہذیبی ساخت اور اخلاقی نشو و نما ادب ہی کے مرہونِ منت ہے اور ہمیں اس ناقابلِ تردید حقیقت سے اغماض کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ علم گریز رجحان بالخصوص اردو ادب کے شعبۂ تحقیق کے مضمحل اور انحطاط پذیر ہونے کے جہاں دیگر اسباب ہیں وہیں ہماری جامعات میں غلط بخشی کی فضا اور نگران اساتذہ کی محکمانہ سیاست اور باہمی تعصّبات بھی سرِ فہرست ہیں۔ نجی کتب خانے محققین کی دسترس سے باہر ہیں یا جن تک رسائی ممکن ہے وہاں اندراج کی خامیوں کے سبب مآخذ تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ مکتبی و جامعی تعلیم کا یہ حال ہے کہ فارغ التحصیل ہونے والوں کی اکثریت علمی بصیرت اور تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں سے محروم ہے دوسری طرف نصابِ تعلیم کی فرسودگی کے باعث وہ محرکات پیدا نہیں ہو پا رہے جو تحقیق کے عمل کو موثر و موقر بنا سکیں۔ اس تناظر میں ہائر ایجوکیشن کمیشن کا سال ۲۰۰۹ء۔ ۲۰۰۸ء کے لیے یہ اعلان کہ تمام مضامین کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کے وظائف مہیا کیے جائیں گے کم از کم اردو ادبی تحقیق کے لیے موثر و نتیجہ خیز ترغیب کا حامل نظر نہیں آتا جب تک کہ ٹھوس اور مثبت اقدامات کا بیڑہ نہ اٹھایا جائے اس سلسلہ میں ہم چند تجاویز پیش کرنا چاہیں گے جو مختصراً یہ ہیں:

(۱) جامعات کے علاوہ نجی و سرکاری شعبہ میں جو تحقیقی ادارے مصروفِ عمل ہیں ان کی کارکردگی کے پیش نظر انہیں معقول وسائل مہیا کیے جائیں۔

(۲) ایک ہی موضوع پر بلا جواز عطائے اسناد کے حوالے سے تحقیقی تکرار کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔

(۳) ممتحنون کے جنہوں نے بالخصوص ڈاکٹریٹ کی سطح کے مقالوں پر سند عطا کرنے کی سفارش کی ہو اُن کی رپورٹیں بھی حتمی منظوری عطا کرنے والے بورڈ کے سامنے رکھی جائیں۔

(۴) اُردو ادبی تحقیق کے لیے حتمی منظوری کے اختیارات کا حامل علیحدہ بورڈ تشکیل دیا جائے جو غیر متنازعہ اور مسلم الثبوت محقق اسکالرز اور اساتذہ پر مشتمل ہو اور جس میں یہ گنجائش بھی ہو کہ استثنٰی کی مستحق ایسی بلند پایہ علمی شخصیات بھی شامل ہوں جو ڈاکٹریٹ کی رسمی ڈگری سے ماورا و بے نیاز سمجھی جاتی ہوں۔

(۵) جامعات کو چاہیے کہ منظور شدہ تحقیقی مقالات کی اشاعت کا بندوبست کریں اور مقالات کی فہرستیں شائع کریں۔

(٦) بھارت اور پاکستان کے درمیان بالخصوص اور بین المملکتی سطح پر بالعموم تبادلۂ کتب کی مشکلات دور کی جائیں اور ڈاک کے محاصل میں جو ناقابلِ برداشت حالیہ اضافہ ہوا ہے اُسے ختم کیا جائے۔

(۷) کاپی رائٹ قانون کو نظر ثانی کے ذریعہ زیادہ بامقصد اور سہل العمل بنایا جائے نیز اس پر پابندی کو یقینی بنایا جائے۔

(۸) تحقیق کے مآخذ اور کلاسیکی مخطوطات کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی جائے۔

مذکورہ بالا تجاویز کے ساتھ ساتھ ہم ۱۹۸۰ء کی دہائی میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک حکم نامے کے ذریعہ اُس وقت کے وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی سربراہی میں قائم ہونے والے اُس کمیشن کی جانب بھی توجہ دلانا چاہیں گے جسے قومی سطح پر ملک میں موجود آرکائیوز، آرکیالوجی۔ میوزیمز اور نجی و سرکاری کتب خانوں سے متعلق استفادہ و تحفظ کی ایک ایسی قومی پالیسی وضع کرنے کا فریضہ ہونپا گیا تھا جس کے ذریعے ہمارے قومی ورثہ کی داشت و پرداخت کے نظام کو مربوط کیا جا سکے۔ کمیشن کے اراکین میں مذکورہ شعبوں سے متعلق ملک کی نامور شخصیات شامل تھیں۔ چنانچہ ملک کے مختلف مقامات پر اجلاس منقد کر کے تحقیق و تصنیف کی مساعی کے لیے منجملہ دیگر امور جو تجاویز زیرِ غور آئیں ان پر راقم الحروف نے بحیثیت ''یک رکنی کمیٹی'' ایک جامع و مبسوط رپورٹ تیار کی جسے کمیشن کے سربراہ نے کابینہ ڈویژن کے توسط سے صدرِ مملکت کی خدمت میں بھجوا بھی دیا لیکن کوئی بھی نتیجہ تادمِ تحریر برآمد نہیں ہوا۔ کاش حکومت کے ایوانوں میں اسی مفقود الخبر رپورٹ کی کہیں نشان دہی ہو سکے کہ اس سنگِ میل دستاویز میں وہ سفارشات بھی شامل ہیں جن سے ہمارے محققین علمی و ادبی تحقیق کو نئی وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۸ء)

نظامِ تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات

غیور، حساس اور باشعور معاشرے، خاص طور پر وہ جو سیاسی اعتبار سے بھی اقتدارِ اعلیٰ کی نعمت سے بہرہ مند ہیں، تشخص کو چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اوّلین اہمیت دیتے ہیں۔ شناخت یا پہچان کی آرزو کے جہاں دیگر مظاہر ہیں اُن میں نظامِ تعلیم سرِ فہرست ہے۔ نظامِ تعلیم کی جامعیت ہی افراد کی صلاحیتوں کو نشو و نما اور متوازن ارتقاء کی سمت مہیا کرتی ہے اور یہی ایک موثر ذریعہ بن کر نہ صرف قومی تاریخ کے خدوخال سنوارتی ہے بلکہ تہذیبی و ثقافتی ورثے کو بھی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ بدقسمت ہیں وہ معاشرے جو اعتدال و توازن سے بے نیاز ہو کر صرف عصری تقاضوں کی ہنگامی منفعت پذیری کے سیلِ رواں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں اور اپنی دائمی شناخت کے تصور کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہر قوم کی ایک تہذیبی شخصیت بھی ہوتی ہے جس کا اظہار زبان اور اُس کے ادب نیز دیگر فنونِ لطیفہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ قوموں کا طرزِ عمل، طرزِ فکر اور طرزِ احساس، ہی ربط و آہنگ کے امکانات کو متشکل کرتا ہے اسی لیے معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو ''تہذیب'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان ہماری تہذیبی و ثقافتی شناخت کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد ہی سے نظامِ تعلیم کی تشکیل و اصلاح پر توجہ مرکوز رکھنے کے لیے ایک سلسلے کا آغاز ہوا۔ قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے قوم کے معماران تعلیم کو ایک ایسا سہ نکاتی منشور عطا کیا جو ہمارے تاریخی و تہذیبی ورثے اور عالمگیر سائنسی ارتقاء کے ناگریز عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی ضمانت مہیا کر سکتا تھا لیکن ہماری بے تدبیری اور ذہنی و فکری بے بضاعتی کے سبب ایسا نہ ہو سکا اور ہم فرنگی عہدِ حکمرانی میں میکالے کے محکوموں پر محمول کیے گئے۔ اُس نظامِ تعلیم کی بعض ایسی جزئیات کو بھی قائم نہ رکھ سکے جن میں ہماری قومی فلاح کا پہلو مضمر تھا۔ بانی پاکستان نے فرمایا تھا کہ ہمیں ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو اولاً اہل پاکستان کے ذہنی و

فطری میلانات کا عکاس ہو، ثانیاً تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو اور سوئم جدید اور ارتقائی عوامل سے مطابقت رکھتا ہو۔ بابائے قوم کے انہیں نکات سے مماثل سر سیّد احمد خاں کا وہ تصورِ تہذیب تھا جو انیسویں صدی عیسوی میں مغرب میں مروّج تھا، حالانکہ جب وہ ''آئین اکبری'' کی تدوین و ترتیب کے مراحل سے گزر رہے تھے تو انہوں نے غالب کی مستقبل شناسی کے اس مشورے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا کہ سائنسی ایجادات کے عوامل کو بھی فہرست ترجیحات میں شامل رکھا جائے تاہم انہوں نے بعد میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا قیام عمل میں لا کر مرزا کی دور بینی پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی اور استعماریت کے تسلّط کے باوجود ایسے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں سائنس و فلسفہ شانہ بہ شانہ اور دینی و اخلاقی درسیات کا تفوق واضح نظر آتا ہے۔

آزاد خود مختار قومی زندگی کی چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود بھی آج ہمارے معمارانِ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ تعلیمی منظرنامے کو درست خطوط پر ترتیب نہیں دے سکے ہیں اور ذہنی مرعوبیت کے ہاتھوں اس قدر حواس باختہ ہیں کہ انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے علاوہ اگر کچھ نظر آتا ہے تو صرف یہ کہ نونہالانِ قوم کو ''او'' (O) اور ''اے'' (A) لیول کے گرداب میں دھکیل دیا جائے جس کے غسل نامسعود کے بعد جب وہ برآمد ہوتے ہیں تو قومی اقدارِ حیات سے مکمل طور پر نہ صرف بیگانہ بلکہ برگشتہ اور قومی زبان ولباس سے ناآشنا اور مغربی اطوار معاشرت کے حمیت باختہ پرستار۔ کون کہتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں بلکہ اقوام عالم میں اپنے سیاسی وجود کو برقرار رکھنے اور قومی وقار و حاکمیتِ اعلیٰ کو مستحکم بنانے کا یہی ایک واحد ذریعہ ہے جو بے شمار مادّی منفعتوں کا بھی ضامن ہے۔ لیکن کیا ہماری قومیت کے اجزائے ترکیبی میں صرف مادّیت ہی اوّل و آخر کی حیثیت رکھتی ہے یا ہماری دیگر اقدارِ حیات بھی، جن میں تہذیبی و معاشرتی قدریں شامل ہیں، توجہ کی مستحق ہیں؟

زبان اور ادب معاشرتی و اخلاقی اقدار کے محرک بھی ہوتے ہیں اور محافظ بھی۔ کتنا بڑا ستم ہے کہ آزادی سے پہلے تو ملکی جامعات میں السنہ شرقیہ کو نصابی اعتبار سے شایانِ شان مقام حاصل تھا جس نے بالخصوص اردو ادب کو ثروت و عظمت سے ہمکنار کر دیا اور دنیا کی کسی زبان کے ادب

کے مقابلے میں مقامِ تفاخر پر متمکن کیا، یہی نہیں بلکہ منظوم ومنثور ادب کے شعبوں میں ایسی عظیم ہستیوں کے نام جریدۂ عالم پر ثبت کر دیئے جن کا ثانی عہدِ حاضر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قیام پاکستان کے چند برسوں بعد تک ملکی جامعات میں السنہ شرقیہ کا شعبہ روبہ زوال رہنے کے معدوم ہوتا گیا اور اب جامعۂ پنجاب سے منسلک اورینٹل کالج، لاہور “یادگارِ عہدِ ماضی” کے طور پر نزع کی کیفیت سے دوچار ہے۔ اس المیے کے اوّلین اسباب میں اردو۔ فارسی اور عربی زبان وادب کے ان نصابات کا انقطاع اور اُن امتحانات کا خاتمہ شامل ہے جن کے فارغ التحصیل طلباء متعلقہ زبان وادب کے وسیع وعمیق مطالعے سے نہ صرف بہرہ مند ہوتے تھے بلکہ بحیثیت شاعر وادیب اُن کی نگارشات ہمارے ادب کا قابلِ رشک سرمایہ بن چکی ہیں۔

تحصیل علم وادب کا یہ خصوصی رجحان اس لیے بھی پروان چڑھا کہ ان شعبوں کی اسناد یعنی ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل (اردو)، منشی، منشی عالم اور منشی فاضل (فارسی) اور مولوی مولوی عالم اور مولوی فاضل (عربی) کو علمی طور پر ہی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی بلکہ یہ اسناد حصولِ روزگار میں بھی مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ کالجوں اور جامعات کے اُن اساتذہ کے انتخاب میں ترجیح برتی جاتی تھی جو ایم اے کے ساتھ ایم او ایل کی اضافی پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے اس لیے حقدار ہوتے تھے کہ وہ السنہ شرقیہ میں سے کسی ایک میں اعلیٰ سند یافتہ ہوتے تھے۔ اسی طرح ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر طلباء کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ السنہ شرقیہ کے ابتدائی یا درمیانی درجے کے اسناد یافتہ ہونے کی نسبت سے صرف انگریزی کے مضمون میں امتحان پاس کر کے ثانوی یا اعلیٰ ثانوی سطح کی مکمل اسناد کے حقدار قرار پاتے تھے اور ملازمتوں کے حصول میں انہیں کسی تفریق کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا۔

اب یہ تمام عمارت منہدم کی جاچکی ہے اور اس کے ملبے پر وہ لوگ کان پر قلم رکھے بیٹھے ہیں جو نہ زبان کی جہات سے واقف ہیں نہ ادب کے مطالعے سے بہرہ مند۔ مستثنیات سے قطع نظر نئی پود کے اکثر نظم ونثر نویسوں کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ “برائے بیت” ہی کہا جاسکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عصری ادب کے وہ رجحانات جنہیں “جدیدیت” سے تعبیر کیا جاتا ہے، علم باختگی کی شرمناک

مثال بن چکے ہیں۔ ''انشاء و اِملا'' اس لیے غلط ہے کہ عربی و فارسی سے نابلد ہیں، بالخصوص موخرالذکر کے گراں بہا ادب سے اجنبیت نے منظوم ومنثور ادب سے لفظی ومعنوی حسن پر مُہر ظلمت ثبت کر دی ہے، البتہ اردو ادب کا بھرم اگر قائم ہے تو اُن لوگوں کے دَم قدم سے ہے جو اگرچہ چراغ سحری ہیں لیکن قلم سے آج بھی نگارشات نظم ونثر کو کلاسیکی خزینہ علم کے پس منظر سے جمال وَ جلال کا صحیفہ بنائے ہوئے ہیں۔

ہمیں ہائر ایجوکیشن کمیشن کی گزشتہ پانچ چھ برسوں میں خدمات کا اعتراف ہے کہ پاکستان سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں لائق تحسین پیش رفت کر چکا ہے لیکن ہم نہایت دردمندی کے ساتھ یہ گلہ کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ کمیشن نے اپنی قیادت کی تمام تر ذہانت واہلیت کے باوجود اُردو زبان وادب کو تدریسی نظام میں وہ اہمیت نہیں دی جس کی ہماری قومی اقدار متقاضی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا اجتماعی تشخص نہ صرف مجروح ہوا ہے بلکہ تیزی سے تحلیل ہو رہا ہے۔ یہ ایک جانکاہ المیہ ہے جس کے مضمرات اخلاقیات سے روگردانی کے سبب معاشرے میں تہذیبی وتمدّنی خلفشار اور فکری وعملی عدم توازن کی صورت میں سامنے آ رہے ہیں۔ اس وقت دنیا کے چودہ (۱۴) ترقی یافتہ ممالک میں ہمارے سکالرز سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن ادبیات کا شعبہ اس عنایت خسروانہ سے یکسر محروم ہے۔ اسی طرح نظام تعلیم سے متعلق ارباب اختیار کی عدم توجہی نے ہمیں اس نوبت تک پہنچا دیا ہے کہ ایک طالب علم دو اور دو کا حاصل جمع اُس وقت تک نہیں بتا سکتا جب تک وہ اپنے کیلکولیٹر کی مدد سے چار کا ہندسہ حاصل نہ کر لے۔

؎ کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸ء)

’چو کفر از کعبہ برخیزد۔۔۔!‘

جدید و مہذب ریاست کا تصور کسی آئین یا دستور کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک ایسی ناگزیر دستاویز ہے جو صرف ریاست کا بنیادی قانون ہی نہیں بلکہ قومی تشخص اواجتماعی زندگی کے اصول و ضوابط کا سرچشمہ بھی ہوتی ہے۔ صرف ملکی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر جو تقدیس و احترام اسے حاصل ہوتا ہے وہی بین المملکتی تعلقات کار کے تعین کی بنیاد بنتا ہے۔ مملکت کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ اہم ترین ستون خیال کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر عدلیہ کے فرائض منصبی میں جہاں آئین کی ترجمانی اور تصریحات شامل ہیں وہیں آئین کے حرف حرف کا تحفظ اور پاسداری اُس کا اولین فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی بروقت اور موثر ادائیگی ہی معاشرتی نظم و ضبط اور قومی آرزوؤں کی تکمیل کی ضامن ہو سکتی ہے۔

دنیا کی کسی بھی مملکت کا آئین ایسا نہیں جس میں قومی و سرکاری زبان کا تعین نہ کیا گیا ہو چنانچہ پاکستان میں آئین سازی کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کی گی اس مملکتِ خدا داد میں جتنے بھی آئین تشکیل دیئے گئے یعنی ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر، ان میں سے ہر ایک میں اردو بحیثیت قومی زبان ایک قدر مشترک کے طور پر موجود بلکہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں جسے آج تک قومی اتفاق رائے کے صحیفے کی حیثیت حاصل ہے اردو زبان کو دفتری سطح پر مروج و مستعمل کرنے کے لیے آرٹیکل ۲۵۱ میں واضح احکام موجود ہیں اور اس عمل کی تکمیل کے لیے پندرہ سال کی مدت کا تعین بھی۔ چنانچہ اس مدت کو گزرے دو دہائیوں سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اس برملا اور سفاک بے حسی کی مثال شاید کرۂ ارض پر کہیں اور نہ مل سکے لیکن ہمیں اس کے باوصف غیرت مند قوم ہونے پر اصرار ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری معزز و محترم عدلیہ نے آج تک اردو کے قومی زبان ہونے کے باوجود اس کے سرکاری زبان کے طور پر عدم نفاذ کا نوٹس تک نہیں لیا جو ایک

سنگین اور بلا جواز خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ آئین جیسی مقدس سیاسی دستاویز کی شرمناک توہین بھی ہے اور توہین بھی کسی اجنبی کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے ہی ملک کی انتظامیہ کے ہاتھوں جو مقننہ کو بھی جواب دہ ہے اور عدلیہ کو بھی۔ ٹریفک تک کے فروعی مسائل پر تو 'ازخود نوٹس' لینے کا عدالتی اختیار استعمال کیا گیا لیکن سرکاری زبان جیسے اہم ترین مسئلہ کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا یہی نہیں بلکہ ۱۹۹۱ء میں چند محبِّ وطن اور غیرت مند پاکستانیوں کی جانب سے جناب محمد اسمٰعیل قریشی، سینئر ایڈووکیٹ عدالت عظمیٰ پاکستان نے جس دردمندی، اخلاص اور غیرتِ قومی کے جذبے کے ساتھ عدالت عالیہ لاہور میں ناقابل تردید دلائل اور شواہد کے ساتھ آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت جو تاریخی درخواست پیش کی تھی وہ آج بھی سترہ برس گزر جانے کے باوجود عدالتی سردخانے سے باہر نہیں آسکی ہے۔ اس درخواست کا مکمل متن اور جناب قریشی کا چشم کشا مکتوب 'الاقرباء' کے زیرنظر شمارے میں شریک اشاعت ہے یہ مکتوب اور درخواست جہاں عدالتی حصار میں بلند و بالا کرسیوں پر متمکن قومی حمیت سے بیگانہ بعض افراد کے تعصب آلود اور تدبّر باختہ ذہنی غلامی کے افرنگ زدہ رویوں کو بے نقاب کرتے ہیں وہیں اعلیٰ عدلیہ کے ماضی میں کردار کے بارے میں بھی دل شکن سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ محبِّ وطن پاکستانیوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں جب اُن سے بیرون ملک یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ساٹھ برس گزر جانے کے باوجود بھی کیا آپ کی قومی زبان کو اجازت نہیں کہ وہ دفتروں اور سرکاری ایوانوں میں بار پاسکے؟

قومی حمیت کے جسدِ نحیف پر یہ زخم ہی کیا کم تھا کہ اسلام آباد کی نومولود عدالت عالیہ نے حکومت پاکستان کے غیر معمولی گزٹ مجریہ ۲۹ مئی ۲۰۰۸ء کے ذریعہ یہ حکم صادر فرمادیا کہ عدالت عالیہ میں پیش کی جانے والی ہر دستاویز، اور درخواست کا انگریزی زبان میں تحریر کیا جانا لازمی ہوگا اور یہ کہ انگریزی کے علاوہ کسی بھی دوسری زبان میں پیش کی جانے والی کوئی بھی دستاویز قابل قبول نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ اُس کا انگریزی زبان میں ایسا تحریری ترجمہ نہ پیش کیا جائے جو منجملہ دیگر شرائط کے مصدقہ ترجمہ ہو اور جس پر فریقین متفق ہوں۔ نیز کوئی بھی مقدمہ یا عدالتی کاروائی اس وقت تک زیرسماعت نہیں لائی جائے گی جب تک کہ تمام فریقین یہ یقین دہانی نہ کرادیں کہ تمام

دستاویزات جو پیش کی گئی ہیں اور جن پر انحصار کیا جانا مقصود ہے انگریزی زبان میں تحریر کردہ ہیں یا انکا ترجمہ انگریزی زبان میں کر دیا گیا ہے۔ اللہ اللہ ! کیا یہی وہ مقاصد تھے جن کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا؟ کیا واقعی اب انگریزی زبان ہمارے قومی تشخص کی ضامن ہے؟ کیا قومی زبان کے بارے میں بانی پاکستان کے واضح فرمودات کو فراموش کر دیا گیا ہے؟ نہیں ہر گز نہیں؟ جب تک قومی حمیّت سے سرشار افراد پاک سرزمین پر زندہ ہیں وہ ایسے اقدامات کی مزاحمت کرتے رہیں گے جو اُن کا آئینی حق بھی ہے اور قومی فریضہ بھی۔

ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ایسی ہی ایک صورتِ حال منظر عام پر آئی جب عدالت عالیہ نے خیری خاندان کے چشم و چراغ جناب حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ کی اُردو میں تحریر کردہ درخواست قبول کرنے اور اردو میں اُن کے دلائل سننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ عدالتی زبان انگریزی ہے۔ جس پر جناب خیری نے جن کے بزرگوں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے فرنگی استبداد کے سامنے کبھی سر خم نہیں کیا اور علامہ راشد الخیری بھی کہ مسلمان نسلوں کو اخلاقیات پر مبنی بیش بہا ادب پارے ورثے میں دیے گئے ہیں یہ کہہ کر عدالتی حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ آئین کی رُو سے جب تک اردو پاکستان کی قومی زبان ہے وہ اسی کو استعمال کرتے رہیں گے چنانچہ جناب خیری کا موقف تسلیم کیا گیا اور آج تک عدالت ہائے عالیہ وعظمیٰ میں اردو درخواستوں اور اردو میں دلائل دینے پر کبھی اعتراض نہیں کیا گیا لیکن اس بوالعجبی کو کیا کہیئے کہ اسلام آباد کی عدالت عالیہ جس کے آئینی فرائض میں قومی زبان کا نفاذ و احترام شامل ہے محل نظر بن کر رہ گئی ہے اور اردو جو زبانِ غیر سے اپنا منصب واگزار کرانے کے لیے گذشتہ چھ دہائیوں سے سرگرداں چلی آ رہی ہے آج غالب کے اس شعر کی عصری معنویت کی عبرتناک مثال بن کر رہ گئی ہے کہ:

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء)

عظیم مستشرق اور مبلّغِ اردو رلف رسل کی رحلت

اردو زبان کی لسانی مقناطیسیت اور سحر آفریں جذب و کشش کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دنیا بھر میں اپنے پرستار پیدا کیے اور خاص طور پر مغرب میں ایسے سکالرز کو اپنی آغوشِ عاطفت میں لیا جنہوں نے اردو کو بطور ذریعۂ اظہار عالمگیریت عطا کی اور اس میں تخلیق ہونے والے عظیم ادب کو چار دانگِ عالم میں متعارف کرایا۔ ایسے ہی سکالرز میں رلف رسل کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۸ء کو نوے برس کی عمر میں لندن میں ان کے انتقال کے ساتھ اردو زبان و ادب ایک عظیم مستشرق مُحسن اور مبلغ سے محروم ہو گئے ہیں۔ انہیں بجا طور پر مغربی دنیا میں 'بابائے اردو' کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ رلف رسل نے ترجمہ و تحقیق کے ذریعہ اردو کے لیے اپنی خدمات کو ضرب المثل بنا دیا ہے۔ انہوں نے لندن یونیورسٹی کے افریقی و السنۂ شرقی کے سکول سے بحیثیت طالب علم ۱۹۴۶ء میں اپنی وابستگی کا آغاز کیا اور ۱۹۴۹ء میں اردو میں ڈگری لے کر فارغ التحصیل ہوئے۔ یہاں اردو۔۔۔ کے ساتھ ذیلی مضمون کے طور پر انہوں نے سنسکرت زبان کا بھی مطالعہ کیا۔ ۱۹۴۹ء ہی میں انہیں اپنے مادرِ علمی میں معلّمی (لیکچررشپ) کی پیش کش ہوئی جسے انہوں نے قبول کر لیا اور ۱۹۸۱ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے تک بتیس برسوں میں انہوں نے جامعہ میں اردو کے تدریسی نظام کو موثر ترین بنا دیا۔ انہوں نے طلباء کے لیے متعدد نصابی کورس وضع کیے جن سے درسگاہ کے اندر اور باہر بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ انہوں نے سکول کی ملازمت کے آغاز ہی میں نومبر ۱۹۴۹ء سے اکتوبر ۱۹۵۰ء کے دوران برصغیر پاک و ہند کا مطالعاتی دورہ کیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خاصا وقت گزارا۔ رسل نے اس قلیل مدت میں پاک و ہند کے تقریباً تمام ممتاز قابلِ ذکر علمی و ادبی مراکز سے رابطے کیے اور معاصر شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔ اس دوران رلف رسل کو خورشید اسلام سے متعارف ہونے کا موقع ملا جو بالآخر اُن کی

آئندہ چالیس برس تک علمی وادبی کی رفاقت کا سبب بنا۔ یہ رفاقت اردو زبان وادب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک خورشید اسلام بھی سکول برائے افریقی والسنۂ شرقی سے وابستہ رہے اس رفاقت کار نے دونوں سکالرز کو موقع فراہم کیا کہ وہ مغربی دنیا کو اردو ادب کے بہترین ورثے سے متعارف کریں چنانچہ یہ عظیم الشان کام وسیع پیمانے پر تراجم کے ذریعے انجام دیا گیا۔

رسل اور خورشید اسلام کے اس اشتراکِ عمل کے نتیجے میں متعدد کتب تصنیف وتالیف کی گئیں جن میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے تین عظیم شعراء میر تقی میر، میرزا رفیع سودا اور میر حسن پر انگریزی زبان کی مبسوط تالیف سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب تینوں شعراء کے عہد اور حکمرانی کا سریع الحرکت زوال اور معاصر شعری روایات کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ پہلی بار یہ کتاب امریکہ میں ہارورڈ سے شائع ہوئی جسے بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس انڈیا نے بھی شائع کیا۔ انگریزی زبان میں ایک اور کتاب رسل اور خورشید اسلام کے اشتراکِ عمل سے منظر عام پر آئی جس میں اٹھارویں صدی کے میرؔ اور انیسویں صدی کے غالبؔ کے فکروفن کا بسیط و وسیع جائزہ لیا گیا ہے۔ مغرب میں قارئین کو اس کتاب کے ذریعہ اردو شاعری کی عظمتوں کے نقیب میر و غالب کے اسالیب شعری اور متنوع موضوعات پر اُن کی بے مثال گرفت سے مولفین نے جس طرح متعارف کرایا ہے اور دو سو سال (۱۹۵۰ء۔۱۷۵۰ء) کے ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اردو شعر وادب کا انگریزی ادب سے تقابلی جائزہ لینے والوں کو ہر طرح کے احساسِ کمتری کو جھٹک دینا چاہئے۔ رسل کو یہ شکایت اردو ادب کی نسبت ہیچ مقداری کے احساس میں مبتلا اشخاص سے ہمیشہ رہی اور اُس نے اپنے مضامین ومقالات سے اس تاثر کی مدلل نفی کی۔ ایک اور انگریزی زبان کی تصنیف جس کے عنوان کا ترجمہ ''اردو ادب کی تلاش میں'' کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ رسل کی ایسی شاہکار کاوش ہے جس کے ذریعہ اس نے مغربی دنیا میں اردو زبان وادب کا سکہ بٹھا دیا۔ اس کتاب کا ترجمہ محمد سرور راجہ نے کیا جسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۲۰۰۲ء میں شائع کر کے اہم خدمت انجام دی۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے رسل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اس کی خودنوشت سوانح ۲۰۰۱ء میں ہی منظر عام پر آچکی ہے اور ایسے امکانات کی غماز ہے جو متقاضی ہیں کہ ہم اردو والے اس محسن اردو پر وسیع تحقیق کا جامعاتی وغیرہ جامعاتی اہتمام کر کے احسان شناسی کا ثبوت فراہم کریں۔ یہی نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ رسل کی مطبوعات کا انتخاب کر کے مختلف سطحوں پر نصابی درسیات کا حصہ بنایا جائے۔ اس شخص نے اپنی تمام عمر اردو کی تحقیق و ترویج میں صرف کر دی اور کلاسیکی عہد سے موجودہ دور تک کونسا ایسا قابلِ ذکر موضوع یا شخصیت ہے جس پر رسل نے سرمایۂ تحقیق ورثے میں نہ چھوڑا ہو۔ غالب کے خطوط اور مرزا محمد ہادی رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' سے لے کر محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ، الطاف حسین حالی۔ ڈپٹی نذیر احمد، تحریک علی گڑھ، اکبر الہٰ آبادی کے مقصدی طنز ومزاح پر مبنی شاعری اور اقبال کا پیغام اور فکر وفن رسل کی توجہ کا ہدف بنے رہے ہیں۔ اُس نے اردو غزل پر بحیثیت صنف سخن لازوال کام کیا ہے اور افسانہ و ناول کے حوالے سے پریم چند، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور شوکت تھانوی وغیرہ کو عالمی سطح پر اُن کی نگارشات کے آئینہ میں منعکس کر کے رسل نے اردو سے اپنے اخلاص اور والہانہ تعلق کا برملا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی آئندہ نسل کو بھی وہ یہی خدمت سپرد کر گیا ہے۔ چنانچہ آج رسل کا بیٹا ایان رسل اُسی جامعہ لندن کے سکول برائے افریقی والسنۂ شرقی میں جہاں اُس کے باپ نے مدت العمر تک اردو کی خدمت کی اُس کا جانشین ہے:

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۸ء)

رسم الخط کے مباحث اور اردو کی تہذیبی شناخت

عالمگیریت نہایت برق رفتاری سے معاصر معاشروں کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے جس کے نتیجہ میں بنیادی اقدار حیات بھی ناگزیر تبدیلیوں کی زد پر نظر آتی ہیں۔ یہ عمل پوری سفّاکی کے ساتھ ایک یلغار کی شکل اختیار کر چکا ہے جسے معتدبہ توانائی مواصلاتی نظام میں آنے والے انقلاب نے مہیا کی ہے۔ جس میں انٹرنیٹ سرِفہرست ہے۔ ترسیل وابلاغ کی اس سریع الحرکت ایجاد نے سب سے پہلے عالمی زبانوں کو اپنے شکنجے میں کسا ہے اور زبان چونکہ تہذیب ومعاشرت کی ترجمان اور تمدنی اقدار کی نگہبان ہوتی ہے اس لیے زبانوں پر مرتب ہونے والے منفی اثرات دوررس بھی ہیں اور اِسی باعث انتہائی تشویشناک بھی۔

ہر چند کہ ارتقا کے اس فطری عمل کے مثبت اور تعمیری پہلو بھی ہیں جو رواں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں تاہم منفی مرتّبات کو محدود کرنا بھی دانش عصر کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں دیگر عالمی زبانوں کو یک لسانی آمریت کا خطرہ لاحق ہوا ہے وہیں اردو زبان کو بھی ایک توانا اور ارتقا نہاد تہذیب کے نمائندہ کے طور پر اپنے تحفّظ کا مرحلہ درپیش ہے۔ تاریخ ثبوت فراہم کر چکی ہے کہ اردو کی لسانی قوت اور وسعت پذیری کی صلاحیت ناقابل شکست ہے۔ یہ جغرافیائی حدود پر غالب آ چکی ہے اور آج کی معلوم دنیا کی چھ اَرب نفوس پر مشتمل آبادی میں کم وبیش ڈیڑھ ارب افراد جن کا تعلق مختلف تہذیبوں سے ہے اسے بولنے اور سمجھنے کی استعداد سے بہرہ مند ہیں۔ اردو کا یہ ساحرانہ وصف اس کی وسیع الجہت انجذابی صلاحیت کا مرہون منت ہے۔ عربی وفارسی، ہندی وسنسکرت اور ترکی ودیگر وسط ایشیائی زبانیں ہی نہیں بلکہ لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی جو سر پر یک لسانی آمریت کا تاج سجائے دنیا بھر پر اپنے تغلّب کی آرزومند ہے اردو زبان کی مقناطیسیت کو اپنے بے شمار الفاظ ومحاورات اور تراکیب واصطلاحات کا خراج

پیش کر چکی ہے جو آج اردو کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ اردو کا یہ مقناطیسی عمل جاری و ساری ہے جس کی درخشاں مثال قیام پاکستان کے بعد چھ دہائیوں سے متجاوز مدت پر محیط وہ غیر محسوس و لطیف امتزاجی عمل ہے جس کے نتیجہ میں پاکستان کے طول و عرض میں بولی جانے والی تمام زبانیں اور اردو یکساں و مماثل رسم الخط کی قدرِ مشترک کے ساتھ ہم آغوش ہی نہیں شیر و شکر بھی ہو چکی ہیں۔

لیکن تاریخ کے ہر دور میں اردو کے ہاتھوں شکست کھانے والے حاسد و فاسد عناصر اردو کی تہذیبی شناخت کو مسخ کرنے پر تُل گئے ہیں جس کا اظہار لاطینی یا رومن رسم الخط کی متبادل تجاویز کی شکل میں کیا جا رہا ہے۔ یہ تجاویز جو نصف صدی قبل بھی منظر عام پر لائی گئی تھیں اور جنہیں مسترد کر دیا گیا تھا تدبر باختگی کی بدترین مثال ہیں کیونکہ اب نہ انٹرنیٹ اردو سے نا آشنا ہے اور نہ سیلولر نیٹ ورک۔ اردو نستعلیق ٹائپ مروّج ہونے کے بعد سے انٹرنیٹ پر اسکین شدہ اردو ترسیلات اور سیل فونز پر اردو پیغامات ایک معمول بن چکے ہیں لیکن بہانا بنایا جا رہا ہے اُن تارکینِ وطن کو جو اردو سے دُور اور انگریزی سے قریب آتے جا رہے ہیں اولاً تو یہ حیلہ تراشی ہی بدنیتی کی مظہر ہے کہ بیرونِ ملک اردو میں زبان و ادب کے حق میں جو فضا پروان چڑھ رہی ہے اُس کا ثبوت کثرت سے منعقد ہونے والے مشاعروں اور دیگر تقریبات سے ملتا ہے۔ اردو صحافت کو بھی جو مغربی دنیا میں فروغ حاصل ہوا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ کے متعدد شہروں سے جن میں لندن اور شکاگو سرِ فہرست ہیں درجنوں کثیر الاشاعت اردو اخبارات و رسائل باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں البتہ نئی نسل کے ایسے افراد رومن رسم الخط کا سہارا لینے پر مجبور ہو سکتے ہیں جو اپنی ولادت سے سنِ شعور کو پہنچنے تک مغربی معاشرہ کا حصہ بنے رہے ہیں اور جنہیں اردو زبان کی لطافت اور فصاحت و بلاغت سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنی غیر ملکی معاشرتی، فکری اور تعلیمی نشو و نما کے باعث الف۔ ع، خ۔ کھ، س۔ ص۔ ث، د۔ ڈ اور ت۔ ٹ۔ ط کے املا میں لطیف و بلیغ فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان حروف کے متبادل انگریزی حروف کے استعمال سے وہ اردو زبان کی تہذیبی شناخت سے بھی اس حد تک نابلد ہو چکے ہیں کہ وہ 'خر' اور 'کھر' کے لیے انگریزی زبان میں ایک ہی املا یعنی 'khar' پر قانع ہیں۔ اِس باب میں المیہ تو یہ ہے کہ خود ہمارے اہلِ وطن کا ایک طبقہ جسے

اس ملک کی ’نوکر شاہی‘ پر بھی اجارہ داری حاصل ہے اردو کی مخالفت کو باعثِ تفاخر خیال کرتا ہے۔ احساسِ کمتری کے مریض یہ افراد آج تک ذہنی غلامی کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اپنی تہذیبی شناخت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

معاصر تکنیکی اور میکانیکی عمل کا حصہ بن جانے کے بعد اردو جیسی لطیف و بلیغ زبان کو لاطینی یا رومن رسم الخط کے حوالے کر دینے کا کوئی جواز نہیں۔ ایسی تجاویز مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعہ اسکین (scan) کیے بغیر اردو ترسیلات کو ممکن بنا لینا ایسا کوئی دشوار کام نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایسا ہی چیلنج اردو کی بورڈ (key board) معرضِ وجود میں آنے سے قبل بھی تھا جس کا موثر جواب دیا جا چکا ہے۔ اردو مختصر نویسی (Short Hand) کا تکنیکی نظام بھی جو مدتوں پہلے مرتب ہو چکا ہے محض اس لیے ہمارے دفاتر میں رواج نہیں پا رہا کہ ذہنی غلامی میں مبتلا نوکر شاہی سدِّ راہ بنی ہوئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم پاکستان کے مشرقی بازو سے کبھی محروم نہ ہوتے اگر بنگلہ اور اردو کا رسم الخط ایک ہوتا۔ آزادی سے قبل برصغیر میں ہندو قیادت بالخصوص مہاتما گاندھی کی طرف سے اردو کو دیوناگری رسم الخط کے تابع کر دینے کی تجاویز خارج از علت نہ تھیں جن کا ثبوت آزادی کے بعد بھارت میں اردو کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک سے ملتا ہے لیکن الحمدللہ اس زبان کو جو صلاحیتیں حاصل ہیں وہی اس کے زندہ و پائندہ ہونے کی ضامن بنی رہیں گی۔ یہ خیال بھی یکسر باطل ہے کہ اردو زبان صرف برصغیر کے مسلمانوں سے منسوب و مختص ہے۔ ماضی میں بھی اور حال میں بھی غیر مسلم اہل قلم، اہل دانش، شاعر و ادیب اردو زبان کی آبیاری میں اپنے مسلم ہم منصبوں کے شانہ بہ شانہ رہے ہیں۔ چنانچہ بھارت میں اردو رسم الخط کو قصۂ پارینہ بنا دینے کی کاوش و سازش کے باوجود اردو آج بھی ایک ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

اردو زبان کے اس مضبوط و مستحکم دفاعی حصار کے باوجود پرستارانِ اردو کو عالمگیریت کی یک لسانی یلغار سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ موجودہ چیلنج کی نوعیت تمام تر سائنسی و تکنیکی ہے۔ کمپیوٹر اور اُس کے استعمال کی بڑھتی ہوئی آفاقیت کے عمل میں ہمیں شریک بھی ہونا ہے، بھرپور استفادہ بھی کرنا ہے اور ہماری نئی نسلوں کو اسی شعبہ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا

ہے۔ معاشی ضرورتوں کے تحت نقل مکانی کا عمل ہر چند وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تاہم جغرافیائی حدود سے ماورا وطینت ہمارا ملّی تصورِ حیات ہے لٰہذا ہمیں کوئی زمانی و مکانی حریف قوتیں شکست نہیں دے سکتیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اردو رسم الخط کو فارسی و عربی نے مستحکم اساس اور خوبصورت ہیئت عطا کی ہے جس کی بدولت صدیوں پر محیط ذخائرِ علمی پر بدستور ہم اپنی گرفت قائم رکھ سکتے ہیں ہمیں اُن تمام زبانوں کے ساتھ لسانی اخوت کے رشتے بھی قائم کرنا ہیں جو آج تحقیر و تذلیل کے رویّوں کا شکار ہیں۔ عرب ممالک ہوں کہ مشرقِ وسطیٰ یا وسط ایشیائی ریاستیں، جنوب مغربی ایشیا کی اقوام ہوں یا مشرقِ قریب و بعید کے خطّے، ان تمام اکناف عالم میں تعارف و قربت کے مواقع دیگر محرکات کے علاوہ ہمیں اردو رسم الخط کے توسط سے بھی حاصل ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ تارکینِ وطن کی اردو سے عدمِ قربت کو بنیاد بنا کر رسم الخط کی تبدیلی کا جو بہانہ تراشا جا رہا ہے اس کے جواب میں ہمارے بیرونِ ملک دانشور اور شاعر و ادیب اپنی اردو پرستانہ کاوشوں کو مزید مہمیز دے کر ایک ایسا با معنی، موثر اور قابلِ قبول لائحہ عمل ترتیب نہ دے سکیں کہ بیرونِ ملک ہماری نوجوان نسلوں کے دلوں میں اپنی تہذیبی شناخت کا احساس بیدار ہو جائے۔

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۹ء)

اہلِ قلم کانفرنس اور صاحبانِ قلم

قلم ایک بے جان اور مادّی وجود سہی لیکن استعمال کے بے پناہ امکانات سے متصف ہے۔ ہر اہلِ قلم کا صاحبِ قلم ہونا ضروری لیکن ہر صاحبِ قلم، اہلِ قلم ہونے کی قید سے آزاد۔ یہ ایک مسلّمہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ کہ قلم ہی سے فکر و عمل کے مقتدر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کبھی بیک جنبشِ قلم، سر قلم کیے جانے کے احکام صادر کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی سروں پر تاج سجا دیئے جاتے ہیں۔ غرض قلم کیا ہے ایک 'حُسنِ کرشمہ ساز' جس کی گرفت میں آ کر 'کبھی خرد ہے جنوں اور کبھی جنوں ہے خرد'۔

گذشتہ دنوں اسلام آباد میں 'اہلِ قلم کانفرنس' کا انعقاد اکادمی ادبیات کے صاحبانِ قلم کی میزبانی کے مرہونِ منت ہے جس کے نووارد سربراہ نے اس ادارہ میں ''تمنا کا دوسرا قدم'' رکھا ہے۔ وہ یہ کانفرنس منعقد کرنے کے اقدام پر تہنیت کے مستحق ہیں اور ہم تہنیت پیش کرتے ہوئے اُن کی خدمت میں اہل قلم کانفرنس میں ایک معروف اہلِ قلم جناب عطاء الحق قاسمی کے اخباری کالم سے درجِ ذیل اقتباس بھی پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں کہ ہمارے مفروضے کے مطابق اُنہیں یقیناً اپنی ذمہ داریوں کا کماحقہٗ ادراک و احساس ہوگا:

> ''میں کانفرنس کے حوالے سے ایک سہو (غالباً فاضل کالم نگار نے 'روزنِ دیوار سے' ازرہِ آداب مہمانی، لفظ 'سہو' کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا ہے) کی نشاندہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ افتتاحی اجلاس میں تمام پاکستانی زبانوں کی بھرپور نمائندگی اسٹیج پر تشریف فرما پریذیڈیم کے ارکان کی صورت میں موجود تھی مگر قومی زبان اردو کے نمائندے کی عدم موجودگی بہت شدت سے محسوس کی گئی حالانکہ دیگر سینئرز کے علاوہ اردو کے ممتاز نقاد اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سلیم اختر بھی ایوان میں موجود تھے۔ انہیں پریذیڈیم میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ اس کمی کا اظہار بالواسطہ طور پر آئی۔ اے۔ رحمان نے بھی اپنی تقریر میں یہ کہہ کر کیا کہ

وہ صحافی ہیں ان کی جگہ کسی ادیب کو سٹیج پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ ان کا انکسار تھا کیونکہ وہ صرف صحافی نہیں دانشور بھی ہیں۔ تاہم اسٹیج پر اردو کے ایک تخلیقی ادیب کی موجودگی ضروری تھی۔‘‘

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

(جنوری۔ مارچ ۲۰۰۹ء)

فکر اقبال کی عصری معنویت

پاکستان اور ترکی کی دو معروف جامعات میں اپریل ۲۰۰۹ء کے دوران حضرت علامہ اقبالؒ سے منسوب بین الاقوامی کانفرنسوں کا اہتمام کیا گیا جن میں مختلف ممالک سے مشاہیر اقبالیات نے شرکت کی۔ بین المملکتی سطح پر منعقد کی جانے والی یہ تقاریب موجودہ عالمی تناظر میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسلام آباد میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے اشتراک سے منعقد ہونے والی کانفرنس کے اقبال شناس مندوبین کو جو موضوعِ گفتگو فراہم کیا گیا وہی ہمارے زیرِ نظر اداریے کا عنوان بھی ہے اور موضوع بھی کہ فکر اقبال کی عصری معنویت میں عہد حاضر کے انتہائی سنجیدہ و پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی سعی کی جاسکتی ہے جو نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ پورے عالم انسانیت کو درپیش ہیں۔ استنبول یونیورسٹی میں اگرچہ اقبال کے فکر و فلسفہ کو بالعموم موضوعِ بحث قرار دیا گیا لیکن وہاں بھی اہل دانش نے اکثر و بیشتر اقبال کے پیغام کی عملی جہتوں پر توجہ مرکوز رکھی۔ بجا کہ اقبال حکیم الامت بھی ہیں اور شاعر مشرق بھی۔ وہ مفکر پاکستان بھی ہیں اور مُصّورِ پاکستان بھی لیکن وہ ہمہ گیریت اور رفعت و عظمت جو انکا اختصاص قرار پاتی ہے قرآن کی عطا کردہ ہے اور صاحب قرآن کا فیضان کہ وہ ایک ایسی کتاب کے مفسر و مبلغ ہیں جسے تمام جہانوں۔ تمام زمانوں اور تمام عالمِ انسانیت کے لئے نازل فرمایا گیا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ”قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کی مدعی ہے“ ان کی فکر کے نمایاں عنوانات خودی۔ انسانِ کامل۔ فرد۔ جماعت۔ مملکت۔ تمدّن۔ نظامِ معیشت و معاشرت۔ تہذیب۔ ادب اور مابعد الطبیعی نظریات ہیں اقبال کے نزدیک وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت ہے (نشریہ جنوری ۱۹۳۵ء) چنانچہ اس تناظر میں جب انہیں مفکر اسلام کہا جاتا ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ مفکر انسانیت ہیں کیونکہ دین اسلام ہی دین انسانیت ہے جو خالق کائنات کا عطا کردہ اور آخری و اکمل نظام حیات ہے چنانچہ مذکورہ سیاق و سباق میں ہر دو

اجتماعات کی غایت یہی تھی کہ فکر اقبال کے حوالے سے مختلف علمی مباحث کے عملی مضمرات پر مبنی نتائج اخذ کرنے کے مقصد کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس لئے ‘‘الاقربا’’ نے منتظمین کے تعاون سے جملہ مباحث کی تفصیلی نظارت کے بعد جو تجزیاتی نکات مرتب کیے ہیں انہیں اپنے قارئین تک پہنچانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ہمارا مجموعی تاثر یہ ہے کہ استنبول اور اسلام آباد کی کانفرنسوں میں شریک فاضل و صاحبِ بصیرت مندوبین نے علامہ کے فلسفہ و فکر پر نہایت عالمانہ اور خیال افروز مقالات پیش فرمائے۔ اسلام آباد کانفرنس میں موضوع کا تعین خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا۔ کیونکہ بقول ایرانی مندوب ڈاکٹر حدّاد عادل علامہ نے اپنے کلام کو ترسیل پیغام کا ذریعہ بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کلام اقبال ‘‘علوم اسلامیہ کا اشاریہ’’ ہے جس نے یورپ کے الحادی افکار کا طلسم توڑا۔ لہذا عہد حاضر کی نسبت سے فکر اقبال کی معنویت کے درج ذیل مضمرات و مقاصد سامنے آتے ہیں۔

(۱) تہذیبی تصادم کی عالمی فضا میں اسلام دشمن طاقتوں کا سازشی کردار اور اسلامی تعلیمات کے منافی اسلام کے نام پر ہلاکت خیز رویوں کا معروضی تجزیہ

(۲) ‘‘جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم’’ کے تصور اقبال کی تعبیر و تشریح جو مشرق و مغرب کے درمیان تصادم پرور رجحانات کو بین الاقوامی اعتدال و توازن کے سانچے میں ڈھال سکے۔

(۳) جمہوریت، قومیت اور نظام حکومت کے مغربی تصور کی بے بضاعتی جسے نہ صرف اقبال نے مستحکم عقلی دلائل کی بنا پر مسترد کر دیا بلکہ نامور مغربی مفکرین و فلاسفہ نے بھی سخت تنقید کا ہدف بنایا۔

(۴) مشرق بالخصوص مسلمان ممالک میں ملوکیت اور شخصی آمریت کے سد باب کے طور پر اقبال کا پیش کردہ تصور اسلامی مملکت

(۵) اتحادِ ملت اسلامیہ کے نصب العین کے حصول کے لئے مسلم اکثریتی ریاستوں اور غیر مسلم ریاستوں میں مسلم اقلیتوں کی دینی و تہذیبی شناخت اور تحفظ حقوق کا فکر اقبال کی روشنی میں عصری صداقتوں پر مبنی لائحہ عمل کی تدوین و تشکیل۔

(۶) خطبہ الہ آباد اور علامہ کے معروف خطبات مدراس ''تشکیل الٰہیات جدید'' کے ناقابل تردید حوالوں کے تناظر میں مملکت پاکستان کے قیام۔ آئینی مبادیات۔ نیز سیاسی۔ معاشی اور معاشرتی اداروں کے ارتقاء پر نظریہ مملکت کے حوالے سے انحرافات کی نشان دہی اور اصلاحِ احوال کی تجاویز۔

علاّمہ کے فکر و نظر اور فلسفہ و حکمت ان کی زندگی ہی میں بین الاقوامی شناخت اور پذیرائی حاصل کر چکے تھے چنانچہ مشرق و مغرب کی بعض موقر جامعات میں صدر نشینان اقبال (اقبال چیئرز) قائم ہیں جہاں مسند نشینی کا اعزاز بالعموم پاکستانی محققین کے حصہ میں آتا ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں علاّمہ کی تصانیف کے تراجم ہو چکے ہیں اور خود علاّمہ کی خواہش کے برعکس کہ وہ شاعر کی حیثیت سے شہرت کے ہرگز آرزومند نہیں (عطیہ بیگم کے نام خط) ان کے منفرد اُسلوبِ شاعری پر بے اندازہ لٹریچر بھی تخلیق ہو چکا ہے اور مقرروں اور خطیبوں کی مجالس سے گزر کر شعر اقبال قوالوں اور نغمہ سراؤں تک پہنچ کر معمولات کا حصہ بن چکا ہے۔ نتیجتاً اقبال کی بصیرت کے تراشیدہ اُن ہنر پاروں اور گہرائے آبدار سے جن میں آفاقیت اور عصری معنویت کے جہان آباد ہیں عالم انسانیت بالخصوص دنیائے اسلام کماحقہ، استفادہ نہیں کر سکے۔ یہی وہ احساسِ کرب تھا کہ علاّمہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ''افسوس یہ لوگ میرے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ میرے حاشیہء خیال میں کبھی نہیں گزرا'' (روحِ اقبال)

اب جبکہ ہم تہذیبی تصادم کے حوالے سے عالمی منظر نامہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سیمول ہنگٹن (Samuel Hutington) سے منسوب تہذیبوں کے تصورِ تصادم کی جڑیں ۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۱ء کے دوران لڑی جانے والی صلیبی جنگوں میں پیوست نظر آتی ہیں۔ عہد موجود بھی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ مصائب و مسائل جن کے عنوانات جلی فلسطین۔ کشمیر۔ بوسنیا۔ کوسوو و چیچنیا اور

ایسے ہی متعدد سانحوں کی صورت میں تاریخ کے سینہ پر نقش ہو چکے ہیں وہ مسلمانان عالم کے خلاف یہود وہنود و نصاریٰ کی سازشوں اور چیرہ دستیوں کے برملا ثبوت ہیں دوسری جانب 9/11 کے سازشی سانحہ کے بعد جسے سانحاتی سازش بھی کہا جاسکتا ہے جو عالمی منظر طلوع ہوا ہے وہ اسلام کی ایک مسخ اور قبیح تصویر پیش کرتا ہے جسے مزید نفرین و ملامت کا سزاوار اُن کج فہم۔ تنگ نظر اور تدبر باختہ نام نہاد مُلائی گروہوں نے بنا دیا ہے کہ جو اسلامی تعلیمات کی روح سے یکسر نابلد ہیں چنانچہ عصر حاضر میں دہشت گردی و انتہا پسندی کا الزام ایک سازشی حکمت عملی کے تحت اور مغربی ذرائع ابلاغ کے تعاونِ مجرمانہ کے ساتھ مسلمانوں کے سر تھوپا جا رہا ہے حالانکہ امریکہ کی ایک معروف جامعہ (ایم۔ آئی۔ ٹی) کے معلم اور دانشور پروفیسر چامسکی (Chomsky) نے خود اپنے ملک کو دہشت گرد ریاست قرار دیا ہے۔ جسے خدا فراموشی کے زعم میں واحد عالمی سپر پاور ہونے کا دعویٰ ہے۔ کاش اسلامی ممالک کی تنظیم اقبال کی آرزو کی تکمیل میں اسلامیان عالم کو ساحلِ نیل سے خاکِ کاشغر تک متحد و متفق کر سکے۔ کہ وسائل و قوت کے اعتبار سے متحد عالم اسلام بفضل خدا، امریکہ کی نسبت عظیم تر قوت کا مالک ہے۔

اقبال نے اپنی رحلت سے قبل ۱۹۳۸ء ہی میں (نشریہ) دنیا کو متنبہ کر دیا تھا کہ ’’قومی اتحاد کو مستقل قوت نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس سے بالاتر ایک اتحاد ہے اور وہ ہے عالمگیر اخوت جو رنگ و نسل اور زبان سے بالاتر ہے۔ انسانی زندگی کو اس کرہء ارض پر سکون و مسرت اُس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتا جب تک پُر فریب جمہوریت، مکروہ قومیت پرستی اور دُوں نہاد سامراجیت کو نیست و نابود نہیں کر دیا جاتا۔ جمہوریت۔ مساوات اور انصاف کے خوبصورت الفاظ کھوکھلے نعرے ہیں‘‘ چنانچہ آج ضرورت ہے کہ فکر اقبال کی عصری معنویت کو مغربی دنیا پر واضح کیا جائے کہ ’’جمعیت اقوام‘‘ کا تصور ناقص اور ’’جمعیت آدم‘‘ کی حقیقت اٹل اور ابدی ہے اور یہی عالمی امن و سلامتی کی ضمانت دے سکتی ہے۔

جمہوریت قومیت اور نظام حکومت کے تصورِ باطل کی قلعی نہ صرف اقبال نے کھول کر رکھ دی ہے بلکہ خود مغربی مفکرین و فلاسفہ کو بھی ان پر شدید اعتراضات ہیں۔ مغربی جمہوریت کا تصور

یونانی الاصل ہے جو بادشاہت اور پاپائیت کے سیاسی استبداد۔ مذہبی تشدد اور محکومی و غلامی کے خلاف شدید ردعمل کے طور پر وجود میں آیا سقراط نے جمہوریت کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ کارلائل نے اسے احمقوں کی حکمرانی سے تعبیر کیا اور روسو نے اسے اعلیٰ تعلیم کے بغیر مسترد کر دیا اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک قیام یورپ کے دوران مغرب کے نظام سیاست کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا۔ اقبال کے نزدیک اس نظام میں حکومت کی باگ ڈور اعلیٰ دماغوں کی بجائے متوسط اور ادنی ذہن رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بقول ان کے ''جمہوریت شمار کرنا تو جانتی ہے لیکن وزن کرنا نہیں جانتی جس کے بغیر ہیئتِ اجتماعیہ میں عدل و انصاف قائم نہیں رہ سکتا''۔ اس کے برخلاف علاّمہ نظام اسلامی کو متبادل کے طور پر پیش فرماتے ہیں کہ اسلام نہ وطنیت ہے نہ شہنشاہیت بلکہ ایک ایسی زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرا سکتی ہے (خطبہء الہ آباد) چنانچہ اسلامی نظام حکومت نہ ملوکیت ہے نہ جمہوریت نہ بادشاہت بلکہ ان تمام کے محاسن کا امتزاج ہے۔

اقبال کے خطبات جو مدراس۔ علی گڑھ اور حیدر آباد (دکن) کے لیکچرز پر مشتمل ہیں مسلم اُمہّ کے لئے نسخہء کیمیا کا حکم رکھتے ہیں یہ سیاسی۔ عمرانی اور حیات اجتماعی کے ان تمام نظریاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں جو قومیت و وطنیت کی قیود سے ماورا ہیں اور ایک ایسی اسلامی ریاست کے خدّ و خال واضح کرتے ہیں جن کو عملی شکل دے کر عالم اسلام متحد بھی ہو سکتا ہے اور باقی دنیا کو بھی ہم وجودیت اور بین المذاہب ہم آہنگی کا پیغام دے سکتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے ایک طرف تو یورپ کا نقشہ بدل ڈالا تو دوسری طرف خلافت عثمانیہ کے تار و پود بکھر جانے کے بعد مسلمانوں کے ریاستی ادارے بھی منہدم ہو گئے اور عالمِ افکار میں ایک زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ایشیا میں بالعموم قومی تشخص کا اضطراب رونما ہوا۔ نظریاتی طور پر یورپی افکار کی عمارت کے ستون بھی متزلزل ہو گئے۔ اس عہد کو ۱۸۵۷ء کی تحریک مزاحمت اور انیسویں صدی کی آخری دہائی میں علمائے حق کی شہادت کے بعد قومی بیداری کے آغاز کا دوسرا مرحلہ کہا جا سکتا ہے اس مرحلہ پر مسلمانوں کے ملی وجود کو حکیمانہ سہارا مہیا کرنے کے لئے قدرت نے علاّمہ کا انتخاب کیا۔ علاّمہ کا خیال تھا کہ ''عصر

حاضر کو آج ایک ایسے رومی کی ضرورت ہے جو دلوں کو زندگی، امید اور ذوق وشوق کے جذبات سے معمور کر دے‘‘ (خطبات) یہ الگ بات ہے کہ رومیؒ کی شاعری سے ترکوں نے قومی نصب العین کی تنظیم میں کبھی فائدہ نہیں آٹھایا۔ اسی طرح فارسی شاعری ’’غزل خواں رہی، حُدی خواں نہ ہو سکی‘‘۔ اقبال کی شاعری میں ہمیں ایک مربوط نظامِ فکر ملتا ہے۔ انہیں مقابلۃً ’’ساز گار زمانہ ملا لیکن ان کے فکر کی عصری روح آج تک آشکار نہ ہو سکی اس اعتبار سے اسلام آباد کانفرنس کے نصب العین کے حصول کے لئے اگر مربوط و منظّم مساعی کی جائیں تو یہ کانفرنس ایک اہم سنگِ میل ثابت ہو سکتی ہے۔

اس کانفرنس کی توجہ کا مستحق ایک نہایت اہم موضوع یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ مسلم اکثریتی ریاستوں اور غیر مسلم ریاستوں میں مسلم اقلیتوں کی دینی و تہذیبی شناخت اور تحفظ حقوق کو فکر اقبال کی روشنی میں یقینی بنانے کے لئے کس نوع کے لائحہ عمل کی ضرورت ہے اور وہ اس لئے کہ بدقسمتی سے اسلامی ممالک کی تنظیم جو نصف صد سے متجاوز ایسے آزاد و خود مختار ممالک کی رکنیت پر مشتمل ہے جو دنیا میں تیل کی دولت کے ذخائر کی بھاری اکثریت پر تصرف رکھتے ہیں ان ممالک کے مسلمانوں کو دستِ اعانت مہیا کرنے میں ناکام ہو گئی ہے حالانکہ دنیا کی پانچ ارب آبادی میں تقریباً سوا ارب مسلمان شامل ہیں۔ یورپی ممالک میں مسلم اقلتیں تبدیلی کے ایک مسلسل عمل سے گزر رہی ہیں۔ مشرقی یورپ میں مسلم اقلیتوں کا وجود ماضی میں مسلمانوں کی طویل موجودگی کا رہینِ منت ہے۔ مغربی یورپ میں مسلمان بالخصوص اپنی شناخت کو مستحکم بنانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ روسی ریاستوں میں مسلمانوں کی تاریخ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد نہایت کربناک دور سے گزری ہے عربی زبان کی تدریس کا نظام اور رسم الخط ختم کر دیا گیا اور تہذیب و عقائد کو ملیامیٹ کر دینے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تاہم چین میں مسلمانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اسلام کے احیائے جدید کے آثار نمایاں ہیں۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں اقلیت ہونے کے باوجود مسلم آبادی بیس کروڑ سے متجاوز ہے لیکن انہیں ایک ہزار سال سے زیادہ حکومت کرنے کی مسلسل سزا دی جا رہی ہے۔ باقی ایشیا میں جہاں مسلمان پہلی صدی ہجری میں داخل ہوئے وہاں انکے مراکز سری لنکا۔ فلپائن۔ تھائی لینڈ اور برما وغیرہ میں

موجود ہونے کے باوجود طاغوتی یلغار کے نشانے پر رہے ہیں اور ہیں البتہ افریقہ جو مسلمان دنیا کا قلب ہے آج بھی مسلم اقلیتوں کے اثر و نفوذ کی گواہی دے رہا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں مورخ شریف الادریسی کا مدلّل انکشاف کہ اندلیسی مسلمان امریکہ کے براعظم میں کولمبس سے بہت پہلے قدم رکھ چکے تھے آج بھی مغربی دنیا کے قلب میں پیوست ایک کانٹے کی چبھن بنا ہوا ہے بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامک کانفرس باہمی نفاق و عدم اعتماد کی فضا سے باہر نکلے۔ مغربی و امریکی تغلّب کو مسترد کر دے اور مسلم اُمہّ کے اتحاد و یک جہتی پر توجہ مرکوز کرے۔

اور آخر میں پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشہ پر ایک آزاد و خود مختار اسلامی مملکت کے طور پر نمودار ہوا اسکا قیام یقیناً علامہ کے خواب کی تعبیر تھا ایک عجیب حُسنِ اتفاق جو غالباً محروم توجہ رہا یہ تھا کہ ریاست مدینہ (City state of Madina) کے قیام کے وقت دنیا جس طرح دو عالمی طاقتوں قیصر و کسریٰ کے درمیان ہدفِ آزمائش بنی ہوئی تھی بالکل ایک مماثل صورتِ حال اُس وقت بھی تھی جب امریکہ و روس جیسی دو بڑی طاقتوں کی آویزش کے دوران پاکستان عالم وجود میں آیا چنانچہ ہمارے سامنے آنحضورؐ کی خارجہ پالیسی کے رہنما خطوط موجود تھے جن پر عمل پیرا ہو کر ہم ریاستی پالیسی کا تعین کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' اشاعت پذیر ہوئے تو کتاب کے دیباچے میں قائداعظمؒ کا مبنی بر حقیقت انکشاف پاکستان کی نظریاتی بنیاد کی خشتِ اوّل بن گیا کہ ''اقبال نے اپنے خطوط میں اسلامی ریاست کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے مجھے ان سے مکمل اتفاق ہے'' لیکن بد قسمتی کہ چھ دہائیوں سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی پاکستان میں اسلامی ریاست کے تصورِ اقبال کو عملی شکل نہ دی جا سکی۔ اور وہ مغربی جمہوریت جو شمار کرنا تو جانتی ہے لیکن وزن کرنا نہیں جانتی آج بھی اہل پاکستان کی بد قسمتی کا عنوان بنی ہوئی ہے اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ملک میں جتنے آئین مرتب ہوئے انہیں لفظِ اسلام سے سجایا تو گیا لیکن اسلام کی روح سے دور رکھا گیا۔ علاّمہ ''اجتہاد'' کو جو اسلامی قانون سازی کا ایک اہم ماخذ ہے اجتماعی فکر و ذہانت سے مشروط کرتے ہیں کیا ہمارے ارکان پارلیمان کی اجتماعی فکر و ذہانت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ جن میں ''نہ

معرفت۔ نہ محبت نہ زندگی نہ نگاہ“ فرزند اقبال محترم جسٹس (ر) جاوید اقبال کا مقالہ ”اقبال کا تصور اجتہاد“ ایک بلیغ کاوش ہے علاّمہ کے اُس مضمون کی روح کو تازہ کرنے کی جس کا عنوان ”اسلامی قانون میں اجتہاد کا تصور“ تھا اور جسے بعد میں مدراس لیکچرز میں شامل کیا گیا یہی نہیں بلکہ رہنمائی کے لئے علامہ کا وہ لیکچر بھی اہل دانش کی توجہ چاہتا ہے جو انہوں نے ”اسلام میں اجتہاد“ کے موضوع پر اسلامیہ کالج میں ارشاد فرمایا تھا کاش ہماری ان بین الاقوامی کانفرنسوں میں سے کوئی بھی (خاص طور پر اسلام آباد کانفرنس) فکر اقبال کی عصری معنویت کے حوالے سے ایسا منشور مرتب کر دیتی کہ وہ کم سے کم اُن مذکورہ چھ نکات کا احاطہ کر لیتا جو آج پاکستان کی بھی ضرورت ہے اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ کی بھی۔

(اپریل۔ جون ۲۰۰۹ء)

سائنس اور ادب............تعاون وتصادم کے عوامل

رواں صدی میں انسان جس سنگین ترین صورت حال سے دو چار ہے اسے بوجوہ ''معرکہء روح وبدن'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے سائنس اور ادب دو ایسے شعبے ہیں جو حیات انسانی کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے باہمی ربط وتعاون کی نوعیت پر فلاح انسانی کا انحصار بھی ہے اور تخریب وتباہی کا امکان بھی۔ ہر دو شعبہ جات میں تعاون وتصادم کے عوامل یکساں طور پر کارفرما ہیں۔ تاہم طریق کار کے اختلاف کے باوجود دونوں ہی انسانیت کے لیے تمول وثرت پر مبنی مواد پیش کرنے پر قادر ہیں۔ ادب متلاشی اذہان کو آگہی اور صاحب فہم لوگوں کو تجربہ عطا کرتا ہے جبکہ یہی اوصاف سائنس کو بھی حاصل ہیں۔ ہر دو اپنے ذیلی شعبوں یعنی ریاضی۔ طبعیات۔ کیمیا۔ حیاتیات۔ طب اور ہیئت وہندسہ وغیرہ کی سائنسی شاخوں اور اصناف ادب یعنی غزل قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ افسانہ۔ خاکہ۔ ناول اور ڈرامہ وغیرہ کے توسط سے مسلسل وسعت پذیر ہیں اور نہ صرف دونوں میں تجربات ممکن ہیں بلکہ تجربے کے عمل کی وسعت وہمہ گیری نے حیات وکائنات کو انقلابات کی زد پر لا کھڑا کیا ہے۔ سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی کو سائنسی انقلابات کے واضح ارتقائی عمل کی مظہر اور انیسویں صدی کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے رابطے کی صدی کہا جاسکتا ہے۔

اس قول کے مطابق کہ ادب کے بغیر سائنس نامکمل ہے اگر ہم عالمی زبانوں کے ادب پر نظر ڈالیں تو اردو ادب کا ماضی خاصا متمول نظر آتا ہے ۱۹۴۷ء میں تقسیم برصغیر سے پہلے تقریباً ساڑھے تین سو سال کا دور سائنسی مضامین کے ترجمہ وتالیف کا دور تھا اس لیے کہ اس عہد میں یہ شعور ہمارے بزرگ اہل قلم کے اذہان میں جڑیں پکڑ چکا تھا کہ ملک وقوم کی علمی ترقی کے لیے ادبی تصنیفات وتراجم کے پہلو بہ پہلو فنی اور سائنسی کتابوں کے تالیف وترجمہ کا کام بھی بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں نہ لسانی تنگ دامانی کا کوئی عذر پیدا ہوا اور نہ اہل اردو کو اپنی زبان کی تہی دستی کا احساس ہوا اردو زبان کو ادب کے میدان سے ہٹ کر دیگر علوم وفنون سے متعارف کرانے کا

کام سولہویں صدی عیسوی ہی میں شروع کر دیا گیا تھا جو انیسویں صدی میں معراج کمال کو پہنچا اس دور کے تراجم اور تالیفات اردو زبان کی عظمت اور مستقبل کی ترقی کے امکانات کے آئینہ دار ہیں اس سلسلے میں دہلی کالج۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور انجمن پنجاب نے جو تاریخ ساز کردار ادا کیا وہ اہل علم وخبر کے سامنے ہے جس کے نتیجے میں سائنسی مضامین مثلاً ریاضی۔ طبیعیات۔ کیمیا۔ حیاتیات۔ طب اور ہیئت پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں اور یہ ثابت کر دیا گیا کہ اردو اگر فلسفہ و منطق اور تصوف و معرفت کے سنجیدہ مسائل کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے تو علمی وفنی اور سائنسی موضوعات پر رموز ونکات پیش کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے چنانچہ علم طب۔ موسیقی۔ جنسیات حیوانیات۔ علم ہیئت وہندسہ اور طبیعیات پر قدیم ترین اردو مخطوطات دستیاب ہو چکے ہیں جو انڈیا آفس لائبریری لندن۔ امپیریل لائبریری کلکتہ اور ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد (دکن) نیز جامعہ عثمانیہ اور بعض دیگر کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

اس کے باوجود یہ الگ ایک المیہ ہے کہ ہم آج بدترین احساس کمتری کا شکار ہو چکے ہیں اور نسل نو اپنے ماضی کے اثاثوں سے نابلد و بے خبر ہے حالانکہ سلطنت روما کے زوال کے بعد تقریباً چار صدیوں تک علوم وفنون کی ترقی کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا جنہوں نے سائنسی علوم کے اغراض ومقاصد کو سرگرمی سے آگے بڑھایا اور پھر ان سے یورپی اقوام کو متعارف کرایا۔ چنانچہ آج سائنس ترقی کی جس معراج پر نظر آتی ہے وہ مسلمانوں کی کاوش وتحقیق کے مرہون منت ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل مغرب نے سائنسی ارتقاء کے اس عمل کو جس نقطہ عروج پر پہنچایا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا تنگ نظری ہوگی انسان ۱۹۶۹ء میں چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ کرۂ ارض پر سائنس اور اس کے عملی استعمال نے مختلف اقوام کے معیار زندگی کو معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بلند کیا ہے آج زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو سائنسی ایجادات سے بہرہ مند نہو۔ سائنس ایک طرز زندگی بن چکی ہے لیکن مسلم ممالک اپنی ذہنی وفکری صلاحیتوں کے باوجود خواب خرگوش کی جس نشہ آور کیفیت کے مریض بن چکے ہیں وہ باعث شرم بھی ہے اور موجب ملامت بھی، آئن سٹائن کا یہ قول غالباً ہم مسلمانوں کو لمحہ فکریہ مہیا کرتا ہے کہ:

''سائنس سے بے خبری دورِ حاضر کا بدترین جرم ہے''

عمرانی علوم اور ادب ایک دوسرے کے معاون ہیں اور دونوں کا مطمحِ نظر انسان اور اس کے رویوں کی تفہیم ہے لیکن اگر ہم گزشتہ پانچ چھ دہائیوں کا اردو تخلیقاتِ نظم و نثر کے حوالے سے معروضی جائزہ لیں تو علمی انحطاط کا عنصر خاصا غالب نظر آتا ہے حالانکہ ادب تخلیق اور سائنسی انکشاف کی دو متصل مملکتیں ہیں اور ان کے مربوط رویے ہی انسانی معاشرہ کو اعتدال کے ذریعہ پُر امن اور ارتقاء پذیر زندگی کی نوید فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو کے اکثر اہل قلم نے خود کو انشاء پردازی۔ شاعری۔ تنقید نگاری اور افسانہ نگاری تک محدود رکھا اور دنیائے علم و فن سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ناواقف و بے بہرہ رہے۔ اردو زبان و ادب کی جتنی تاریخیں یا تبصرے شائع ہوئے ہیں ان میں سائنسی کتابوں کا یا تو سرے سے ذکر ہی نہیں ہے یا دو ایک میں خال خال یہ ذکر آیا ہے البتہ مولوی محمد یحییٰ تنہا کی ''سیئر المصنفین'' میں شمس العلماء منشی ذکا اللہ کی سائنسی تالیفات کا بالالتزام ذکر ملتا ہے انہوں نے سائنسی علوم کی تقریباً ایک سو کتابوں کا ترجمہ کیا تھا جن میں ریاضی طبیعیات و ہیئت اور تاریخ و جغرافیہ کی کتب شامل تھیں۔

گوئٹے نے کہا تھا کہ ''ادب کا زوال قوم کے زوال کا مظہر ہوتا ہے'' اس کا المناک ثبوت ہمارے عصری اردو ادب بالخصوص شعری تخلیقات کی بے بضاعتی سے ملتا ہے۔ ہمارا عہد بدقسمتی سے معیار نہیں مقدار کا عہد بن کر رہ گیا ہے آئے دن شعری مجموعوں کی تقاریب رونمائی، مقررین کی تحسینِ ناشناس اور پیشہ ور تقریظ نگاروں کا پستہ قدوں کو سرو قامت قرار دینا ایک ایسے ہی منظر نامے کا بصارت سوز حصہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان حضرات میں گمنامی اور بدنامی کے درمیان امتیاز کرنے کا شعور ہی خود نمائی کے جذبہ میں دفن ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات میں تصویروں کی اشاعت کو عظمت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن یہ انبوہِ بے خبراں نہیں جانتا کہ مستقبل کا باشعور مورّخ یا نقادان کو درخورِ اعتنا سمجھنے کا بھی روادار نہیں ہوگا کہ تاریخ میں معیار و مقدار کا فرق کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا ورنہ ''یک دیوانی'' شاعر مرزا اسد اللہ غالب کو آج کوئی نہ جانتا نہ مانتا۔ یہ حقیقت اُن صاحبانِ فہم کے لیے ایک انتباہ ہے جو بے جان اور روح باختہ شعری مجموعوں کی

کثرت کو شاعرانہ عظمت پر محمول کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

زوال وانحطاط گذیدہ شعر وادب کی اس صورت حال میں انسانیت کے اس نقطہ نظر کی ترجمانی جو ادب ہی کے ذریعہ ممکن ہے امر محال بن گئی ہے اور اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ وہ عمل خلفشار کا شکار ہو چکا ہے جو ادب کے ذریعہ انسانی اذہان کو بصیرت اور سائنس کے ذریعہ تسخیر کائنات کا ولولہ عطا کرتا ہے چنانچہ نیوکلر سائنس کی تازہ ترین ایجادات جہاں انسانی معاشرے میں تعمیری انقلابات لانے کا سبب بنی ہیں وہیں یہ امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دنیا یک لخت کسی عالم آشوب میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے برنارڈ شا کا یہ قول کہ ''سائنس ہمیشہ غلط ہوتی ہے اس نے بغیر مسائل پیدا کیے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔'' بظاہر یک طرفہ سوچ کا آئینہ دار ہے لیکن اپنے عملی مضمرات میں حقیقت کی آمیزش بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ بیم ورجا کے اس عصری تناظر میں جبکہ ادب اور سائنس دونوں بے لگام ہو چکے ہیں غالب کا درج ذیل شعر اپنی ابدی معنویت کے ساتھ افق ذہن پر طلوع ہوتا ہے۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(جولائی۔ستمبر ۲۰۰۹ء)

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء....... اہداف وترجیحات

زہے نصیب کہ ایک طویل مشق ومشورت کے بعد وزارتِ تعلیم نے قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء پر مبنی دستاویز گزشتہ اگست میں آخری نظرثانی کے بعد جاری فرمادی ہے۔ یہ ضخیم دستاویز نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے ہمیں اسے حرف بہ حرف پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور وفاقی وزیر معارف کا وہ بیان بھی (مطبوعہ اخبارات مورخہ ۱۱ستمبر ۲۰۰۹ء) جس میں انہوں نے ارشاد فرمایاہے ''کہ وہ اپنے بچے سرکاری سکول نہیں بھیج سکتے کہ مرضی کی تعلیم دلانا ہرایک کا حق ہے (البتہ) تعلیم کا معیار بہتر بنائیں گے''۔ رواں پالیسی پر نظرثانی کے کام کا آغاز ۲۰۰۵ء میں کیا گیا تھا اور ۲۰۰۷ء میں ''جو قرطاس ابیض'' جاری کیا گیا۔ اُسے زیرنظر پالیسی کی بنیاد بنایا گیا ہے جو ۲۰۱۰ء سے ملک میں نافذ العمل ہوگی۔ اس ضمن میں دیگر طبقات بشمول ماہرین تعلیم نیز چاروں صوبوں کے وزرائے تعلیم سے مشاورت کا عمل بھی مکمل کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ تعلیم صوبائی دائرۂ اختیار میں شامل ہے البتہ آئین کے تحت قانون سازی کی وفاقی اور صوبائی فہرستوں کے علاوہ ایک متوازی ومشترک فہرست بھی ہے جس کے تحت صوبوں اور وفاق دونوں کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہے چنانچہ اس فہرست کے تحت وفاق کو یہ اختیار حاصل ہے کہ تعلیم کے حوالے سے پالیسی مرتب کرے اور صوبوں کی ذمہ داری ہو کہ وہ وفاق کی مرتب کردہ پالیسی پر یکساں عملدرآمد کریں۔

وفاقی وزیر موصوف کے بیان میں، قطع نظر اس کے کہ یہ کس کی ذمہ داری ہے، واضح اشارہ موجود ہے کہ سرکاری سکولوں کی حالت ناقابل رشک ہے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے جو ازروئے آئین پاکستان کی قومی زبان ہے۔ نظام تعلیم میں ابتری کا ایک بنیادی سبب ہمارا نوآبادیاتی ماضی ہے جس کی گرفت ہماری قومی نفسیات پر آج بھی نہایت مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا میں ہمارا نظام تعلیم پسماندہ ترین ہونے کی تہمت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض افریقی ممالک بھی جن میں ایتھوپیا، موزمبیق، گھانا، نائجیریا، کینیا اور مالی شامل ہیں، ہم سے بہتر ہیں۔ ہمارے ناقص

نظام تعلیم کے اثراتِ بد ملک میں جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ بالادستی کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس نظامِ حیات کو جمہوریت سے تعبیر کرنا بدترین خوش فہمی ہے۔ طبقاتی تقسیم کے عفریت کو جب تک نظام و نصابِ تعلیم سے خارج نہیں کر دیا جاتا اُس وقت تک اصلاحِ احوال ممکن نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے ذریعۂ تعلیم کی عدم یکسانیت ہمارے قومی تشخص کی قاتل بنی ہوئی ہے اور یہ ہلاکت آفریں عمل اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک قومی زبان اُردو پر برطانوی نوآبادیاتی عہد کی یادگار انگریزی زبان اور امتحانی نظام کی تفریق ہماری قومی زبان پر بحیثیت ذریعۂ تعلیم مسلط رہے گی۔ مملکت کی آئینی ذمہ داری ہے کہ غریب و امیر کے فرق سے ماورا شہریوں کو تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرے لیکن ایسے آثار زیرِ نظر پالیسی میں کہیں نظر نہیں آتے چنانچہ وزیرِ تعلیم اگر اپنے بچوں کو اپنے ہی زیرِ انتظام (سرکاری) سکولوں میں بھیجنے کے لئے تیار نہیں تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ کی بصیرت نے اردو کو قومی زبان کا منصب اسی لئے عطا فرمایا تھا کہ یہی قومی اتحاد کا طاقت ور ترین وسیلہ ہے اور ملک کے مختلف لسانی علاقوں کے درمیان ربط و تعلق اور افہام و تفہیم کی ضمانت بھی لیکن تعلیمی شعبے میں قومی تعمیر و ترقی کے اس عمل کو تفکر باختہ اذہان کی مخالفت ہی نہیں بلکہ مخاصمت کا سامنا ہے۔

کوئی بھی تعلیمی حکمت عملی وضع کرتے وقت یہ دیکھنا ناگزیر ہے کہ آئندہ نسل کی مقتضیات کیا ہیں۔ تعلیم انفرادی اجتماعی اور قومی فروغ و ارتقاء کے باب میں انسانی صلاحیتوں کے تمام تر امکانات کو بروئے کار لانے میں ایک موثر ترین عامل کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ ایک ایسا بامعنی نظامِ تعلیم ہی پاکستان کو روشن خیال اور ذمہ دار شہری مہیا کر سکتا ہے جو اکیسویں صدی کے “مرتکز بہ انسانیت” معاشی ترقی کے منظر نامے میں ملک کو ایک باعزت مقام دلا سکے لیکن بدقسمتی سے چھ دہائیوں سے زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود آج تک کوئی ایسا نظام تعلیم بروئے عمل نہیں لایا جا سکا۔ تعلیم کے شعبہ میں ناقص کارکردگی کے دو بنیادی سبب یہ ہیں کہ اولاً تعلیم کی نسبت ہیئت مقتدرہ میں اُن اذہان کا قریب قریب فقدان ہے جو انگریزی زبان کی مرعوبیت سے آزاد ہوں اور اپنی لسانی و تہذیبی اقدار پر ایمان و ایقان کے جذبہ سے سرشار۔ ثانیاً عمل درآمدی نظام یا تو انتہائی

ناقص اور غیر موثر ہے یا سرے سے اس کا وجود ہی نہیں۔ ۲۰۱۰ء سے نافذ ہونے والی پالیسی میں عمل درآمد سے متعلق ایک باب یقیناً موجود ہے اس میں وفاقی وزارت تعلیم کا کردار صرف رابطہ و تسہیل کاری تک محدود ہے باقی جملہ امور صوبائی حکومتوں کی صوابدید پر موقوف ہیں البتہ ایک خوش آئند پہلو یہ ضرور نظر آتا ہے کہ وفاق اور صوبوں کے وزرائے تعلیم پر مشتمل ایک عملدرآمدی حلقہ کا قیام ہم آہنگی کو یقینی بنانے کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ یہاں ہم خصوصاً اردو زبان و ادب کی تدریس سے متعلق جو صوبوں اور وفاق میں شدید عدم آہنگی کا شکار ہے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبۂ اقبالیات کے صدر نشیں ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کی کتاب ‘‘پاکستان میں تدریس اردو’’ کا حوالہ دینا چاہیں گے جو گزشتہ سال ہی طبع ہوئی ہے تاکہ وہ ‘‘حلقہ مقتدرہ’’ جس کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے، اس سے استفادہ کر سکے کہ یہ ایک ایسی جامع و مستند تحقیق پر مبنی ہے جو ملک میں موجود نہ صرف نصابی خلفشار کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ حل بھی تجویز کرتی ہے۔

پاکستان میں تعلیمی حکمت عملی کی تاریخ بے بصری و بے عملی سے عبارت نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد جو پہلی تعلیمی کانفرنس نومبر ۱۹۴۷ء میں منعقد ہوئی تھی، اُس کے نام حضرت قائداعظمؒ کے پیغام میں رہنما خطوط مہیا کر دیئے گئے تھے جن میں منجملہ دیگر نکات اہل پاکستان کے ذہنی و فطری میلانات، تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگی نیز جدید اور ارتقائی عوامل سے مطابقت رکھنے والی تعلیمی حکمت عملی وضع کرنے پر زور دیا گیا تھا لیکن ہوا یہ کہ آئندہ نصف صدی یعنی ۱۹۹۸ء تک دوسری تعلیمی کانفرنس منعقد ہونے تک جو کم و بیش آٹھ یا دس دستاویزات مرتب کی گئیں وہ سب حرفِ غلط ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ تیسری تعلیمی کانفرنس جو ۲۰۰۶ء میں منعقد ہوئی اُس کا بھی ‘‘تخلیقی شاہکار’’ وہ تعلیمی پالیسی ہے جس کے بعد سال ۲۰۱۰ء سے نئی تعلیمی پالیسی (۲۰۰۹) کا اعلان اب کیا گیا ہے۔ یہ پالیسی بھی اپنی پیش رو پالیسی کی طرح نجی شعبہ کی تعلیمی کاروباریت سے مغلوب نظر آتی ہے اور انگریزی ذریعہ تعلیم پر اس کے باوجود مُصر کہ مروجہ اشرافی نظامِ تعلیم نے جس کے دروازے متوسط و زیریں طبقات پر بند رہے، زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہرین تو پیدا کر دیئے لیکن ثانوی سطح پر پیشہ ورانہ اعانت مہیا کرنے والا طبقہ مطلوبہ معیار کے

مطابق فراہم نہ کر سکا جس کا واحد سبب طبقاتی نظامِ تعلیم اور سرکاری سکولوں کو مستحقہ توجہ سے محروم رکھنا ہے۔

ماضی کے پس منظر کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ زیرِنظر پالیسی ناقابل حصول اہداف مقرر کرنے میں اپنی پیشرو تمام پالیسیوں کو پیچھے چھوڑ گئی ہے حالانکہ ہزاروں کی تعداد میں بند پڑے ہوئے سکولوں کے احیاء ہی کو اگر توجہ کا مستحق سمجھا جاتا تو ایک بہت بڑا خلا پُر ہو سکتا تھا سال ۲۰۱۵ء تک مجموعی قومی پیداوار کا سات فیصد مختص کر دینے کا بلند بانگ ہدف تو تعلیمی شعبہ کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے لیکن برسرِزمین حقائق یہ ہیں کہ گزشتہ سال کے دوران ۲ء۴ فیصد جو ہدف متعین کیا گیا تھا اُسے گھٹا کر ۲ء۱ فیصد کر دیا گیا بلکہ اخراجات عملاً ۱ء۷ فیصد سے بھی تجاوز نہ کر سکے چنانچہ اس تناظر میں یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ۲۰۱۵ء تک مفت پرائمری تعلیم کو یقینی بنایا جا سکے گا اور بالغ خواندگی کی شرح کو ۸۶ فیصد تک نیز اعلیٰ تعلیم کو ۴ء۷ فیصد سے ۱۰ فیصد تک پہنچا جا سکے گا بلکہ دعویٰ تو یہاں تک کیا گیا ہے کہ ۲۰۲۰ء تک ۱۵ فیصد اعلیٰ تعلیم کا ہدف حاصل کر لیا جائے گا جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ان اہداف کے حصول کے لئے کوئی جامع لائحہ عمل تجویز نہیں کیا گیا ہے۔ زیرِنظر پالیسی کے جس باب میں عملدرآمدی ڈھانچے کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بھی عملی فعالیت سے محروم نظر آتا ہے۔ بدعنوانی ایک اور ایسا ناسور ہے جو کسی بھی تعلیمی پالیسی کے راستے کا سب سے بڑا پتھر ہے۔ ان حالات میں تعلیمی پالیسی مسائل کا حقیقی حل پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے کیونکہ اس کا تمام تر انحصار سیاست زدہ انتظامی ڈھانچے پر ہے جس کی اپنی استقامت اس لئے مشکوک ہے کہ ۲۰۱۵ء یا ۲۰۲۰ء تک موجود ہیئتِ مقتدرہ کے تسلسل کی کوئی ضمانت موجود نہیں کہ وطنِ عزیز کی تمام تاریخ اس مقولے کے گرد گھومتی نظر آتی ہے کہ ’’ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت‘‘۔

ہماری تاریخ تو یہ ہے کہ ہر سال ایک فیصد شرح سے بھی خواندگی میں اضافہ نہیں ہوا۔ جبکہ مجموعی قومی پیداوار کے حوالے سے تعلیمی اخراجات میں ہم خطے کے چھوٹے چھوٹے ممالک سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ نیپال میں یہ شرح ۳ء۴ فیصد، ایران میں ۴ء۷ فیصد اور مالدیپ میں ۷ء۵ فیصد

ہے جبکہ ہم گزشتہ برس صرف ۲ء۱ فیصد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے یہاں سیاست کاری کا عمل اس حد تک نا قابلِ رشک ہو چکا ہے کہ اندرون اور بیرون ملک ہمارے قول و عمل کے تضاد نے ہمارے قومی وقار کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ دنیا میں کہیں تعلیمی نظام کا کوئی جزو وزارتِ تعلیم کے حیطۂ کار سے باہر نہیں لیکن پاکستان کی زیرِ نظر تعلیمی پالیسی میں دینی مدارس کو وزارتِ داخلہ کے حوالے کر دیا گیا ہے جبکہ ان مدارس کے ساتھ ساتھ اور نجی تعلیمی درسگاہوں کا سہ رخی نظام منضبط و مربوط طریق کار سے محروم نظر آتا ہے اور نجی شعبہ کی پیدا کردہ کاروباری بے لگامی اور واضح طبقاتی برتری سے مغلوب۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قیادت کے بحران سے قطع نظر، ہمارا قومی منظر نامہ بے جہتی کا چشم آشوب بن گیا ہے اور اہم ترین قومی موضوعات جن میں تعلیم سرفہرست ہے، ہمارے فکری سیاق و سباق سے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ۲۰۰۹ء کی تعلیمی پالیسی ہمارے قومی افق پر طلوع ہوئی تو آئے دن کے سیاسی ہیجانوں میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ یہاں کے ماہرین و اہل فکر و دانش کے اُس ردعمل سے بھی محروم رہی جن سے باخبر ہونا قوم کا حق تھا۔ غنیمت تھے وہ چند اخباری تبصرے جنہوں نے اس اعلامیہ کا استقبال کیا۔

''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا''

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۹ء)

فیض میزانِ عصر میں

سالِ رواں جناب فیض احمد فیض مرحوم کی ولادت کا ۹۹ واں سال ہے۔ وہ ۷ جنوری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ حسنِ اتفاق کہ سیالکوٹ کو حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا بھی مولد و منشا ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ بھی ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ فیض کے فکر و فن پر جن نابغۂ روزگا شخصیات (بحثییت شاعر) کے عمیق اثرات مرتب ہوئے ان میں حافظ و غالب کے علاوہ اقبال بھی ہیں بلکہ اہلِ نقد و نظر نے انھیں بجا طور پر غالب و اقبال کی شعری روایت کا تسلسل ہی نہیں امین بھی قرار دیا ہے۔ فیض کے والد گرامی کے (جو ایک ممتاز وکیل تھے) حضرت علامہ سے قریبی مراسم تھے اور یہ بھی ایک مزید حسنِ اتفاق کہ دونوں کی ابتدائی تعلیم اور ذہنی تربیت و نشو و نما میں ایک ہی استاد شمس العلماء سید میر حسن کا فیضان کارفرما نظر آتا ہے یہی نہیں بلکہ ماضی کے مسلمانوں کی روایت کے عین مطابق فیض کی ابتدائی تعلیم میں بھی دینی عنصر مسجد و مدرسہ کے حوالے سے نمایاں ہے جسے مولوی محمد ابراہیم جیسے مُعلّم اردو کی رہنمائی میں مزید جلا میّسر آئی چنانچہ نصابی تعلیم کا یہ سلسلہ جب گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی زبان و ادب میں ماسٹرز کر لینے کے بعد اورینٹل کالج سے عربی زبان و ادب میں بھی ایم۔ اے کر لینے تک پہنچتا ہے تو فیض کی تربیت و تعلیم کے منطقی و بدیہی عوامل و عناصر کے بارے میں کوئی دو آراء نہیں ہو سکتیں جس کا برملا ثبوت فیض کا حکیم الامت کی خدمت میں وہ خراجِ عقیدت ہے جو انھوں نے گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے دوران اپنی ایک قطعہ بند نظمِ سپاس کی صورت میں پیش کیا اور جو کالج کے مجلّے ''راوی'' (فروری ۱۹۳۳ء) میں شائع ہوئی نظم مذکور سے ایک بند:

سنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر　　ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اُٹھے　　خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خودفراموشی

فیض کی تربیت کا یہ فیضان ان کی تمام زندگی میں شعور و لاشعور ہر دو کیفیات پر سایہ فگن دکھائی دیتا ہے ان کی مشہور نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' جسے اقبال بانو نے فن موسیقی میں ڈھال کر لازوال بنا دیا ہے اُن کی بلاغتِ فکر کا شاہکار ہے قرآن حکیم کی 'سورۃ القارعۃ' کی یہ حکیمانہ شعری تفسیر فیض کی دینی بصیرت کی بھی غماز ہے۔ ان کی زندگی میں کہیں بھی اخلاقی اقدار اور دینی صداقتوں سے انحراف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ فیض کی فکر میں وہی آفاقیت اور انسانی عظمت کار فرما ہے جس کے پیش نظر جارج برنارڈ شا جیسے فبین سوشلسٹ (Fabian Socialist) کو کہنا پڑا تھا کہ آخر کار تمام عالم انسانیت عقیدۂ اسلام کے تابع ہو کر رہے گا۔ بے شک فیض مارکسی فلسفہ سے متاثر تھے لیکن کارل مارکس کو تو علامہ اقبال نے بھی یہ کہہ کر زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے کہ ''نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب'' اور اس طرح جہاں اسلامی نظام حیات سے غیر متصادم معاشی و معاشرتی فلسفوں اور نظریات کی افادیت کو تسلیم کیا ہے وہیں پیغمبرانہ بعثت کی استنادی حیثیت کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔ فیض لاہور کے ایک صوفی بزرگ حضرت بابا ملنگؒ کے ارادتمند تھے ان سے پوچھا گیا کہ آپ صوفی اور کامریڈ کا موازنہ کس طرح کریں گے۔ فیض کا جواب تھا کہ ''صوفی حقیقی کامریڈ ہیں'' وہ ایک مجتہد الفکر شاعر تھے چنانچہ 'دستِ صبا' میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اُس پر فرض ہے'' فیض نے شعر کی روایتی علامتوں اور استعاروں کو نئے مفاہیم و معانی عطا کیے اور اپنے کلام کو سدابہار عصری معنویت کا افتخار بخشا۔ شعر ہی میں نہیں اقلیم تصوف میں بھی اجتہاد کو رہنما کیا اور 'انا الحق' جیسی اٹل صوفیانہ اصطلاح کو سیاسی مفہوم سے ہم آہنگ کر دیا۔

فیض کے فکر و فن میں تنوعات کی ایک کہکشاں جلوہ بار نظر آتی ہے۔ کلاسیکی اقدار جہاں ان کی شاعری کو بنیاد فراہم کرتی ہیں وہیں شعری اصطلاحات، علامات، اشارات اور استعارات کو وہ عصری معنویت سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں صیّاد و گلچیں، شام و سحر، اہل ستم، طوق و دار اور قفس جیسے استعارے سیای مفاہیم ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی الفاظ کو معانی کی نئی روح عطا کی اور اظہار کے نئے پیرائے تراشے۔ تغزل اور رومانیت نے اُن کی انقلاب پسندی کو

ایک مغنّی کے لہجے میں ڈھال دیا۔ جو رجائیت سے معمور ہے۔ ان کے کلام میں روحِ عصر اس طرح صوت و آہنگ بن کر ابھرتی ہے کہ اُن کے دواوین نقشِ فریادی‘ (۱۹۴۱ء) دست، صبا (۱۹۵۳ء) زنداں نامہ (۱۹۵۶ء) دستِ تہہ سنگ‘ (۱۹۶۵ء) سرِ وادیٔ سینا‘ (۱۹۷۱ء) ’شام شہر یاراں‘ (۱۹۷۹ء) مرے دل مرے مسافر (۱۹۸۱ء) اور ۱۹۸۴ء میں ان کی رحلت تک کے کلام پر مشتمل آخری مجموعے ’’غبار ایام‘‘ سمیت یہ ’نسخہ ہائے وفا‘ سیاسی و سماجی، تہذیبی و ثقافتی اور معاشی و معاشرتی زندگی کی تاریخ کے نشیب و فراز کی شعری تفسیر بن گئے ہیں۔

ہر چند کہ فیض آزادی سے قبل ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء کے دوران ہی عام سطح سے بلند منزلت کے حامل شاعر اور دانشور کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے تاہم اُنھیں بین الاقوامی شناخت حاصل ہونے میں ان کی شخصیت کی کثیر الجہتی بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک دوبار ’ادب لطیف‘ کے مدیر رہے اور ادبی صحافت میں اپنا نقشِ دوام ثبت کر گئے۔ اردو اور انگریزی اخباری صحافت میں پاکستان ٹائمز۔ امروز اور لیل و نہار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی بصیرت و دانش کا لوہا منوایا۔ امروز میں مولانا چراغ حسن حسرت اور ایوب احمد کرمانی اُن کے رفقائے کار اور پاکستان ٹائمز میں اُن کے بعد بہ استثنائے مظہر علی خاں کوئی بھی ان کے پائے کا اداریہ نویس پیدا نہ ہو سکا۔ جلاوطنی کے دوران ماسکو، لندن اور بیروت سے بیک وقت شائع ہونے والے میگزین ’’لوٹس‘‘ کی ادارت نے انھیں عالمی افق پر نمایاں طور پر ابھارا۔ ان کی زندگی کی دوسری جہتوں میں بائیں بازو کے غالب رجحانات ان کی شناخت بن گئے ۱۹۳۰ء میں سجاد ظہیر کی زیر قیادت ترقی پسند تحریک نے اُنھیں اپنی طرف متوجہ کیا ٹریڈ یونین سرگرمیاں اور ترقی پسند مصنفین تحریک سے اُن کی فعال وابستگی سرفہرست ہیں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اس تحریک کی پنجاب شاخ کا آغاز کیا۔ شعبۂ تعلیم بھی اُن کا ذریعۂ معاش بنا چنانچہ اس دور کے تین سنگ ہائے میل ایم۔ اے۔ او۔ کالج امرتسر (۱۹۳۵ء) اور ہیلی کالج لاہور کی معلّمی کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں لندن سے کراچی واپسی پر بحیثیت پرنسپل عبداللہ ہارون کالج تقرری اہمیت کے حامل ہیں۔ فیض صاحب پر برطانوی ہند میں فوجی ملازمت (شعبہ تعلقات عامہ) کی تہمت بھی ہے

لیکن ۱۹۴۴ء میں لیفٹینٹ کرنل کے عہدے سے استعفیٰ دے کر انھوں نے کفارہ ادا کر دیا۔

پاکستان میں پچاس اور ساٹھ کی دہائی کو فیض کی فکری و نظری زندگی کا انقلاب آفریں عہد کہہ سکتے ہیں۔ اسی عہد میں انھیں راولپنڈی سازش کیس (۱۹۵۱ء) میں چار سال تک پابند سلاسل رہنا پڑا جس کے دوران زندگی کی تلخ حقیقتوں کے شدید ادراک نے انھیں بحیثیت شاعر معراج کمال کو پہنچا دیا۔ جہاں غالب اور اقبال کے بعد ان کے فکر و فن کو چیلنج کرنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ان کے دو مجموعہ ہائے کلام 'دست صبا' اور زنداں نامہ اسی دور کے تخلیقی شاہکار ہیں۔ اس عہد میں اُن کا شعور انقلابی انداز میں بیدار ہوا اور انھوں نے ''متاع لوح و قلم'' چھن جانے پر اس متاع کی بازیافت کا عہد اس طرح کیا ''کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے'' چنانچہ وہ طرز فغاں جو انھوں نے قفس میں ایجاد کی وہی گلشن کا طرز بیاں ٹھہری:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے چمن میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

* * *

فیض نے ایک حریت سرشت فن کار کی حیثیت سے اہل وطن کو خبردار کیا کہ یہ ''داغ داغ اجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' وہ سحر نہیں جس کا انتظار تھا۔ ان کا کلام کشمیر و فلسطین کے حوالوں سے بھرا پڑا ہے جس سے ان کی مسلم دنیا سے قلبی وابستگی اور انسان دوستی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے انھوں نے کشمیریوں پر بھارتی چیرہ دستی اور فلسطینیوں پر صیہونی بربریت کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ لینن امن انعام بنیادی طور پر ان کی انسان دوستی کو خراج تحسین کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک عظیم محبِّ وطن تھے چنانچہ ان کے فکر و فن کے سوتے وطن کی مٹی ہی سے پھوٹتے ہیں وہ اردو ادب اور شاعری میں ایسی مستعار اصناف کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے جنھیں ہماری تاریخ اور تہذیب و ثقافت پس منظر مہیا نہ کرتے ہوں یہی وجہ تھی کہ اردو میں 'بلینک ورس' متعارف کرانے والوں میں ن۔ م۔ راشد کے ساتھ شروع شروع میں تو ان کا نام نظر آیا بعد میں وہ خود ہی اس صنف شاعری سے اس لیئے محترز ہو گئے کہ وہ اپنے انگریزی ادب کے مطالعہ کی بنا پر جانتے تھے کہ بلینک ورس کو خود انگریزی شاعری میں جانسن جیسے عظیم نقاد نے سخت ناپسندیدہ قرار دیا تھا لیکن بدقسمتی کہ ہمارے

شعراء میں ایک ایسا طبقہ بھی ابھر کر سامنے آیا جو اپنی فکری ونظری اور علمی وفنی بے بضاعتی کے سبب یا تو سستی جذباتیت کے گرداب میں پھنس گیا یا احساس کمتری کے ہاتھوں مجبور ہو کر نثری نظم اور بلینک ورس جیسی اصناف سخن اپنا کر جدت پسندی کی خودفریبی میں مبتلا ہو گیا چنانچہ اسی جدت پسندی کے بارے میں جب فیض سے پوچھا گیا تو اُن کا جواب تھا کہ ’’ہم ایسی شاعری نہیں کر سکتے‘‘ ان کا کلام جمالیات ونظریات کا حسین امتزاج ہے بقول احمد ندیم قاسمی ’’فیض احمد فیض اس دور کا عظیم ترین شاعر ہے‘‘ ان کے عہد کے نقادوں نے جن میں پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، مرزا ظفر الحسن اور گوپی چند نارنگ جیسی ہستیاں شامل ہیں انھیں نقد ونظر کی میزان میں تولا اور پاکستانی شناخت رکھنے والا عالمی سطح کا عظیم فن کار قرار دیا۔

فیض اپنی زندگی ہی میں ایک روایت بن گئے تھے۔ وہ ایک عافیت کوش اور عافیت کیش شائستہ ومہذب صاحب کردار انسان تھے۔ انگریزی اور روسی زبانوں کے علاوہ متعدد دیگر زبانوں میں ان کے کلام کے تراجم کے ذریعہ ان کی آفاقیت وانسانیت پسندی کی مہک دنیا بھر میں پھیل چکی ہے۔ حال ہی میں ’’آج کے نام‘‘ سے شعیب ہاشمی نے ان کی ۵۲ نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ضرورت ہے کہ فکری ونظری اختلافات سے ماورا ہو کر اعتراف کیا جائے کہ فیض ہمارا ایک عظیم ادبی سرمایہ ہیں جنھوں نے لیلیٰ وطن سے ٹوٹ کر محبت کی۔ خدا انھیں عقبیٰ و آخرت میں بھی سرخرو فرمائے

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی   ہم، جنھیں رسمِ دعا یاد نہیں

(جنوری۔ مارچ ۲۰۱۰ء)

عبدالعزیز خالد کا سانحۂ رحلت

معروف صاحب طرز شاعر جناب عبدالعزیز خالد گذشتہ دنوں لاہور میں انتقال کر گئے۔ انا للّٰہ و انّا الیہ راجعون !

مرحوم کی مُفرّس ومُعرّب شاعری ان کا اُسلوب خاص تھا اور یہی اُن کی شناخت بھی۔ خالد صاحب کے مزاج میں درویشی، استغنا اور خودداری کے اوصاف نمایاں تھے۔ وہ ایک کثیر المطالعہ شخص تھے اور کئی زبانوں پر بشمول فارسی و عربی، انگریزی و اردو اور ہندی و سنسکرت پر عبور کی حد تک دسترس کے حامل تھے۔ ان زبانوں کا ادب بھی ان کے مطالعات کا اختصاص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُسلوب خاص جو ان سے منسوب ہوا تلمیحی اشارات سے بھی مالا مال تھا۔ یہی نہیں بلکہ خالد صاحب مرحوم اعلیٰ فنی شعور بھی رکھتے تھے اور عروض کی باریکیوں پر ان کی عالمانہ و مجتہدانہ نظر تھی۔ اکثر بحور و قوافی ان کے فنی اجتہاد کے مظہر ہوتے تھے۔ اصنافِ شاعری میں رباعی بالخصوص اُن کی فکر کی جولانگاہ قرار پائی اور اس صنف میں انھوں نے روایتی اخلاقیات اور فلسفہ وحکمت کے مضامین نظم کرنے کے ساتھ ساتھ مزید موضوعی وسعت بھی پیدا کی۔ اُن کے حُبِ رسولؐ کا والہانہ مظہر اُن کی نعتیہ شاعری ہے جس میں عربی ادب سے ماخوذ تلمیحاتی مواد اُن کی وسعت مطالعہ کی گواہی دیتا ہے۔ حمدیہ شاعری بھی اِنھیں اوصاف سے متصف دکھائی دیتی ہے۔

جناب عبدالعزیز خالد کی متعدد شعری تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں وہ گذشتہ کئی برسوں سے سہ ماہی ''الاقرباء'' کے لئے بالالتزام لکھتے رہے اُن کے کلام کی طباعت میں لفظ و معنی کی تصدیقِ صحت کے لیے جہاں عربی و فارسی اور ہندی و سنسکرت لغات سے ادارہ کو اکثر مدد لینا پڑتی وہیں ان سے ٹیلیفونک رابطوں کے ذریعہ ذاتی طور پر بھی رہنمائی حاصل کی جاتی تھی۔ وہ الاقرباء، کی جانب سے اس احتیاطی رویے کے مداح تھے۔ ہم اس علمی رہنمائی کے لیے ان کی زندگی میں ہمیشہ ممنون رہے اور اب اُن کی مغفرت کے لئے دست بدعاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔

(آمین) (جنوری۔ مارچ ۲۰۱۰ء)

اقبال کا تصور پاکستان اور فرزندِ اقبال کے ارشادات

ایک آزاد و خودمختار مملکت کی حیثیت سے پاکستان کا قیام اسلام کے تصور حیات کا مرہون منت ہے جسے خالق کائنات نے بطور دین اکمل (اکملتُ لکم دینکُم) تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل پیغمبر آخرالزماںؐ کے ذریعہ عالمِ انسانیت سے متعارف کرایا۔ چنانچہ اسلامی مملکت کا پہلا مثالی نمونہ ''مدینہ کی شہری ریاست'' کی شکل میں دنیا نے دیکھا (۲۳_۲۲ء) اور ہجرت کے سال اول کے بتدائی چند مہینوں ہی میں پیغمبرؐ اسلام کی بحیثیت سربراہ مملکت قیادت و رہنمائی میں اس اولین اسلامی مملکت نے دنیا کو پہلا تحریری آئین عطا کیا۔ حقیقت میں یہ ایک قرآنی ریاست کا دستور تھا جس کی بنیاد عالمگیر اخوت و مساوات پر رکھی گئی تھی۔ اور جس میں عقیدہ و مذہب کے تنوعات سے قطع نظر ہر شہری یکساں حقوق کے نظامِ سیاسی کا ایک جزو تھا۔ آنحضورؐ نے تمام خطۂ عرب کو ایک قانون کے تحت اپنی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی متحد و منظّم کر دیا تھا جس کی دنیا کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی اور پھر اس مملکتِ اسلامیہ کی سرحدیں خود ایشیا۔ افریقہ اور یورپ کے براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔

اس وسعت پذیر اسلامی ریاست کے معنوی و جسدی ارتقاء کو اسلامی فکر و فلسفہ نے فقہی سانچوں میں ڈھالا چنانچہ جغرافیائی ماورائیت کی بنیاد پر اس تصور کو فروغ نصیب ہوا کہ مسلم اُمّہ ایک عالمی وفاق (جسے کنفڈریشن بھی کہا جا سکتا ہے) کی حیثیت رکھتا ہے۔ نویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک بالخصوص مسلم مفکرین اور فلاسفہ کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے جس نے اسلامی ریاست کے خدّ و خال بھی متعین کیے اور فقۂ اسلامی کی تشکیل و تفہیم کا بھی اہتمام کیا۔ اس کہکشاں کے درخشاں ستاروں میں دیگر کے علاوہ سیاست و نظام حکومت پر اپنا شہرۂ آفاق مقالہ تصنیف کرنے کا ولین اعزاز حاصل کرنے والا مسلمان مفکر ابن العربی۔ ترک نژاد اسلامی دنیا کا عظیم مفکر و فلسفی فارابی۔ گیارہویں صدی عیسوی کا مفکر، قانون و فقہ کا پروفیسر، اسلامی ریاست کا ذہین ترین شارح اور بغداد کا قاضی القضاۃ ماوردی۔ اسلامی افکار سیاست اور ایرانی و ترکی

تصورات کے عہد تصادم کا نامور مفکر نظام الملک طوسی۔ معاصر یورپ میں پاپائیت اور شہنشاہیت کے عہد آویزش کا مسلم سکالر، مجتہد اور امام غزالی، قرآن وسنت کا عظیم مفسر اور خلافت راشدہ پر اتھارٹی ابن تیمیہ اور ابدی شہرت حاصل کرنے والی تصنیف ''مقدمہ'' کا مصنف ومورخ ابن خلدون شامل تھے جنھوں نے قرآن وسنت کو بنیاد بنا کر اپنی شہرۂ آفاق تصانیف کے ذریعہ اسلامی ریاست میں ہمہ گیر عدل وانصاف، قانون سازی اور انتظامی امور کے علاوہ بین المملکتی مراسم اور آداب سفارت کاری کے ضمن میں رہنما خطوط متعین کیے۔

چنانچہ یہ تھا وہ عظیم ورثہ جو اسلامی ریاست کی بنیاد وماہیت، امور مملکت اور بلاتفریق عقیدہ و مذہب شہریوں کے مساوی حقوق اور ان کی فلاح کے بارے میں آئندہ صدیوں اور نسلوں کو منتقل ہوا۔ چنانچہ اس پس منظر کے ساتھ حضرت مجدّد الف ثانیؒ۔ شاہ ولی اللہؒ، سید جمال الدین افغانیؒ، سرسیدؒ، مولانا عبدالحلیم شررؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور خیری برادران کے افکار ومساعی میں تنوعات کے باوجود اسلامی ریاست کی اصل واساس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ حضرت علامہ اقبالؒ اس تاریخی تسلسل کا نقطۂ عروج ہیں۔ وہ اپنے خطبۂ الہ آباد (۱۹۳۰ء) میں ارشاد فرماتے ہیں:

☆ ''میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اس کے قوانین، اُس کے نظامِ سیاست، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کے ادب کے محتاط مطالعہ میں صرف کیا ہے''

☆ ''اسلام انسان کی یکتائی کو روح اور مادّے کی ناسازگار دوئی میں تقسیم نہیں کرتا''

☆ ''عالم اسلام میں کسی لوتھر کا ہونا ناممکن ہے کیونکہ یہاں کوئی کلیسائی تنظیم موجود نہیں۔۔ عالم اسلام میں ہمارے پاس ایک آفاقی نظام سیاست موجود ہے۔''

☆ ''سچ ہے اسلام کلیسا نہیں ہے۔ یہ ایک ریاست ہے۔ اسے ایک تنظیم سمجھ لیجئے جو معاہدہ کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے (میثاق مدینہ کی طرف اشارہ) اور اس تخیل نے روسو کی فکر سے برسوں پہلے جنم لیا۔''

چنانچہ علامہ کا تصورِ پاکستان اپنی قطعیت اور مطلوبہ فکری ونظری وضاحتوں کے ساتھ اور ان کے ذاتی مطالعہ ومشاہدہ کی بنیاد پر جو معاصر مشرق ومغرب کے سیاسی وبین المملکتی احوال وکوائف پر محیط ہے اسلامی ریاست کے مبادیات پر امر قطعی کی حیثیت رکھتا ہے جو ۱۹۴۰ء کی قراردِ پاکستان کے بعد مملکت پاکستان کی صورت میں متشکل ہوا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ مدینے کی شہری ریاست کے قیام کے وقت جس طرح دو عالمی طاقتیں قیصر وکسریٰ موجود تھیں اسی طرح قیام پاکستان کے وقت بھی امریکہ وروس دو طاقت ور بلاک تھے۔ اس طرح مدینے کی شہری ریاست اور مملکتِ پاکستان میں بین الاقوامی امور کے حوالے سے ایک نہایت معنی خیز مماثلت پائی جاتی ہے۔

اس پس منظر کو جس میں مسلم سیاسی فکر کا ارتقاء اپنے منطقی تسلسل کے ساتھ نہایت واضح اور کسی بھی نوع کے ابہام سے ماورا ہے پیش کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بدقسمتی سے گزشتہ چند برسوں کے دوران ایک لادین فکری مافیا جو خود کو دانشوری سے متصف قرار دیتا ہے نظریۂ پاکستان کی تعبیر وتوضیح سیکولرازم کے حوالے سے کرنے پر کمر بستہ ہے حالانکہ سیکولرازم کی اصطلاح وضع کرنے والا انگریز جارج جیکب (۱۹۰۶ـ۱۸۱۷ء) خود انیسویں صدی کی پیداوار ہے وہ 'سیکولرازم' کی جڑیں یونان وروم کے فلسفوں میں تو تلاش کرسکتا تھا لیکن کم وبیش بارہ صدیاں ماقبل تمام عالم انسانیت کے لیے ایک جامع اور مکمل نظامِ حیات لانے والے دین (اسلام) میں کس طرح پیوندکاری کا مرتکب ہوسکتا تھا؟ بہرحال ہمارے لیے سردست انتہائی تشویش واضطراب کا سبب یہ ہے کہ مصور پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند ارجمند محترم ڈاکٹر جاوید اقبال نے جن کے وراثتی واکتسابی علم ودانش کے پیش نظران کا حق ہے کہ انھیں حکیمِ الامت کے افکار ونظریات کا معتبر شارح و مفسر سمجھا جائے اپنے حالیہ خطبات کے ذریعہ جو موصوف نے اسلام آباد کی دو معروف جامعات ''علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی'' اور ''بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی'' میں ارشاد فرمائے اہل علم وخبر کو سخت ذہنی وروحانی اذیت میں مبتلا کردیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ارشادات پر مبنی مطبوعہ پمفلٹ بعنوان ''اقبال کی نگاہ میں پاکستان کی ''اسلامی'' ریاست مثالی ''سیکولر'' ریاست کیسے؟'' سامعین میں تقسیم کرایا گیا تھا جس کا ایک نسخہ

ہمارے پاس محفوظ ہے۔ منجملہ دیگر موصوف کے خطبے میں چند محل نظر فرمودات یہ تھے۔

۱۔ ''اہم مسئلہ پاکستانی ریاست کے اسلامی ہونے کی تعبیر کا ہے''

۲۔ ''پاکستان میں تین مختلف زاویہ ہائے نگاہ پائے جاتے ہیں (اوّل) قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کو مکمل طور پر ''سیکولر'' ریاست بنانا چاہتے تھے (دوم) قائداعظم پاکستان کو ایک ایسی جدید جمہوریت کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے جس میں اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ مثالی 'سیکولر' ریاست کی خصوصیات موجود ہوں (سوم) ایک طبقہ جو تقلید کے قائل علماء پر مشتمل ہے پاکستان کو روایتی طرز کی اسلامی ریاست بنانے کا خواہش مند ہے اور جمہوریت کی موجودہ شکل کو قبول کرتا ہے۔''

۳۔ ''عام طور پر مذہبی طبقہ 'سیکولرازم' کو لادینیت سمجھتا ہے۔''

۴ ''ترک اپنے سیاسی نظام کو 'سیکولر' جمہوریت کا نام دیتے ہیں صرف پاکستان نے اپنے آئین کو ''اسلامی جمہوریت'' کا نام دے رکھا ہے۔''

۵۔ ''سیکولر ریاست کی کونسی مثبت اقدار اسے مثالی بناتی ہیں؟ یہی کہ وہ شہریوں کے مذہبی عقائد کے معاملے میں غیر جانبدار رہو۔ عبادات کے ضمن میں ہر شہری کو مذہبی آزادی کی ضمانت دے۔ اگر شہری اپنے مذہبی سول قوانین کے تحت زندگی بسر کرنا چاہیں تو انھیں ایسی سہولت فراہم کرے۔ دیگر معاملات میں معاشرہ کے مجموعی تحفّظ اور فلاح و بہبود کی خاطر ایسے قوانین نافذ کرے جو سب کے لیے قابل قبول ہوں۔ شہریوں میں مذہبی بنا پر کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھے۔ حقوقِ بشر کے تحفظ کا یقین دلائے۔ اور قانون کی حاکمیت کی علم بردار ہو۔ کیا یہ اقدار کسی صورت میں بھی اسلامی جمہوری ریاست کے اُس تصور سے متصادم ہیں جو ہمیں قائداعظم کی تقریروں یا علامہ اقبال کی تحریروں میں ملتا ہے۔''

۶۔ ’’مسلمانوں کی آج کی لبرل نسل یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ انھیں اسلام کے بنیادی فقہی اصولوں کی تعبیر اپنے تجربات اور جدید زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرنے کی اجازت دی جائے۔‘‘

۷۔ ’’پاکستان میں ایک قابل غور مسئلہ یہ بھی ہے کہ ریاست تو کسی نہ کسی نظم وضبط کی پابند ہے لیکن ایک مذہبی ادارے کی حیثیت سے اسلام ’چرچ‘ کی طرح مستقل طور پر منظّم نہیں ۔‘‘

۸۔ (علّامہ) کے نزدیک اجتہاد کی سہولت کے ذریعہ مسلم معاشرہ کے لیے فائدہ مند ہر اُس نئے تصور (خواہ مغربی تصور نیشنلزم ہو یا سیکولرازم کی مثبت اقدار) کو ’’اسلامی‘‘ ریاست میں مدغم کیا جاسکتا ہے۔‘‘

مندرجہ بالا مفروضات واختراعات پر تاسف وتعجب ہی ناگزیر ردِعمل ہوسکتا ہے کیونکہ حضرت علامہ اور قائداعظم کے زبان وقلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ جو اسلام و پاکستان سے متعلق ہے تاریخ کے سینہ پر نقش دوام بن چکا ہے ہم نے محترم جاوید اقبال کے مندرجہ بالا نکات کو مفروضات واختراعات، اسی لیے قرار دیا ہے کہ بانی ومصور پاکستان سے منسوب کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں انھوں نے سیکولرازم کو جزوِ اسلام بنانے کی بات کی ہو۔ جتنی بھی تاویلات و تشریحات پیش کی گئی ہیں وہ خود ساختہ ہیں۔ کیسا ستم ہے کہ فرزندِ اقبال آغاز کلام ہی میں پاکستانی ریاست کے اسلامی ہونے کی تعبیر ہی کو ایک مسئلہ قرار دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں قائداعظم کے متعدد واضح اور دوٹوک اعلانات سے قطع نظر ہم یہاں ان کی تقاریر سے صرف دو حوالے پیش کر رہے ہیں۔ ایک قیام پاکستان سے قبل کا اور دوسرا قیام پاکستان کے بعد کا

(الف) ''اس حقیقت سے جہلا کے سوا ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے جو مذہب ۔ معاشرت ۔ تجارت ۔ عدالت ۔ فوج ۔ سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے ۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ زندگی کے معاملات ۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا ۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا ۔ ان تمام معاملات کے لیے اس ضابطے میں قوانین موجود ہیں'' (نشریہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی ۱۳ نومبر ۱۹۴۳ء)

(ب) ''اسلامی ریاست کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکشی کا مرکز ذات خداوندی ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں ۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی شخص یا ادارے کی ۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر سکتے ہیں ۔'' (۱۹۴۸ء)

پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی سے قائداعظم کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والے خطاب کو وہ فکری مافیا جو دانشور ہونے کا دعویدار ہے سیکولرازم کا حوالہ قرار دیتا ہے جو ایک مذموم جسارت ہے کیونکہ شہریوں کے درمیان بلاتخصیصِ عقیدہ و مذہب، مساوات اور انصاف کا بنیادی اصول میثاق مدینہ کی شکل میں بھی موجود ہے ۔ قائداعظم کی اس تقریر کو قرآن حکیم سے بھی جواز مہیا ہوتا ہے (سورۃ الکافرون، سورۃ البقر ۲۵۶ ـ ۶۲، سورۃ الجرات ۱۳) تعجب ہے اس ضمن میں یعنی سیکولرازم یا کسی بھی ازم کو پوری حقارت سے مسترد کر دینے کا حوالہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے ذہن سے محو ہو گیا جو خود ان کی کتاب بعنوان (Ideology of Pakistan) نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں بایں الفاظ موجود ہے ۔

''میں کمیونسٹوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نسبت دست کش ہو جائیں ۔ اسلام ان کا رہبر و رہنما اور ان کی زندگی کا مکمل ضابطہ ہے انھیں کسی بھی 'ازم' کی ضرورت نہیں'' (مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن سے قائداعظم کا خطاب مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۴ء) پھر کراچی میں مسلم لیگ

سیشن ۱۹۴۴ء میں قائداعظم نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ "پاکستان کا آئین قرآن وسنت ہوگا" ڈاکٹر صاحب خود جانتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہ علامہ کی تحریروں اور تقریروں میں ملتی ہے نہ قائد اعظم کی۔ یہ مفروضات حقیقت کو ابہام کا جامہ پہنانے کے مترادف ہیں۔ مثلاً تقلید کے بارے میں علامہ کا ارشاد ہے کہ:

"مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسوۂ رسول کو مدنظر رکھیں تا کہ جذبۂ تقلید اور جذبہ عمل قائم رہے" (اکتوبر ۱۹۶۶ء) البتہ اقبال نے جس تقلید سے منع فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ "مشرقی اقوام کو مغربی تہذیب پر تنقید کی ضرورت ہے تقلید کی ضرورت نہیں" (اقبال نامہ جلد دوم) یہی نہیں بلکہ بعض حالات میں اقبال تقلید کو اجتہاد پر بھی فوقیت دیتے ہیں مثلاً "زمانۂ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے" (مضمون رشید احمد صدیقی) لیکن اس کے باوجود فرزند اقبال کے ذہن میں تقلید کا تحقیر آمیز تصور موجود ہے۔

جہاں تک روایتی طرز کی اسلامی ریاست کا تعلق ہے اس ضمن میں بھی قائداعظم کا اعلان دو ٹوک اور واضح ہے۔" " Make no mistake Pakistan is not a theocracy.." " (نشریہ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء) مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی ۱۹۴۹ء میں لیاقت علی خان مرحوم کی پیش کردہ قرارداد مقاصد پر اپنی تقریر کے دوران مغرب سے درآمد شدہ اس تاثر کو سختی سے مسترد کر دیا تھا کہ پاکستانی ریاست کی بنیاد تھیوکریسی پر ہو سکتی ہے۔

جاوید اقبال صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ مذہبی طبقہ سکولرازم کو 'لادینیت' سمجھتا ہے۔ دراصل مذہبی طبقہ ہی نہیں خود سیکولرزم کا بانی جارج جیکب بھی اپنی تصنف " English Secularizm" میں اسے مذہب سے لاتعلق نظام قرار دیتا ہے۔ لغوی اعتبار سے بھی یہی معنی اخذ کیے گئے ہیں۔

(1) The American Heritege Dictionary of the English language updated in 2009 (2) Collin's English Dictionary 2003 Edition)

علامہ نے خالد خلیل کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ "مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے" یہی نہیں بلکہ غلام السیدین کے نام خط میں تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی اس

طرح اظہار خیال کیا کہ ''میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادّی تعبیر سراسر غلط ہے''

محترم جاوید اقبال صاحب کو یہ بھی شکوہ ہے کہ ''ترک اپنے سیاسی نظام کو سیکولر جمہوریت کا نام دیتے ہیں صرف پاکستان نے اپنے آئین کو 'اسلامی جمہوریہ' کا نام دے رکھا ہے'' یہ شکوہ اس لیے درست نہیں کہ اولاً پاکستان کو سیکولر قرار دینے سے قیام پاکستان کا جواز ختم ہو جاتا ہے ہر چند کہ ہندوستان بدترین ہندو فرقہ وارانہ ذہنیت کے زیر اثر رہا ہے اور ہے تاہم دنیا کی چند اور ریاستوں مثلاً فرانس ۔ میکسیکو ۔ جنوبی کوریا اور ترکی کی طرح سیکولر ریاست ہے ڈاکٹر صاحب نے سیکولرازم کے جو اوصاف گنوائے ہیں وہ پہلے سے اسلام میں موجود ہیں جن کا ذکر انھوں نے اپنے خطبے میں بھی فرمایا ہے انھیں بہر حال تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ اوصاف اگر سیکولرازم میں ہیں تو اسلام سے ماخوذ و مستعار ہیں اسلام جن اوصاف سے پہلے ہی متصف ہے انھیں کہیں سے بھی مستعار لینے کی ضرورت نہیں اور یہ ضرورت بھی نہیں کہ اسلامی جمہوریہ ہونے کے مستحکم جواز کے باوجود پاکستان خود کو ترکی کی طرح سیکولر جمہوریہ قرار دے۔

ڈاکٹر صاحب سیکولرازم کے تحت مساوات و مذہبی آزادی وغیرہ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ کیا یہ اقدار کسی صورت بھی اسلامی جمہوری ریاست کے اُس تصور سے متصادم ہیں جو ہمیں قائداعظم کی تقریروں یا علامہ اقبال کی تحریروں میں ملتا ہے۔ قائداعظم اور علامہ نے جن وجوہ کے تحت سیکولرازم کو مسترد کر دیا تھا اُن کا اندازہ، منجملۂ دیگر، خود ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''Ideology of Pakistan'' کے درج ذیل حوالہ جات سے کیا جا سکتا ہے دوسرے یہ کہ جب جاوید اقبال صاحب خود تسلیم فرماتے ہیں کہ سکولرازم اور اسلام میں اکثر اقدار کی ہم آہنگی و مماثلت ہے تو پھر انھیں کیوں اصرار ہے کہ یہ اقدار اسلام سے مستعار لیے جانے کے باوجود پاکستان کو ''مثالی سیکولر ریاست'' ہونا چاہیئے۔

علامہ کے حوالے سے اقتباسات

(۱) ''اقبال سرمایہ دارانہ قومی اور سیکولر تصور جمہوریت کے خلاف تھے کیونکہ اس تصور نے ملوکیت کو جنم دیا تھا جو مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی استحصال کا بنیادی سبب تھا'' (ص ۱۳)

(۲) ''مغرب کے غیر اسلامی افکار کی مخالف کر کے اقبال نے کم وبیش اُسی انداز میں بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی تعلیمات کے احیاء میں کردار ادا کیا جس طرح بارہویں صدی

(۲) عیسوی میں غزالی نے یونان سے ماخوذ غیر اسلامی نظریات کو مسترد کر کے علوم اسلامی کے احیاء کی تکمیل کی تھی (ص ۱۲)

(۳) ''اقبال مغرب کے سرمایہ دارانہ قومی اور سیکولر جمہوری نظام نیز ملوکیت اور نوآبادیت کے خلاف تھے'' (ص ۲۱)

(۴) ''اپنی فکر کو قرآن کی روشنی سے منور کیجئے آپ محسوس کریں گے کہ سوائے قرآنی نظام کے دیگر تمام حکومتی نظام پُر فریب اور عیارانہ ہیں'' (ص ۲۵)

(۵) 'اقبال نے دنیائے اسلام میں سیکولرازم کے مغربی تصور کو یکسر مسترد کر دیا۔ ان کے خیال میں سیکولرازم کا اصول عیسائیت میں روح اور مادے کی اساسی دوئی سے ماخوذ ہے۔ یہ اصول مغربی اقوام کی حیات اجتماعی سے مذہب کے اخراج پر منتج ہوا ہے دوسرے لفظوں میں سیکولر ریاست کا ارتقاء اس اصول کا مرہون منت ہے۔ اس طرح دنیائے اسلام میں سیکولرازم کے اصول کے متعارف کیے جانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ امر بعید از امکان ہے۔'' (۲۵)

(۶) ''اسلامی نظام حکومت نہ ملوکیت ہے نہ جمہوریت نہ بادشاہت بلکہ ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف لیکن قبائح سے منزہ ہے۔'' (ملفوظات)

(۷) ’’جو شخص قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈینس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدّد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا‘‘ (سید سلیمان ندوی کے نام خط)

(۸) ’’اسلام نہ تو وطنیت ہے نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام ہے جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولت تعارف کے لیے اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں‘‘ (تشکیل الہیات جد ۵)

(۹) ’’وطنی قومیت کی اساس نے یورپ کو لادینی دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف دھکیل دیا ہے جو اس کا بدیہی اور منطقی نتیجہ ہیں‘‘ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں)

(۱۰) ’’یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی نہ انفرادی نہ پرائیوٹ بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باجود عالمِ بشریت کو متحد و منظّم کرنا ہے۔‘‘ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں)

قائداعظمؒ کے حوالے سے اقتباسات

(۱) ’’میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اُس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبرؐ اسلام نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔‘‘ (شاہی دربار سبی ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء)

(۲) میں اسلامی ریاست کے بارے میں اقبال کے خیالات سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں۔
(اقبال کے خطوط جناح کے نام دیباچہ از محمد علی جناح (۱۹۳۸)

فرزند اقبال مزید فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی لبرل نسل کو اجازت دی جائے کہ اسلام کے

بنیادی فقہی اصولوں کی تعبیر اپنے تجربات اور جدید زندگی کے تقاضوں کے مطابق کر سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ زمانۂ حال کے جورس پروڈینس یعنی اصول قانون کی روشنی میں شریعتِ اسلامیہ کی صداقتوں، انضباط، تصدیق اور تفسیر کے رجحان کو پروان چڑھانا چاہتے تھے تاکہ احکام قرآنی کی ابدیت واضح ہو سکے۔ لیکن کیا یہ کام ہماری وہ 'لبرل نسل' کر سکے گی جس کے اذہان مغرب سے مرعوب اور اجتہاد کی غرض و غایت ہی سے بے خبر نہیں بلکہ صلاحیت سے بھی محروم ہیں اگر 'اجتہاد' کی مطلوبہ اجازت انھیں دے دی جائے تو یہ 'لبرل نسل' اسلام کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دے گی ایسے ہی دانشوروں کے بارے میں اقبال کی رائے تھی کہ جو لوگ مغربی افکار کا جواز اسلام کی تعلیمات سے پیدا کرتے ہیں وہ اجتہاد نہیں کرتے بلکہ فساد پیدا کرتے ہیں۔

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے　　زبینائے غلط بینے نکو تر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکوکیش　　ز دانشمند بے دینے نکو تر

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں ان کو معلوم نہیں اسلامیت کیا ہے اور وطنیت کیا چیز ہے۔'' سید سلیمان ندوی کے نام بھی ایک خط میں ایسے ہی خیالات کا اظہار فرماتے ہیں اور مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقے کو نہایت پست فطرت گردانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غلام بھیک نیز رنگ کے نام ایک خط میں لکھا کہ ان کے لیکچرز (تشکیل الٰہیات جدید) کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفہ، جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔

جاوید اقبال صاحب کو یہ اعتراض بھی ہے کہ پاکستان میں اسلام 'چرچ' کی طرح مستقل طور پر منظم نہیں دراصل یہ سوچ ہی کہ اسلام 'چرچ' کی طرح کا کوئی ادارہ ہے اسلام کی انفرادیت و آفاقیت کے منافی ہے۔ اسلامی نظریے کے مطابق اُمور دنیاوی اور اُمور دینی کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ علیحدگی کو اقبال ''چنگیزیت'' تصور کرتے ہیں۔ اقتدار اعلیٰ کا اسلامی تصور تمام زندگی پر محیط

ہے دوسرا تصور مساوات انسانی اور غیر طبقاتی معاشرہ کا ہے جب کہ عیسائیت کی تعلیم کی بنیاد مذہب اور دنیاوی امور کے درمیاں حد فاصل پر قائم ہے۔ اسلام میں رہبانیت کا کوئی تصور نہ ہونے کی بھی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دین و دنیا ایک واحدہ ہیں۔ اور مسلمان کی زندگی میں دوئی کا کوئی تصور نہیں۔

گرتو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن، جز بہ قرآں زیستن

(اپریل۔ جون ۲۰۱۰ء)

وطنِ عزیز میں تعلیم اور نظامِ تعلیم کی زبوں حالی

علم خدا آگہی اور خود آگہی کی شرط اول ہے اور یہی افراد و اقوام کی زندگی میں تعمیر و تطہیر کی ضمانت بھی۔ پاکستان کا قیام جس نظریۂ حیات کا مرہون منت ہے اس کی ترجیحات میں بھی علم سرفہرست ہے۔ لیکن یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے بلکہ ایک سانحہ ہے کہ چھ دہائیوں سے بھی متجاوز مدت گزر جانے کے باوجود ہم صرف ایک احساس باختہ اور خود فراموش قوم بلکہ ایک انبوہِ کثیر بن کر رہ گئے ہیں اور یہ بھول چکے ہیں کہ ہم ملکی تاریخ میں پے بہ پے جن بحرانوں کا شکار ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہیں ان کا سبب بھی ایک بحران ہی ہے اور وہ ہے کردار کا بحران !

کردار کی صحت مند نشو و نما صرف ایک ایسے موثر و منضبط نظام و نصاب تعلیم سے وابستہ ہے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور جس کی جڑیں اخلاقیات میں پیوستہ ہوں۔ لیکن ایسا منظرنامہ کسی مغلوب الہوس طبقاتی معاشرے میں مرتب نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی معاشرے کا ایک طبقہ ہمارے وسائل اور اداروں پر قابض ہو چکا ہے جس کے نتیجہ میں ہمیں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بھی شدید احساسِ ندامت ہوتا ہے کہ ہمارے خطے کے وہ ممالک بھی جو ہم سے باعتبار وسائل نہایت کہتر و کمتر ہیں وہی ہم سے، منجملہ دیگر شعبہ جات، تعلیم کے شعبے میں کہیں برتر و افضل بھی ہیں۔ انھیں یقیناً ایک ایسی قیادت میسّر ہے جس نے اس راز کو پالیا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی فلاح صرف اور صرف ہمہ جہت تعلیمی ترقی میں مضمر ہے۔

حال ہی میں اقوام متحدہ کے ایک مستقل اور عالمگیر ادارے یونیسکو (اقوام متحدہ کی تعلیمی سماجی اور ثقافتی تنظیم) نے ایک رپورٹ برائے سال ۲۰۱۰ء شائع کی ہے اور اس میں رکن ممالک کے تعلیمی شعبے میں ہزار سالہ ترقیاتی مقاصد (Millennium Development Goals) کے حوالے سے کارکردگی کا جائزہ لیا ہے۔ ہمیں اس رپورٹ کے مطالعہ کا دردناک تجربہ ہوا۔ دنیا کے ترقی یافتہ

ممالک سے تو کیا مقابلہ، بدقسمتی سے پاکستان 'سارک' یعنی اپنے خطے کے ممالک کی نسبت بھی نہایت تحقیر آمیز پوزیشن میں ہے۔ سال ۲۰۰۸۔۲۰۰۷ میں مجموعی قومی آمدنی کے حوالے سے تعلیم پر ہمارے اخراجات ۲ء۴۹ فیصد سال ۲۰۰۹۔۲۰۰۸ میں ۲ء۱۰ فیصد اور سال ۲۰۱۰۔۲۰۰۹ میں ۲ء۵ فیصد مسلسل انحطاط کے مظہر ہیں اور یہ صورتِ حال اس کے باوجود ہے کہ ملک کی نصف آبادی ناخواندہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ یونیسکو کی گلوبل مانیٹرنگ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خطے کے ممالک میں مجموعی قومی آمدنی کی نسبت پاکستان کے تعلیم پر اخراجات کی شرح ۲ء۸ فیصد جب کہ یہ شرح ہندوستان میں ۳ء۳ فیصد۔ ایران میں ۵ء۶ فیصد۔ سری لنکا میں ۵ء۴ فیصد، مالدیپ میں ۸ء۳ فیصد اور نیپال میں ۳ء۸ فیصد ہے۔ صرف بنگلہ دیش میں یہ شرح پاکستان سے قدرے کم یعنی ۲ء۴ فیصد ہے ان حالات میں اس خدشہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ سال 2015ء تک پاکستان میں ''تعلیم سب کے لیے'' کا ہدف حاصل کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ حکومت پاکستان نے ۲۰۰۹ء میں جس تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا تھا اُس کے مطابق 2015ء تک ۸۶ فیصد شرح خواندگی کا ہدف حاصل کرنا تھا جو مجموعی قومی پیداوار کے ۷ فیصد اخراجات کا متقاضی تھا۔ مزید ایک ہدف اگلی دہائی تک مفت پرائمری تعلیم کا تھا۔ یہ دونوں اہداف پورا ہوتے نظر نہیں آتے پاکستان کو مطلوبہ ۸۶ فیصد شرح خواندگی حاصل کرنے میں مزید پندرہ سال لگ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ۶۳ برس گزر جانے کے باوجود بھی ہمیں وہ قیادت میسر نہیں آسکی جو ذاتی و انفرادی مفادات سے بالاتر حقیقی قومی ترجیحات کے حصول پر سیاسی عزم (Political will) کی قوت کو مرتکز کر سکے حالانکہ ہمارے سامنے برادر مسلمان ملک ملائیشیا کی مثال موجود ہے جس نے مہاتیر محمد کی قیادت میں دیگر شعبوں میں قابلِ رشک ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم کے شعبہ میں انقلاب برپا کر دیا ہے کیونکہ تعلیم پر ہمارے ۲ء۸ فیصد کے مقابلے میں وہاں بجٹ کا ۳۰ فیصد تعلیم کے لیے وقف ہے۔

اسی تناظر میں ایک اور مستند تحقیق منظرِ عام پر آئی ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے سال رواں (۲۰۱۰ء) کے دوران ہی ''ایک قوم کی صورت گری ۔۔۔ پاکستان میں تعلیم کا جائزہ'' (Shaping a nation- an examination of education in Pakistan) کے زیرِ عنوان

ایک کتاب شائع کی ہے جس میں برصغیر بالخصوص پاکستان میں تعلیم کی تاریخ کا انیسویں صدی عیسوی سے عہد حاضر تک معروضی جائزہ لیا گیا ہے اس میں دینی مدارس کے احوال وارتقاء کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب میں پاکستان میں تعلیم کو متاثر کرنے والے عوامل کی خاص طور پر نشان دہی کی گئی ہے اور سرکاری فہرست ترجیحات میں تعلیم کو جس طرح پست مقام پر رکھا گیا ہے وہ ہماری قیادت کی قومی بے حسی اور بے بصیرتی کا شرمناک مظہر ہے۔ یہی نہیں بلکہ بارہ ابواب پر مشتمل اس تحقیقی دستاویز میں نصاب ونظام تعلیم کا انتقادی تجزیہ بھی چشم کشا ہے۔

پاکستان کے دستور میں ایک نئی دفعہ اے۔۲۵ کا اضافہ کیا گیا ہے جس کے تحت پانچ سے سولہ سال کی عمر تک کے بچوں کو مفت تعلیم مہیا کرنا ریاستی ذمہ داری ہوگی لیکن آثار یہ بتاتے ہیں کہ قومی بے حسی کے ہاتھوں یہ آئینی آرٹیکل بھی اُسی طرح نظر انداز ہوتا رہے گا جس طرح نفاذ اردو سے متعلق آرٹیکل ۲۵۱ اور بعض دیگر مشمولات محروم توجہ چلی آ رہی ہیں۔ تعلیم کے شعبہ میں حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہیں کہ ملک کے ستر فیصد پرائمری سکولوں کو دو کمروں سے زیادہ کی سہولت میسر نہیں اکثر میں پینے کا صاف پانی تک مہیا نہیں کیا گیا جب کہ بجلی اور کھیل کے میدانوں کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس طبقاتی امتیاز کے یہ مظاہر بھی پیش نظر ہیں جہاں امراء واشرافیہ کے بچوں کے لیے سامان تعیش سے آراستہ بلند و بالا عمارتیں عبرتناک تضاد کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ ان حالات میں یونیسکو نے پاکستان میں آئندہ ماہ نومبر ۲۰۱۰ء تک مالی کفالت کے پس منظر میں ”خواندگی پروگرام“ کا جائزہ لینے کا اعلان کیا ہے جس میں ان کے اہداف میں متعلقہ اداروں کو فنڈز کی فراہمی گزشتہ پانچ برسوں کے دوران تعلیم بالغان اور ”غیر رسمی بنیادی تعلیم“ کا جائزہ اور ان عوامل کی نشاں دہی شامل ہے جو ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۸ء تک ملک میں ناخواندہ افراد کی تعداد میں ۲۰۰ فیصد تک اضافہ پر منتج ہوئے ہیں۔ یہ حقیقت اہلِ وطن پر پہلے ہی عیاں ہو چکی ہے کہ گزشتہ مردم شماری کے مطابق ملک میں دس سال سے متجاوز عمر کے ناخواندہ افراد کی تعداد پانچ کروڑ ہے۔ بین الاقوامی اداروں کی سفارش کے باوجود کہ تعلیم پر پانچ سے چھ فیصد خرچ کیا جانا چاہیئے۔ یہ خرچ اوسطاً دو فیصد سے آگے نہ جا سکا بلکہ گزشتہ دو دہائیوں میں تعلیم بالغان کا بجٹ ایک فیصد سے بھی کم رہا۔

ملک میں اعلیٰ تعلیم سے متعلق بھی حالات خاصے ناگفتہ بہہ ہیں، حکومت کے تازہ ترین شاہکار اقدام کے نتیجے میں اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے تحت چھ ارب روپے سے مختص ۲۲ منصوبوں کی بساط لپیٹ دی گئی ہے۔ ۴۸ منصوبوں کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ ۵ء۲ ارب رقم خرچ ہو جانے کے باوجود متعدد رواں منصوبوں پر کام ٹھپ ہو چکا ہے۔ وظائف کا ایک سب سے بڑا منصوبہ روک دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں فاٹا اور بلوچستان کے ۴۵۰ طلباء متاثر ہوئے ہیں جب کہ سال رواں میں مزید ۶۰۰ طلباء پر علم کے دروازے بند کر دیئے گئے سرکاری شعبہ میں متعدد یونیورسیٹوں میں جن میں فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی شاہ عبدالطیف بھٹائی یونیورسٹی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور ورچول یونیورسٹی شامل ہیں کسی ایک منصوبہ پر بھی کام نہیں ہو رہا۔ اس طرح فنڈز کی عدم فراہمی کے سبب ملک بھر میں ۲۵۰ سے زائد منصوبے متاثر ہوئے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے بیرون ملک بھیجے گئے پانچ ہزار سکالرز کے وظائف روک دیئے گئے ہیں اور انھیں پردیس میں حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن کو مطلوبہ رقم کے نصف کے برابر بجٹ میں جو رقم مختص کی گئی تھی اس میں بھی سات ارب روپے کی تخفیف کر دی گئی ہے یہ سب کچھ اس کے باوجود کیا گیا ہے۔ کہ رواں سال کا تعلیمی بجٹ گذشتہ سال کے میزانیے سے دس فیصد پہلے ہی کم ہے جس کے بارے میں وزیر تعلیم کا ارشاد ہے کہ جتنے کم وسائل مہیا کیے جائیں گے اتنے ہی بدعنوانی کے امکانات بھی کم ہونگے۔ لہٰذا کیوں نہ بدعنوانی کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے لیے تمام تعلیمی اداروں پر تالے ڈال دیئے جائیں۔

سرکاری شعبے کی ۳۷ جامعات کو جو شدید مالی بحران کا شکار ہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس بحران پر قابو پانے کے لیے اپنے وسائل خود پیدا کریں یعنی جامعات سے ملحقہ اپنی ملکیتی اراضی فروخت کریں، فیسوں میں اضافہ کریں اور طلباء کے لیے اخراجاتی خود کفالت (Self Financing) کا نظام رائج کریں۔ اس بصیرت باختہ حکمتِ عملی کے جو خوفناک مضمرات ہو سکتے ہیں وہ جعلی ڈگریوں سے کہیں زیادہ قومی اقدار کی پامالی کا سبب بن سکتے ہیں۔

بے شک آج وطن عزیز سیلاب کی فقید المثال تباہ کاریوں سے دوچار ہے۔ معیشت کی تباہی

کے ساتھ ساتھ انسانی المیہ کہیں زیادہ سنگین ہے جس نے عالمی برادری کے ضمیر تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب ہم ہیں اور کاسئہ گدائی جس میں اقوام عالم خیراتی سکّے ان تحفظات کے ساتھ ڈال رہے ہیں کہ ان کا ’’درست وشفاف‘‘ استعمال ہوگا بھی کہ نہیں؟ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اہل وطن اس حادثۂ جانکاہ کے سبب سخت نڈھال ہیں اور ’’دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے‘‘ اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کا دکھ درد باٹنے میں حتی المقدور مصروف لیکن کیا ہئیت حاکمہ کے اُن اخراجات میں کوئی کمی نظر آتی ہے جو سیاسی منصب داروں کی فوجِ ظفر موج کی نذر ہو رہے ہیں۔ ایک صوبے کی مجلس قانون ساز تو تقریباً تمام تر ہی وزارا پر مشتمل ہے۔ ملک بھر میں ان منصب داروں کی مراعات کی نذر ہو جانے والے قومی سرمایہ کا اگر تصوّر بھی کیا جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں بیرونِ ملک کا شوق سیاحت بھی زرمبادلہ کی ضرب کاری سے قوم کو نیم جاں کیے دے رہا ہے۔ ان حالات میں کیا تعلیم کے شعبے ہی کو بے لباس کرنا ضروری ہے؟ سیلابی قیامت کا عذر بجا لیکن تعلیمی شعبہ تو گذشتہ برسوں سے استحصالی رویوں کا مسلسل شکار چلا آ رہا ہے۔

اے موج بلا اِن کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۰ء)

ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص

قومیت کے اجزائے ترکیبی میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے تہذیب و ثقافت ، تمدن و معاشرت نیز قومی امنگوں اور نظریات کا موثر ابلاغ ایک مشترک قومی زبان کی کثیر الجہت لسانی صلاحیتوں پر موقوف ہے دنیا بھر میں یہ صلاحیت صرف اردو زبان کو حاصل ہے کہ وہ ایک فطری عمل کے ذریعہ دوسری زبانوں کے الفاظ۔ محاورے۔ تراکیب اور اصطلاحات جذب کر لینے پر قادر ہے۔ یہ عمل یک طرفہ نہیں بلکہ اردو نے دوسری زبانوں کو بھی اپنا ذخیرۂ الفاظ منتقل کیا ہے جس کی زندۂ جاوید مثال خود پاکستان ہے۔ جہاں متعدد صوبائی اور علاقائی زبانوں کی قوسِ قزح نے قومی اُفق کو ضیاء بار بنا رکھا ہے۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کو چھ دہائیوں سے متجاوز مدت گزر جانے اور انجذاب و امتزاج کے مسلسل و متحرک لسانی عمل کے باوجود ایک مستحکم اور غیر منقسم قومیت کا اجتماعی شعور بیدار نہیں ہو سکا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ملک میں تعلیم اور بالخصوص ذریعۂ تعلیم کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ایک نظریاتی مملکت میں سیاسی قیادت کی اولین ترجیح ہونا چاہیے تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج بھی پونے دو سو سال پرانی لارڈ میکالے کی اُس تعلیمی پالیسی کے سحر سامری سے باہر نہیں نکل سکے ہیں جو ۱۸۳۵ء سے زہر بن کر ہماری اجتماعی فکر اور قومی وحدت کو طبقاتی انتشار کی بھینٹ چڑھا چکا ہے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم و تدریس نے اس ملک میں جس مراعات یافتہ طبقہ کو جنم دیا وہ قومی اقتدار کے حقیقی تصور سے بے نیاز سیاہ و سپید کا مالک بنا رہا اور اغیار کی اس سازشی مصلحت کو نہ سمجھ سکا کہ ۱۹۰۴ء میں میکالے کی تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی کے نتیجے میں پرائمری سطح پر علاقائی زبانوں کا بطور ذریعۂ تعلیم نفاذ ایک دودھاری تلوار تھی جسے ایک طرف تو سیاست کے ذریعہ لسانی و نسلی اختلافات کے لیے استعمال کیا گیا اور دوسری طرف ذیلی قومیتوں کو مستقل احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا گیا۔ چنانچہ اس پالیسی کے تسلسل کا پاکستان آج تک اس طرح شکار ہے کہ نہ تو ہماری علاقائی اور قومی

زبانوں کو مربوط نشو ونما کے مواقع میسر آ سکے ہیں اور نہ قومی زبان کے ذریعہ اجتماعی یک جہتی اور نظریاتی استحکام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکا ہے۔ اس سنگین صورتِ حال کا نوٹس لینے سے ہماری ۲۰۰۹ء کی تعلیمی پالیسی بھی یکسر قاصر رہی ہے جس میں زبان یا ذریعۂ تعلیم کا ذکر تک نہیں ہے بلکہ اس تلخ و مسموم نو آبادیاتی پس منظر کے باوجود گذشتہ سال ہماری حکومت نے برطانوی تعاون سے ایک مشترکہ 'ٹاسک فورس' کے ذریعہ پاکستان میں تعلیمی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا جس کا شریک چیرمین ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۱ء کی دوران برطانیہ میں ٹونی بلیئر کی لیبر حکومت کے تعلیمی اصلاحی پروگرام کے نقیب، لندن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے سابق پروفیسر نیز امریکہ۔ روس اور آسٹریلیا جیسے کثیر اللسانی ممالک کو نظامِ تعلیم پر مشورے دینے والے سر مائیکل باربر کو بنایا گیا جبکہ ایک خاتون وزیر مملکت کو پاکستان کی جانب سے نامزد کیا گیا۔ اس ٹاسک فورس نے پاکستان کے بیمار ونقاہت زدہ نظامِ تعلیم کی اصلاح کے لیے جو اقدامات تجویز کیے ان میں مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی ناگزیریت، سیاسی عزم میں تسلسل کی اہمیت، تواتر کے ساتھ اصلاحی عمل کی نگرانی، صوبائی وضلعی سطح پر جائزے شائع کرتے رہنے کی ضرورت اور اساتذہ کی تربیت پر خصوصی توجہ وغیرہ شامل ہیں۔ سال رواں یعنی ۲۰۱۰ء میں جو رپورٹ منظر عام پر آئی اس میں برٹش کونسل نے بھی تجویز کیا کہ ابتدائی برسوں میں بچے کو اس کے گھر کی زبان میں تعلیم دینا چاہئے ایسا نہ کرنے سے ترکِ تعلیم کی شرح بڑھتی ہے۔ معیار تعلیم میں کمی واقع ہوتی ہے، مقامی زبانیں مٹنا شروع ہو جاتی ہیں اور متعلقہ علاقوں کے لوگوں میں غم وغصہ بڑھنے لگتا ہے

ان دونوں رپورٹوں میں چند مسلمہ وغیر متنازع نکات سے قطع نظر نو آبادیاتی طرز فکر اس قدر واضح ہے کہ اس سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ بین السطور میں ”تقسیم کرو اور حکومت کرو“ (Divide & Rule) کی حکمتِ عملی کارفرما ہے جس کا واحد مقصد پاکستان کی بنیادوں کو متزلزل کر دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا جب کہ ہماری علاقائی قیادتوں میں ایسے تنگ نظر اور بصیرت باختہ عناصر کی کمی نہیں جو لسانی ونسلی تعصبات کی زہر آلود سیاست کے عادی ہو چکے ہیں۔ خیبر پختون خواہ کے ۱۷ اضلاع میں پشتو لازمی مضمون کے طور پر پہلی جماعت سے بارہویں تک نافذ ہے۔

یہی حیثیت سرائیکی اور ہندکو زبانوں کو دیگر متعلقہ اضلاع میں دی گئی ہے۔ سندھ کے دیہی علاقوں میں سندھی اوّل یا دوسرے درجے کی زبان ہے۔ بلوچستان میں پشتو کے علاوہ بلوچی اور براہوی زبانیں ہیں جب کہ پنجاب کی حکومت نے جو آبادی کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے سرکاری مدارس میں انگریزی زبان کو ذریعۂ تدریس بنانے کی منصوبہ بندی کی ہے کہ ملک میں انگریزی زبان کو سماجی اور معاشی برتری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ منظرنامہ جس نے پاکستان میں قومی وملی وحدت کی فضا کو فروغ دینے کے بجائے بدترین نسلی ولسانی خلفشار کو جنم دیا ہے جب کہ قائداعظمؒ اپنے فرمان مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کے ذریعہ تنبیہ فرما چکے تھے کہ ”پاکستان کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا معاملہ ہے“ لیکن یکے بعد دیگرے ہماری مقتدر قیادتوں نے اس معاملے کو جس عدم توجہ کا مستحق سمجھا اس کے نتیجہ میں آج ایک تہائی پرائمری سطح کے عمر کے بچوں میں لڑکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد سکول سے ناآشنا ہے۔ تقریباً ۳۵ فیصد بچے جو تیسری جماعت تک پہنچتے ہیں، یک عددی تفریق کی بھی صلاحیت سے محروم ہیں۔ تعلیم کے آغاز سے بارہویں جماعت تک پہنچنے والے بچوں کی شرح صرف ایک فیصد ہے۔ گھوسٹ سکول دیانتی دیوالیہ پن کی علامت بن چکے ہیں۔ ۳۴ سے ۶۰ فیصد سکولوں میں پانی اور بجلی ندارد اور دوہرے نظام تعلیم نے نئے سرکاری اور نجی کاروباری شعبوں کے ذریعہ طبقاتی کشمکش کو پوری قوم پر مسلط کر دیا ہے۔ ہماری قومی وحدت کے لیے ایک خوفناک چیلنج بن چکا ہے۔

ان حالات میں ہمارے لیے ان دو حقیقتوں کا ادراک ازبس ضروری ہے کہ اولاً بچوں کی مادری زبان کو پرائمری سطح کی تعلیم میں بنیادی اہمیت حاصل ہو اور دوم انگریزی زبان اپنی علمی و بین الاقوامی حیثیت کے پیش نظر ہمارے نظام و نصاب تعلیم میں مناسب اہمیت کی مستحق قرار دی جائے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ صرف ۶۰ فیصد بچے پرائمری تعلیم حاصل کر پاتے ہیں۔ اور ۱۰ فیصد ثانوی تعلیم۔ ۳ء۴۹ فیصد بچوں کی مادری زبان پنجابی۔ ۱۲ فیصد کی پشتو۔ ۷ء۱۱ فیصد کی سندھی۔ ۶ء۳ فیصد کی بلوچی اور ۳ء۱ فیصد کی براہوی ہے۔ کیا ایسی لسانی غیر متوازن تقسیم میں قومی اتحاد و اتفاق اور نظریاتی استحکام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔؟ ہرگز نہیں بلکہ آئین میں

اٹھارویں ترمیم نے تعلیم کا شعبہ وفاق سے صوبوں کو منتقل کر کے اصلاح احوال کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں اور ملک کے طول وعرض میں یکساں تعلیمی پالیسی کا نفاذ ناممکن بنا دیا گیا ہے تا آنکہ ملک کی پارلیمنٹ ایک اور آئینی ترمیم کے ذریعہ تعلیم کا شعبہ وفاق کی تحویل میں دے اس کے بعد صوبائی وعلاقائی زبانوں اور قومی زبان اردو کے اشتراکِ عمل سے اس بظاہر لاینحل مسئلہ سے نمٹا جاسکتا ہے یعنی پاکستان کی کثیر اللسانی تشکیل میں کیونکہ اردو ایک ہمہ گیر رابطہ کی زبان ہے جو ملک کے گوشہ گوش میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور قومی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے پرائمری سطح سے تعلیمی نظام کی اعلیٰ ترین سطح تک اسے درس و تدریس کا واحد ذریعہ ہونا چاہیئے البتہ پانچویں جماعت تک علاقائی اور صوبائی زبانوں کو معاون ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اساتذہ جن کا نظام تربیت بامقصد اصلاحات کا متقاضی ہے متعلقہ علاقوں کی مقامی زبانوں اور بولیوں کے استعمال پر قادر ہوں اور مضامین کی تدریس میں طلباء کی ضروریات کے مطابق اردو اور معاون زبانوں کا بیک وقت استعمال کر سکیں۔ اس طرح بچوں کے اذہان اور صلاحیتوں کو یکساں رُخ دینے میں مدد مل سکے گی اور ابتدائی سطح ہی سے قومی وحدت کے دھارے میں شریک ہو جانے کا احساس تقویت حاصل کر سکے گا۔ چھٹی جماعت سے انگیریزی کو اردو کے ساتھ ساتھ لازمی مضمون کی حیثیت سے ڈگری کی سطح تک نافذ کیا جائے۔ جب کہ اردو کا بدستور ذریعۂ تعلیم رہنا نہایت ضروری ہے بلکہ ملک میں یکساں نصاب ونظام تعلیم رائج کرنے کے لیے نجی شعبہ میں بھی قانوناً اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا ناگزیر ہوگا۔ ہمارے سامنے ایشیا میں جاپان۔ چین اور کوریا کی بے مثال ترقی کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے ''انگریزی کے بغیر ترقی ناممکن'' کے تصور کو مسترد کر دکھایا۔ جنوبی ایشیا کے لوگ بشمول پاکستان انگریزی زبان پر اپنی بہترین گرفت کے باوجود ترقی کے عمل میں پیچھے رہ گئے ہیں بالخصوص جدید اختراعات کے حوالے سے ان ممالک کی کارکردگی مایوس کن ہے۔

اہلِ پاکستان کے قومی تشخص کو اُجاگر کرنے اور تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی ہم آہنگی کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم ابتدائی سطح ہی سے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک مخلوط لسانی معاشرہ ارتقا پذیر نظر آتا ہے جس میں ہر صوبے کی عوامی اور علاقائی

زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اس ملک گیر معاشرے کی ایک دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ بین الصوبائی سطح پر بھی تبادلۂ آبادی کے عمل نے ہر صوبے کی لسانی کثیرالجہتی میں اضافہ کر دیا ہے چنانچہ صوبۂ سندھ میں اب صرف سندھی ہی بچوں کی مادری زبان نہیں بلکہ بلوچی، پشتو، پنجابی اور سرائیکی وغیرہ بھی اس صوبے کے بچوں کی مادری زبانیں ہیں۔ اسی طرح بلوچستان میں صرف بلوچی ہی نہیں پشتو، براہوی اور فارسی زبانیں بھی متعدد مقامی بولیوں کے علاوہ اپنا مستحکم لسانی وجود رکھتی ہیں۔ صوبۂ سرحد کثیراللسانی صوبہ اس لیے ہے کہ وہاں بھی پشتو کے علاوہ ہندکو سرائیکی اور بشمول فارسی دیگر مقامی بولیوں کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعینہ پنجاب جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے دیگر علاقائی بولیوں کے علاوہ ایک وسیع علاقے میں بولی جانے والی سرائیکی زبان کا ملجیٰ و ماویٰ ہے چنانچہ اس کثیر اللسانی منظرنامے میں اردو کو قومی اور رابطہ کی زبان ہونے کے باوجود بطور ذریعۂ تعلیم اگر نظرانداز کیا جاتا ہے تو یہ ہمارے قومی تشخص کو پارہ پارہ کر دینے کی نوآبادیاتی طرز کی سازش اور نظریاتی وحدت پر ضرب کاری ہوگی۔ نصاب اور ذریعۂ تعلیم کو جب تک وفاقی سطح پر آئینی و قانونی حیطۂ اختیار میں نہیں لایا جاتا قومی یک جہتی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۰ء)

جنوبی ایشیا میں ادبی میلوں کی یلغار

جسے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے ۹/۱۱ کے سانحہ کا نام دیا وہ نقطۂ آغاز تھا ایک ایسے عالمی خلفشار کا جس نے تہذیبی و معاشرتی، مذہبی و سیاسی اور فکری و نظریاتی محرکات کو بے رحم عسکریت کے سپرد کر دیا۔ قرائن و آثار ثابت کر چکے ہیں کہ پس منظر تہذیبی تصادم اور تعصب و منافرت کے متعفّن رویّوں سے بُری طرح آلودہ ہے۔ ایوبی فتوحات اور صلیبی عہد نے جس انتقامی جذبے کو جنم دیا تھا وہ ۹/۱۱ کے بعد آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا ہے اور مہلک ترین اسلحہ سے لیس مغرب بزعمِ خویش ارفع و اعلیٰ طاقتی مرکز بن جانے کے نشہ میں مشرق، بالخصوص ایک ایسے نظریۂ حیات اور دینِ امن کے خلاف صف آراء ہو چکا ہے جس کی ابدی حقانیت اور عالمگیر صداقت سے وہ خائف بھی ہے اور غضب ناک بھی۔

چنانچہ اس خوف اور غیض و غضب کا اظہار کہیں برملا ہے اور کہیں پس پردہ۔ جہاں رزم آرائی ہے وہیں بزم آرائی بھی ہے۔ بزم آرائی بین السطور حکمتِ عملی کا حصّہ ہے جو طویل مُدتی ہونے کے باوجود مستحکم و پائیدار نتائج حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے بہر حال

بہر رنگے کو خواہی جامہ می پوش　　　من اندازِ قدت را می شناسم

* * *

ادب و ثقافت ایسی بزم آرائی کے لیے موثر ترین اور بظاہر مہذب و پسندیدہ مواقع مہیا کرتے ہیں۔ ادبی تقاریب ہوں یا انھیں ادبی میلے (Festivals) کہا جائے کسی بھی معاشرے کی ذہنی و فکری نشو و نما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ادب وہ ذریعۂ اظہار ہے جو تہذیبوں اور ادیان کو فروغ بھی دیتا ہے اور مسمار بھی کرتا ہے۔ ہندوستان میں بین الاقوامی ادبی میلوں کا آغاز ۲۰۰۶ء میں ہوا اور اس کے بعد سے ۲۰۱۱ء تک پانچ دن تک مسلسل جاری رہنے والے یہ میلے ہر سال ۲۱ سے ۲۵ جنوری تک دہلی کے متصل شہر جے پور میں منعقد ہوتے رہے جو راجستھان کی

ایک ریاست تھی۔ ایک غیر سرکاری تنظیم ‘‘جے پور وراثت فاؤنڈیشن’’ کے زیر اہتمام ان میلوں کا آغاز ہوا۔ سالِ رواں کے میلے کو جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا کتابی میلہ قرار دیا گیا جس کے قومی اور بین الاقوامی شرکاء میں ترک مصنف اُرحان پاموک جسے اپنے ہم وطن ترکوں کے آرمینیا کے عوام پر ‘‘مظالم’’ بے نقاب کرنے پر نوبل انعام عطا کیا گیا جبکہ رُسوائے زمانہ شاتمِ رسولؐ سلمان رُشدی ۲۰۰۷ء کے میلے میں شریک تھا ایسے لوگوں کی شرکت کے پسِ پردہ مقاصد کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ ہندوستان میں ان میلوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بین الاقوامی شراکت وتعاون سے ان میلوں کی وسعت ومعنویت میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا یعنی ۲۰۰۶ء کے میلے میں صرف ۱۱۸ اہل قلم شامل ہوئے تھے اور ناظرین وسامعین کی تعداد ۱۰۰ سے متجاوز نہ تھی جبکہ ۲۰۰۷ء اور ۲۰۰۸ء کے میلوں کے بعد ۲۰۰۹ء میں مقررین ومصنفین کی تعداد ۱۴۰ اور ناظرین وسامعین کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ ان مواقع پر جن اصنافِ ادب وثقافت پر تقاریب منعقد کی گئیں ان میں شاعری۔ موسیقی۔ رقص۔ مباحثے۔ مذاکرے اور ورکشاپس وغیرہ شامل ہیں۔

سابق جے پور ریاست کے انیسویں صدی کے تاریخی ‘‘ڈگی پیلیس’’ میں منعقد ہونے والے سالِ رواں کے میلے کا نمایاں رجحان نسل پرستی اور سامراجیت کے حوالے سے مقالات و تقاریر کا ایک سلسلہ تھا۔ مسلم اکثریتی مقبوضہ کشمیر کے چودھویں صدی سے ابتک کے قیمتی ادبی ورثے کا عالمی منظرنامے سے اوجھل ہو جانا ایک المیے سے کم نہیں جس کا ایک سبب عالمی زبانوں بشمول انگریزی زبان میں تراجم کا فقدان ہے۔ غنی کاشمیری جیسی عظیم ہستیاں تاریخ کی گرد میں روپوش ہو کر رہ گئیں۔ غنی کے بارے میں جس کی وفات (۱۶۶۱ء) صرف ۳۹ سال کی عمر میں ہوئی اور جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں خاص طرز کا موجد اور مثالیہ نگاری میں یکتا تھا مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ‘‘مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے لیکن کلیم، مرزا صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنا دیا۔’’

یہاں غنی کاشمیری کے دو خوبصورت اشعار کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔

آسودگی بگوشۂ ہستی ندیدہ ایم   جاں دادہ ایم و کُنجِ مزارے خریدہ ایم
در عالم مثال مثالت بنودہ است   ہر چند کز دریچۂ آئینہ دیدہ ایم

ہندوستان کے ان میلوں میں ایسے پاکستانی فنکار اور ایسی شخصیات بھی شریک تھیں جو اپنی شناخت آپ ہیں۔ ان ناموں میں شامل چند یہ ہیں۔ مونی محسن۔ کاملہ شمسی۔ شاہ بانو بلگرامی۔ ندیم اسلم۔ محمد حنیف۔ دانیال معین الدین۔ سلیمہ ہاشمی۔ علی سیٹھی۔ اسماء جہانگیر۔ شوکت شورو اور قوالوں میں عبداللہ منظور نیازی۔ حضرت میاں میرؒ کے روضہ پر قوالی پیش کرنے والے قوال اور سلمان احمد (جنون گروپ) شریک تھے۔ مقامی ادب وثقافت اور عقیدہ ومذہب پر یلغار کا یہ سلسلہ ۲۰۱۰ء میں اپنے اصل ہدف یعنی پاکستان پہنچ گیا لیکن یہاں اہتمام وانصرام مغربی اداروں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چنانچہ ۲۰ اور ۲۱ مارچ ۲۰۱۰ء کے ادبی میلے (Literature. Festival) کے حوصلہ افزا انعقاد کے بعد جس میں پاکستان۔ برطانیہ۔ امریکہ اور انڈیا سے تیس اہلِ قلم اور رفنکارروں نے شرکت کی۔ برٹش کونسل اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے کارپردازوں نے جناب اسلم فرخی کی معیت میں ۵ اور ۶ فروری ۲۰۱۱ء کو دوسرے ادبی میلے کے انعقاد کا اعلان فرمایا اور کراچی شہر سے میلوں دور بلکہ پبلک ٹرانسپورٹ کی حدود سے بھی خاصے فاصلے پر کارلٹن ہوٹل کو میلے کے پروگراموں کے لیے منتخب کیا۔ بہرحال میلے کے انعقاد کا جو مقصد بتایا گیا وہ یہ تھا کہ ملک کے ابھرتے ہوئے فنکاروں ادیبوں اور شاعروں کو عالمی منظرنامے پر متعارف کرایا جائے گا۔ اس سلسلہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی امینہ سیّد صاحبہ برٹش کونسل کے سید مشہود رضوی صاحب نے بلند بانگ تقاریر بھی فرمائیں چنانچہ میلے کے رنگارنگ پروگراموں میں مذاکرے اور مباحثے۔ تخلیقی ادب نگاری، ورک شاپس اور کتابوں کی رونمائی میں پاکستان۔ برطانیہ۔ امریکا اور انڈیا کے مشاہیر ادب وفن نے حصہ لیا۔

نمایاں شخصیات میں کرن آرمسٹرونگ نمایاں ترتھیں جو اپنی تصانیف مثلاً دردمندانہ زندگی کی طرف بارہ قدم (Twelve steps to a compessinate life) تاریخ معبود (A History of God) اور تقابلی مذاہب (Comparative Religions) نیز دیگر کتب

کے لیے عالمگیر شہرت رکھتی ہیں ان کے علاوہ افسانہ نگار دانیال معین الدین۔ ناول نگار کاملہ شمشی۔ احمد رشید جن کی تصانیف ''طالبان'' اور ''عسکریت پسند اسلام (Militant Islam) وسط ایشیا میں تیل اور بنیاد پرستی، (Oil and fundamentalism in Central Asia) شہرت یا رسوائی کے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہیں۔ میلے کا ہمیشہ کی طرح مقبول ترین روایتی پروگرام مشاعرہ تھا بہرحال ادب وشعر کے دیگر ناموں میں امجد اسلام امجد، انتظار حسین، زہرہ نگاہ، افتخار عارف، حسن منظر، زاہدہ حنا، اسد محمد خاں اور کشور ناہید کے اسماء بھی شامل تھے۔ انتظار حسین نے اس میلے میں پتے کی بات یہ کی کہ ''پاکستان کے منظر نامے پر اُبھرنے والی دو طاقتیں ہیں، خواتین اور مُلّا'' اب نہیں معلوم کہ مُلّا کا استعارہ اسلام کی نمائندگی کرتا ہے یا کچھ اور کیونکہ مُلّا ہمارے معاشرے کا کوئی نیا کردار نہیں حکیم الامت حضرت علامہ نے تو ہمیشہ اس کردار کو اس کی غلو پسندی اور اسلام کے حقیقی سیاق وسباق کے حشو وزوائد کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اس میلے کے ایک اجتماع میں جس میں مغربی لادینیت کے تناظر میں اسلام کو رمزوکنایہ کی زبان میں عسکریت پسند ٹھہرایا جارہا تھا وہاں ایک حق پرست آواز بھی بلند ہوئی تھی کہ ''ہم یہ سننے کے لیے بھی گوش برآواز ہیں کہ ہمارا دین امن کا دین ہے۔'' لیکن جن مقرروں کو ''آزادئ تقریر'' عطیہ کی گئی ان میں یہ تلقین کرنے والی مصنفہ آرمسٹرونگ بھی تھیں کہ پاکستانیوں کو ''ہمدردی کا برتاؤ'' (Compassionate behaviour) اختیار کرنا چاہیئے۔ کیا یہ الزام تراشی کا ایک بالواسطہ انداز نہیں تھا؟ یہی نہیں بلکہ احمد راشد نے طنز واستہزاء کا تند وتیز نشتر چلاتے ہوئے کہا کہ حکومت پاکستان کو سابق گورنر سلمان تاثیر کے قاتل کے خلاف مقدمے میں استغاثہ کا موقف پیش کرنے کے لیے کوئی وکیل تک میسر نہیں آیا۔ ہُود بھائی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایک طوفان (Tsunami) ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور پاکستان عدم اطمینان واضطراب کا ایک کھولتا ہوا لاوا بن چکا ہے۔ (Pakistan- a seething Mass of discontent) خدا کرے ان شواہد کے باوجود ہمارا یہ گمان درست نہ ہو کہ:

''کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں''

(سالنامہ ۲۰۱۱ء)

پاکستان میں تعلیم و تحقیق کی شکست و ریخت

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس عالمگیر حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ البتہ تاریخ ہی سے ثابت ہے کہ دہرائے جانے کے اس عمل میں یکسانیت نہیں بلکہ یہ عمل گوناں گوں اور متنوع ہے۔ ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی سفاکانہ تباہی تاریخ کا سیہ ترین باب ہے۔ قطع نظر دیگر انسانی سانحات کے اس درندہ صفت حملہ آور کی علم دشمنی بھی اسی سیاہ باب کا ایک حصّہ ہے۔ نادر مخطوطات اور قلمی کتب جنھیں ہمیشہ علم کا بیش بہا خزانہ سمجھا گیا بغداد پر حملے کے بعد دریائے فرات میں بہا کر غرقاب و معدوم کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ مدارس و علمی مراکز کو جو بغداد کے وقار کی علامت سمجھے جاتے تھے اس طرح تاراج و برباد کیا گیا کہ خود تاریخ اس پر نوحہ کناں ہے۔

جہل و آگہی کی یہ جنگ آج تک جاری و ساری ہے ہر چند کہ مظاہر تبدیل ہوتے رہے ہیں اہل یونان ہوں کہ ہم، جنھیں تقسیم برصغیر کے وقت عظیم الشان علمی ورثہ سے محروم ہونا پڑا، ایک ہی تاریخی عمل سے گزر چکے ہیں دوسری طرف اس حقیقت کا ادراک کہ سرمایۂ دانش ہی پر جو اعلیٰ تعلیم سے مشروط ہے۔ معاشی ارتقاء کا بھی انحصار ہے جب بیدار ہوا تو مزاحم قوتیں صف آراء ہو گئیں اور اس کے باوجود کہ طلوعِ آزادی کے بعد اولین ترجیح کے طور پر بانی پاکستان حضرت قائد اعظمؒ نے تعلیمی حکمتِ عملی کے رہنما خطوط مہیا فرما دیئے تھے ہماری بصیرت باختہ قیادتوں نے ان سے انحراف برتا یہاں تک کہ چھ دہائیوں سے زیادہ مُدّت گزر جانے اور متعدد تعلیمی پالیسیاں وضع کرنے کے باوجود ہم اپنی سمت کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔ غیر یکساں تعلیمی نظام جس نے قوم کو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے آج تک مسلط ہے۔ قومی زبان کو جو ہماری وحدت و طاقت کی ضامن ہے متنازعہ بنا دیا گیا ہے۔ ذہنی غلامی باعث تفاخر ٹھہری ہے۔ تمام اقدارِ حیات کو ہوس گزیدہ سیاست نے پابہ زنجیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ آئین کو جس کا احترام قومی فریضہ ہونا چاہیئے ترمیم و تنسیخ

کے لئے تختۂ مشق بنالیا گیا ہے۔ جعلی اسناد کا تحفظ مطلوب ہو یا غیر آئینی انتخابات کو آئینی قرار دینا مقصود، ملکی دستور کو موم کی ناک بنا دینا ہر اقتدار پرست کا وطیرہ بن چکا ہے حد یہ ہے کہ آج سیاسی کردار کا ایک ایسا منظر نامہ مرتب ہو چکا ہے کہ جہاں ''قاتل و مقتول'' بغلگیر نظر آتے ہیں۔

ملکی تاریخ میں پہلی بار درست سمت میں ایک جرأت مندانہ قدم اُٹھایا گیا کہ سال ۲۰۰۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے متبادل کے طور پر ملک کے مایۂ ناز فرزند اور بین الاقوامی شہرت و احترام کے حامل سکالر اور ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمان کی سرکردگی میں اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے دائرہ کار میں جو اہم امور شامل کیے گئے ان میں اسناد کی تصدیق۔ معیار کی ضمانت نیز مربوط قومی منصوبہ بندی وغیرہ شامل تھے۔ ان مقاصد کا تعین جس پس منظر کی بنیاد پر کیا گیا وہ یہ تھا کہ جامعات میں وسائل کی کمی اساتذہ کی تربیت و ترغیبات کا غیر مؤثر نظام، تحقیق کی طرف عدم توجہی۔ اندرون و بیرون ملک بین الجامعاتی عدم اشتراک اور رابطہ کا فقدان وغیرہ۔ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے چنانچہ ڈاکٹر عطاء الرحمان کی عالمانہ و مدبرانہ قیادت میں کمیشن نے اپنی کارکردگی کا سکّہ دنیا بھر میں جما دیا یہاں تک کہ کمیشن کے قیام کے وقت ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد صرف ایک لاکھ پینتیس ہزار تھی جو چھ سال کے عرصہ میں چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ جامعات کی تعداد بھی ۵۷ سے بڑھ کر ۱۲۷ ہو گئی۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی کا شمار دنیا کی اعلیٰ معیار کی یونیورسٹیوں میں نہیں ہوتا تھا لیکن اس مدت میں ہماری پانچ یونیورسٹیوں کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا اور اس کے اعتراف میں عالمی بنک اور یو۔ ایس۔ ایڈ کی طرف سے کمیشن کو علی الترتیب تیس اور پچیس کروڑ ڈالر کی امداد فراہم کی گئی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے چار سو طلباء بیرونِ ملک بھجوائے گئے جب کہ تین ہزار سے زائد طلباء نے ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔

یہ وہ قابل فخر ترقی تھی جس کی بنا پر پاکستان کو عالمی تحقیق کے اُفق پر طلوع ہوتا ہوا ستارہ قرار دیا گیا حتیٰ کہ ہندوستان بھی ہماری پیروی پر مجبور ہوا۔ ڈاکٹر عطا الرحمان کو ان کی ان خدمات کے اعتراف میں آسٹریا کا اعلیٰ ترین ایوارڈ دیا گیا جو پوری قوم کے لیے باعثِ فخر تھا لیکن پھر ہوا کیا کہ

سیاسی قیادت کی تبدیلی کے ساتھ ہی یہ ادارہ ملک کی مجالسِ قانون ساز کے ان اراکین کی نظروں میں کھٹکنے لگا جن کی جعلی ڈگریوں کی تصدیق سے اس ادارہ نے معذرت کر لی جس کے نتیجے میں پچپن ارکان پارلیمان کی ڈگریاں جعلی قرار پائیں اور دو سو پچاس مشکوک جن میں بعض وزارے کرام بھی شامل تھے چنانچہ ۲۰۱۰ء میں صوبوں اور وفاق کے درمیان قانون سازی کے آئینی تعینات کے پیش نظر ۱۹۷۳ء کے آئین میں اُٹھارویں ترمیم لائی گئی۔

ترمیم پر عملدرآمد کے لئے جو پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی گئی اس کی سربراہی مقتدر سیاسی جماعت کے ایک ذہین ماہر قانون کے سپرد کی گئی لیکن جب ذہانت گروہی سیاست ومفادات کے تابع ہو کر رہ جائے تو مثبت نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ موصوف نے فوراً ہی اعلان فرما دیا کہ وزارت تعلیم ومتعلقہ شعبہ جات کے ساتھ ہی اعلیٰ تعلیمی کمیشن بھی صوبوں کو منتقل کر دیا جائیگا امریکہ نے اس اعلان کے ساتھ ہی ۲۵۰ ملین ڈالر کی امداد معطل کر دی جب کہ پورے ملک میں اک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا کہ یہ اعلان نہ صرف قومی مفاد کے صریح منافی تھا بلکہ خود آئینی ترمیم سے بھی متصادم تھا۔ آئین کے چوتھے شیڈول کے حصّہ دوم میں وفاقی قانون سازی کی جو فہرست شامل ہے اس کی شق نمبر ۷ کے مطابق ''سائنسی وتکنیکی تحقیق کے درمیان رابطہ کاری'' وفاق کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح شق نمبر ۱۲ کی روشنی میں وفاق کو اختیار ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے معیارات کا تعین کرے جب کہ پاکستان میں غیر ملکی طلباء اور بیرون ملک پاکستانی طلباء کے امور بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ بعد میں عدالت عظمیٰ پاکستان نے بھی مذکورہ شقوں کے مندرجات پر مہر تصدیق مثبت فرمادی۔

بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے اس ادارے کو عملاً مفلوج اور شکست و ریخت سے دوچار کر دینے کے لیے اب مزید سفاکانہ اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ گزشتہ سال (۲۰۱۰-۱۱ء) کے میزانیے میں مختص کردہ رقم کو ضروریات کے تخمینے (۳۰ بلین) سے گھٹا کر تقریباً نصف (۷۶ء ۵ بلین) کر دیا گیا تھا اور اب (۲۰۱۱-۱۲ء) کے میزانیے میں مزید کٹوتی لگا کر مختص رقم صرف ۱۴ بلین رہ گئی ہے۔ جب کہ وفاقی سطح کے صرف دو ایوان ہائے بالا کے شاہانہ اخراجات

میں صرف خفیف سی کمی کر کے معاشی ترقی میں موثر معاونت مہیا کرنے والے اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ضامن اس مرکزی ادارے کو سہارا فراہم کیا جا سکتا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کے لیے مجموعی قومی آمدن کا ۴ فیصد مختص کیا جاتا ہے جبکہ اس میں اعلیٰ تعلیم کا حصہ ۳ فیصد ہوتا ہے۔ ہمارے قرب وجوار میں جنوبی کوریا کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں طالب علموں کی کل تعداد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی شرح ۸۸ فیصد ہے اور برادر ملک ترکی میں یہ شرح ۲۳ فیصد ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کو اپاہج بنا دینے کے نتیجے میں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ یہ ادارہ عالمی بنک کی موجودہ ۳۰۰ بلین ڈالر کی امداد کی پیش کش سے بھی محروم ہو جائے گا کیونکہ یہ امداد جن اہداف کے حصول سے مشروط ہے ان میں وظائف کی تعداد میں اضافہ، تحقیقی مطبوعات میں اضافہ، تعلیمی اداروں تک سہل رسائی، معیار تعلیم میں اضافہ اور مستند و تجربہ کار اساتذہ کی تعداد بڑھانا شامل ہے۔ سال رواں کے دوران ہی ۲۶ مئی کو مظلوم و مقہور اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے ملک میں پہلی بار ایک قومی کانفرنس بعنوان ''اکیسویں صدی کے پاکستان میں معیارات کا تعین'' منعقد کی۔ ماہرین نے تقاریر کیں لیکن سرکاری سرپرستی کہیں نظر نہیں آئی۔۔۔

'کسے گواہ کریں کس سے منصفی چاہیں'

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۱ء)

قومی زبان کی تذلیل ۔۔۔ حمیّت باختہ سفارتکاری

’’کیا پاگل ہو گئے ہو؟ اردو کیوں سیکھ رہے ہو؟ کیا دنیا میں تمھیں اور کوئی کام نہیں‘‘ یہ تین مختصر سوالیہ جملے نہیں بلکہ طنز اور تحقیر و تذلیل کے زہر میں ڈوبے ہوئے وہ تیر و نشتر ہیں جو کوئی بھی محبِّ وطن پاکستانی جس کے دل میں اپنی قومی زبان اردو کے لیے احترام ہو سننے کی تاب نہیں لا سکتا لیکن سانحہ تو یہ ہے کہ یہ جملے پاکستانیوں ہی کی زبان سے ادا ہوئے اور ان کے مخاطب وہ لوگ تھے جو خود تو پاکستانی نہیں لیکن جن کے دلوں میں پاکستان اور اردو کی محبت موجزن ہے۔ یہ اذیّت ناک انکشاف گذشتہ دنوں کراچی میں منعقدہ عالمی اردو کانفرنس میں شریک ترکی کے مایۂ ناز بین الاقوامی شہرت یافتہ سکالر پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار نے کیا جو استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ سہ ماہی ’الاقرباء‘ کی بیرون ملک مجلسِ مشاورت کے رکن بھی ہیں۔ آپ اکثر و بیشتر اس تاریخی پس منظر میں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے بلقان کی جنگوں میں اور عظیم الشان تحریک خلافت کے دوران جس اخوت و محبت کا ثبوت دیا ایک سپاس گزار ترک مسلمان کی حیثیت سے ’الاقرباء‘ کے لیے گراں قدر علمی تحقیق پر مبنی مقالات و مضامین لکھتے رہے ہیں۔ یہ تحریریں پروفیسر موصوف کے پاکستان سے قلبی لگاؤ اور اردو زبان و ادب سے والہانہ محبت کی آئینہ دار ہیں۔

ہمیں توقع تھی کہ کراچی سے شائع ہونے والے ایک موقر ترین انگریزی زبان کے روزنامے میں جسے عالمی سطح پر بھی پاکستان کی شناخت سمجھا جاتا ہے پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار کا متذکرہ انٹرویو منظر عام پر آنے کے بعد ہمارا دفتر خارجہ اس کا نوٹس لے گا اور کم از کم فوری طور پر اس دل آزاری کے لئے معذرت خواہ ہوگا لیکن جہاں استنبول (ترکی) میں واقع ہمارے قونصل خانے کے بےحمیّت عمّال نے ہمارے سر ندامت سے جھکا دیئے ہیں وہیں حکومتی سطح پر بےحسی بھی کچھ کم اندوہناک نہیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ حالیہ برسوں میں انھوں نے شعبۂ

اردو کے طلباء کو استنبول میں پاکستانی قونصل خانے بھیجا تا کہ ایک پروگرام کے مطابق وہ پاکستانی عملے سے روابط کے دوران اپنی اردو میں بول چال کے معیار کو بہتر بنا سکیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اولاً تو ان طلباء کی اردو میں گفتگو کا جواب انگریزی میں دیا گیا اور پھر یہ کہہ کر کہ ”کیا پاگل ہو گئے ہو۔۔۔“ انھیں کو دُھتکار دیا گیا۔

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بیرونِ ملک ہمارے سفارتی دفاتر کے مقاصد کیا ہیں اور کیا ان کے فرائض میں سیاسی سفارتکاری کے علاوہ پاکستان کی تہذیب وثقافت کو متعارف کرانے میں جس میں قومی زبان ہمیشہ سرِ فہرست ہوتی ہے کوئی کردار ہے بھی کہ نہیں؟ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعہ ۲۰۰۸ء کو زبانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا تھا اس سلسلہ میں ہم نے یونیسکو کے حوالے سے جو کوائف حاصل کیے ان کے مطابق دنیا کی ساڑھے چھ ارب نفوس پر مشتمل آبادی میں ایک ارب سے بھی متجاوز آبادی جس زبان کو بولتی اور سمجھتی ہے اُسے ”ہندوستانی“ کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے اداریہ مطبوعہ سالنامہ (جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء) کے ذریعے اپنی وزارت خارجہ کی توجہ مبذول کرائی کہ دنیا میں ’ہندوستانی‘ نام کی کوئی زبان نہیں پائی جاتی بلکہ خود انڈیا کی سرکاری زبان کا نام ’ہندوستانی‘ نہیں بلکہ ’ہندی‘ ہے اور یونیسکو کے ریکارڈ میں یہ گمراہ کن اور سنگین غلط بیانی کی محرک بھارتی سفارت کاری ہے جس نے دباؤ کے حربے استعمال کر کے ”اردو“ کی جگہ ”ہندوستانی“ لکھوا دیا ہے۔ ان حالات میں اقوامِ متحدہ میں ہمارے سفارتی مشن کا یہ فرض تھا کہ یونیسکو کے ریکارڈ کی تصحیح کراتا جس کی بنیاد پر ’اردو زبان‘ کا یہ حق ہے کہ اُسے اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ لیکن استنبول کے اس دلخراش سانحہ کے بعد ہمیں ہرگز اب کوئی خوش فہمی نہیں کہ ہمارے ارباب اختیار کے ”نصاب اقتدار“ میں مملکت کے نظریے۔ تہذیب وثقافت بالخصوص قومی زبان کی بھی کوئی اہمیت ہے جس کا ملک کی اعلیٰ ترین دستاویز یعنی آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ میں برملا اعلان کیا گیا ہے اور جس سے وفاداری کا حلف ہر حکمران اُٹھاتا ہے۔

ہم اپنے ترک بھائیوں سے ازحد شرمندہ ہیں کہ ہم نے اُن کی محبتوں کے جواب میں اُن کی

دل آزاری کی اور خاص طو پر اپنے برادرِ محترم پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار سے معافی کے خواستگار کہ جنھوں نے اپنی زندگی اردو اور پاکستان کے نام وقف کر دی ہے اُنھیں یہی نہیں بلکہ اور بھی صدمات ہمارے سفارت کاروں کے ہاتھوں اٹھانے پڑے ہیں ہمیں علم ہے کہ استنبول میں ہمارے اس قونصل خانے نے اُن سے تعاون کا وعدہ کر کے منحرف ہو جانے پر ان کی ذاتی کاوشوں کے نتیجہ میں منعقد ہونے والی علامہ اقبال بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر ان کے لیے اچانک کتنے سنگین مالی اور انتظامی مسائل کر دیئے تھے حالانکہ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد ہی پاکستان۔ پاکستان کی قومی زبان اور پاکستان کے قومی شاعر کے تصور کو اجاگر کرنا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ترکی میں پاکستانی سفارت خانے کی بے حسی اور عدم توجہی وہاں یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' کے ختم کیے جانے پر منتج ہوئی۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی مرحوم نے جو اقبال چیئر کے لیے نامزد کیے گئے تھے واپسی پر بتایا تھا کہ وہ بھی اسی سفارت خانے کے زخم خوردہ تھے جس نے انھیں موعودہ مراعات اور مشاہرہ تک کے حصول میں اپنے منفی رویے کے باعث مسلسل ایک عذاب میں مبتلا رکھا۔

آخر میں ہم اپنے محسن اور کرمفرما ڈاکٹر طوقار کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ ترکی میں ہمارے سفارت کار نہ سہی لیکن وہ خود اردو اور پاکستان کی شناخت بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں مزید ارزانی فرمائے۔ آمین۔ (اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۱ء)

جامعہ کراچی کی غلط بخشی

جامعات اپنی معارف پروری کے ذریعہ ہی اپنی شناخت قائم کرتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جامعہ کراچی کو ملک میں ایک عظیم الشان گہوارۂ علمی کی حیثیت سے ممتاز و منفرد مقام حاصل رہا ہے۔ رئیس الجامعہ کے منصب فاخرہ پر ایسی ہستیاں فائز رہیں جو بین الاقوامی سطح پر بھی اہل علم کی آنکھ کا تارا تھیں اور اساتذہ میں نامور شخصیات کی ایک ایسی کہکشاں نظر آتی ہے جن سے فیض یافتہ کئی نسلیں ملک میں اور بیرون ملک متعدد شعبہ ہائے زندگی کو منوّر کرتی رہی ہیں۔ جامعہ کی عطا کردہ اسناد کو دنیا بھر میں اعتماد و اعتبار کا مرتبہ حاصل رہا۔ لیکن بدقسمتی سے ملک میں سیادت و قیادت کے بحرانوں نے زندگی کے ہر شعبہ کو زوال و انحطاط کی لپیٹ میں لے کر ترقیِ معکوس کے عمل کو اُس نہج تک پہنچا دیا جہاں تعلیمی اور علمی ادارے بھی محفوظ نہیں رہے جو معاشرہ کو اخلاقی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

موجودہ ہئیتِ حاکمہ کے ’جسے ملکی تاریخ میں بدترین نظام حکمرانی کے الزامات کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر تنقید کا بھی سامنا ہے‘ ایک مقتدر ترین وزیر کو عطائے اعزاز کی ایک خصوصی اور پُرشکوہ تقریب میں کراچی یونیورسٹی کی جانب سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پیش کی گئی۔ وزیر موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھیں پہلی اور غالباً آخری بار کابینہ کے ایک اجلاس کے آغاز سے قبل قرآنِ حکیم سے تلاوت کی دعوت دی گئی چنانچہ انھوں نے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا اور سورۂ اخلاص کی تلاوت کرنے کی کوشش فرمائی جو صرف چار آیتوں پر مشتمل ہے لیکن قُل ھُوَ اللہ اَحَد کی پہلی آیت سے شروع ہونے والی اس سورۃ کی تلاوت وہ نہ فرما سکے جب کہ ان کی وزارت کے اس عہد زریں میں ملک کے کروڑوں عوام کی آنتیں بھوک اور افلاس کے سبب دن رات ’قل ھُو اللہ‘ پڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن صحیح تلاوت نہ کر سکنے میں وزیر صاحب کا کوئی قصور نہ تھا۔ بقول ان کے یہ سورۃ ہی اُنھیں غلط لکھ کر دی گئی تھی تاہم اراکینِ کابینہ اور الیکٹرانک میڈیا کے ناظرین بہت محظوظ ہوئے۔ (اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۱ء)

ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔۔ عقل وتدبّر کی آزمائش

سیاست سے قطع نظر، ہماری توجہ ایسے موضوعات پر مرتکز رہتی ہے جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ ہماری تہذیب وثقافت، تعلیم اور علم وادب سے ہے کہ ہماری شناخت کے تمام اجزائے ترکیبی انھیں شعبوں میں تادیب وتہذیب کے عمل سے گزر کر پرورش پاتے ہیں۔ تاہم یہ فکر اور اس کا ارتقاء معاشرتی شعور سے مشروط ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ شعور ناپختہ بھی ہے اور ہماری اجتماعی بے حسی کا صیدِ زبوں بھی۔ گزشتہ برس ہماری پارلیمان کے ایوان زیریں (قومی اسمبلی) میں حکومتی بنچوں پر بیٹھنے والے بائیس ارکان کا تیار کردہ آئینی ترمیمی بل کا مسودہ پیش کیا گیا تاکہ آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ میں ترمیم کی جائے۔ چونکہ حکومت کی جانب سے بل کے مسودہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا اس لیے حسب ضابطہ اُسے ایوان کی متعلقہ قائمہ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جو کسی بھی وقت غور کے بعد حتمی شکل میں ایوان میں منظوری کے لئے پیش کر سکتی ہے۔ آرٹیکل ۲۵۱ کا متن درج ذیل ہے:

> ”پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسے سرکاری و دیگر مقاصد کے لیے استعمال میں لانے کی خاطر یوم آغاز سے پندرہ سال کی مُدّت کے دوران اقدامات کیے جائیں گے۔“

مجوزہ ترمیم کے نکات ملاحظہ ہوں:

۱ بلوچی۔ پنجابی۔ پشتو۔ شنا/ بلتی۔ سندھی۔ سرائیکی اور اُردو پاکستان کی قومی زبانیں ہیں۔

۲ انگریزی اس وقت تک دفتری زبان رہے گی جب تک قومی زبانیں متبادل قرار پاسکیں۔

۳ کوئی بھی صوبائی اسمبلی قانون کے ذریعہ قومی زبانوں کے ساتھ صوبائی زبان کی تدریس، فروغ اور استعمال کے لیے اقدامات تجویز کر سکے گی۔

تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ پاکستان اور اُس کے عوام کو یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا کہ ملک کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گی کہ جن کے اذہان تدبّر باختہ، مفلوج، عصبیت زدہ

اور عاقبت نا اندیش ہوں گے۔ ان کے ضمیر مُردہ ہو چکے ہوں گے اور دیدۂ بینا سے محروم و بے بصر یہ مریضانِ احساس کمتری صرف مغرب کی دریوزہ گری پر ثابت قدم ہو کر رہ جائیں گے۔ ہوسِ زر میں اوسان کھو بیٹھیں گے اور صرف آپس ہی میں دست و گریباں ہو کر اپنے ہی ملک کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیں گے۔ کیا انھیں یہ نہیں معلوم کہ:

- قومی زبان بننے کا حق صرف اُس زبان کو حاصل ہوتا ہے جو ملک کے طول و عرض میں رابطہ کی زبان کی صلاحیت رکھتی ہو اور جسے لوگ بول اور سمجھ سکتے ہوں۔
- اُردو تحریکِ پاکستان کی زبان اس لیے تھی کہ وہ برصغیر کے چپہّ چپہّ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اُس جیسا عظیم تہذیبی و ثقافتی ورثہ اور علمی مرتبہ نہ پہلے برصغیر کی کسی زبان کو حاصل تھا نہ ہے۔ آج بھی انٹرنیٹ پر بین الاقوامی زبانوں کے شانہ بشانہ جو زبان نظر آتی ہے وہ اُردو ہے اور جسے دنیا کی تقریباً ڈیڑھ ارب آبادی بول سکتی اور سمجھ سکتی ہے۔
- لفظ اُردو ہر نوع کی علاقائی اور جغرفیائی نسبت سے بالاتر اور ماورا ہے۔ لسانی تعصّبات اس زبان کا مزاج نہیں۔ دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کر لینا اس کی صلاحیت بھی ہے اور روایت بھی جس کے نتیجہ میں اس زبان کی لسانی آفاقیت نے اسے دیگر پاکستانی زبانوں کے ساتھ شیر و شکر کر دیا ہے۔ جس کی گواہ وطن عزیز کی ۶۵ سالہ تاریخ خود ہے یہ دوسری زبانوں کے فروغ و ارتقاء کے عمل میں کبھی رکاوٹ تھی نہ ہے۔
- اُردو کو پاکستان کی قومی زبان ہونے کا اعزاز و افتخار پاکستان کے ہر آئین میں حاصل رہا ہے جس کے لیے ۱۹۵۶ء کے دستور کا آرٹیکل ۲۱۴۔ ۱۹۶۲ء کے دستور کا آرٹیکل ۲۱۵ اور ۱۹۷۳ء کے دستور کا آرٹیکل ۲۵۱ برملا ثبوت ہے۔ جسے ہدفِ ترمیم بنا کر پاکستان کی ایک نہیں بلکہ آٹھ زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دے کر نہایت مضحکہ خیز اور بے جواز پارلیمانی تحریک کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔

- قومی یک جہتی اور وفاقِ پاکستان کو (خدانہ کردہ) انتشار وافتراق سے دوچار کردینے اور نہایت سنگین مضمرات پر مبنی آئینی ترمیم کا مجوزہ بل پیش کرنے والے کیا اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ۱۹۷۳ء کا آئین متفق الیہ آئین ہے جسے قومی اسمبلی اور سینٹ میں قوم کی نمائندگی کرنے والی ہر جماعت کے اراکین اور وفاق کی تمام اکائیوں نے ملک وقوم کے بہترین مفاد میں یک زبان و یک دل ہو کر سند اعتبار عطا کی تھی۔

- ۱۹۷۳ء کے آئین کا آرٹیکل ۲۸ ترمیم کے محرکین کی جس بے بصری کا شکار ہوا ہے وہ بذاتِ خود اک سانحہ ہے۔ آرٹیکل کا متن درج ذیل ہے۔

> ’زبان رسم الخط اور ثقافت کا تحفظ: آرٹیکل ۲۵۱ سے مشروط (مملکت کے) شہریوں کے کسی بھی حلقے کو جو نمایاں زبان، رسم الخط اور ثقافت رکھتا ہو حق حاصل ہو گا کہ وہ قانون کے تابع ان کے تحفظ اور فروغ کے مقصد کے لیے ادارے قائم کرے‘‘

آئین کی یہ شق نہ صرف پاکستانی زبانوں بلکہ بولیوں تک کو جن کی تعداد ملک میں ۳۹ ہے زبان، ہی نہیں رسم الخط اور تہذیب وثقافت کو بھی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس کے باوجود اراکین نے جس جسارت کا مظاہرہ کیا ہے اُس میں حُب الوطنی کا شائبہ تک تلاش کرنا بھی کار محال ہے۔

- کیا یہ امر ممکن العمل ہو سکتا ہے کہ آٹھوں زبانوں کے انگریزی زبان کا متبادل بن جانے کے بعد تمام ملک یعنی مرکز صوبوں، اضلاع اور مقامی حکومتوں کے دفاتر میں بیک وقت مسل نگاری کا کام آٹھ زبانوں میں کیا جائے اور بین الاقوامی امور میں سربراہان مملکت وحکومت کے بین المملکتی دوروں کے موقع پر جب کہ مہمان یا میزبان شخصیت اگر اپنی قومی زبان میں تقریر یا گفتگو کرنے کو ترجیح دے تو کیا پاکستانی شخصیت آٹھ زبانوں میں اُسے جواب دے گی؟ اس سے زیادہ مضحکہ خیز صورت حال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

○ اِس بل کے خدانخواستہ منظور ہو جانے کی صورت میں کیا وہ پاکستانی جن کی مادری زبان مجوزہ آٹھ زبانوں کے علاوہ ہے جیسے براہوی، گجراتی، ہندکو وغیرہ تو کیا ہماری آبادی کے یہ طبقے بھی اپنی اپنی زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کرنے کے لیے حق بجانب نہیں ہونگے اور کیا یہ عمل پوری قوم کے جو حقیقتاً ایک قوم ہے تار و پود بکھیر کر نہیں رکھ دے گا؟ نیز گلگت بلتستان میں بولی جانے والی زبانوں کو پاکستان کی قومی زبانیں قرار دے کر کیا ہم خود اپنے اُس موقف کی تردید نہیں کریں گے جس کے تحت کشمیر اور شمالی علاقہ جات اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر متنازعہ علاقوں کے طور پر موجود ہیں۔؟

قوم شاید بھول چکی ہے کہ قومی مفادات اور قائدِ اعظمؒ کے فرمودات کے صریحاً منافی مذکورہ آئینی ترمیم کا مسودہ تاحال قائمہ کمیٹی میں زیرِ غور ہے اور آج ملکی حالات نے جو رُخ اختیار کیا ہے اس کی پاداش میں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ جائیں۔ پاکستان کا آئین جن بنیادوں پر قائم ہے اُن میں مملکت کی نظریاتی اساس وفاقی و پارلیمانی نظام اور ایک قوم ایک قومی زبان کا تصور، ناگزیر ہے ان پر نہ عقل و مصلحت کا سمجھوتہ ہوسکتا ہے نہ حب الوطنی اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ زیرِ نظر مجوزہ آئینی ترمیم نہ صرف آئین کی روح کے منافی ہے بلکہ قومی سلامتی کے لیے خوفناک ترین امکانات کی حامل ہے۔ اس دورِ ابتلا میں صرف اعلیٰ عدلیہ ہی پر اہل وطن کی نظریں مرکوز ہیں۔ رسوائے زمانہ اُٹھارویں ترمیم کے نتیجہ میں نظام و نصاب تعلیم صوبوں کو منتقل ہونے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک صوبہ میں جہاں پاکستان کے ازلی اور ابدی مخالفین کے ورثاء برسرِ اقتدار ہیں اُن کی یہ جسارت ہر محبّ وطن کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس صوبہ میں ثانوی سطح کے نصاب سے رئیس احمد جعفری مرحوم کا قائداعظم کے بارے میں لکھا ہوا مضمون ''قائدِ اعظم صوبۂ سرحد میں'' خارج کر دیا گیا ہے یہی سلوک محترم جمیل الدین عالی کی ولولہ انگیز اور حُبّ وطنی پر مبنی شاہکار نظم کے ساتھ کیا گیا ہے جو ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں ''اے وطن کے سجیلے جوانو'' کے لفظ سماعتوں تک پہنچتے ہی اہل وطن کے سینوں کو گرما دیتی ہے

اور جو افواجِ پاکستان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا والہانہ انداز ہے۔ شہید پاکستان جناب حکیم محمد سعیدؒ کے مضمون ''حریت و آزادی'' اور ترانۂ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری مرحوم کی نظم ''درۂ خیبر'' سے کیا جانے والا سلوک بھی کچھ مختلف نہیں۔

قومی اتحاد کے باغی۔ حُب الوطنی کے تقاضوں سے منحرف۔ پاکستان جیسی نعمت کے منکر اور تعصب و کوتاہ بینی کے آسیب میں مبتلا جن لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ بین الاقوامی منڈی میں ضمیر فروشوں اور وطن فروشوں کی جو اونچی بولیاں لگائی جاتی ہیں وہ اُن کی پذیرائی نہیں بلکہ رسوائی ہے۔ ملک میں متعدد ادارے نہ صرف قومی زبان کے لیے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں بلکہ وطنِ عزیز میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں اور ان سے وابستہ علاقائی تہذیبوں کے فروغ و ارتقا کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہیں جس کی ضمانت آئین کارٹیکل ۲۸ مہیا کرتا ہے۔ اس ضمن میں مقتدرہ قومی زبان نے مقامی زبانوں اور ان میں تخلیق شدہ ادب کی تواریخ پر نہایت اہم کام کیا ہے۔ ملک کی سلامتی اور قومی یک جہتی پر ایک ملک گیر ہی نہیں بلکہ اردو جیسی عالمگیر رابطہ کی زبان کے ہوتے ہوئے دستور کے آرٹیکل ۲۵۱ پر شب خون مارنے کے بجائے ملک کی کثیر اللسانی حیثیت سے مجرمانہ اغماض برتنے پر اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے خلاف اسمبلی میں اقرار داد پیش کی ہوتی جس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ رکن ممالک میں بولی جانے والی مقامی زبانوں میں تخلیق ہونے والے معاصر ادب کی دستاویز بندی کا کام سالانہ بنیادوں پر انجام دے لیکن وہاں پاکستان کا نام سرے سے غائب ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کے موجودہ انتشار آفرین حالات میں ہماری اعلیٰ عدلیہ اصلاح احوال کے لیے شب و روز مصروف ہے۔ تاہم از بس ضروری ہے کہ آئین کی ایک بنیادی شق کو سبوتاژ بلکہ منہدم کرنے کے لئے جس شرانگیز تجویز کو سامنے لایا گیا ہے اُس کا موثر اور فوری تدارک کیا جائے اور جناب چیف جسٹس آف پاکستان اُس آئینی درخواست کو عدالتِ عظمیٰ میں منتقل کرنے کے احکام صادر فرمائیں۔ جو اس ملک کے نامور ماہر قانون جناب محمد اسمٰعیل قریشی اور ان کے رفقاء نے ۱۹۹۱ء میں ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت برائے اجرائے

ہدایت و احکام دائر کی تھی کہ قومی زبان اردو کو حکومت تمام سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے نافذ اور جاری کرے جس کا قطعی اور دوٹوک وعدہ آئین میں موجود ہے۔ اس درخواست کو عدالتِ عالیہ کے سرد خانے میں پڑے ہوئے دو دہائیاں بیت چکی ہیں اور قومی زبان اردو آستانۂ عدل پر حصولِ انصاف کی منتظر ہے۔ مجلّہ ہذا کے زیرنظر شمارے میں درخواست مذکور کا مکمل متن اس التماس کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ انتظار کی ان کربناک ساعتوں کو جسقدر جلد مختصر کر دیا جائے اتنا ہی قومی تشخص کے تنِ مردہ میں اس کی حقیقی رُوح واپس آ سکے گی۔

(جنوری۔ جون ۲۰۱۲ء)

مرحبا ! عدالتِ عظمیٰ پاکستان

آئین وقانون اور عدل وانصاف کسی بھی مہذب معاشرہ کے اوصافِ حمیدہ کہے جاسکتے ہیں۔ معاشرہ کی اقدار حیات کو تہذیبی وثقافتی روایات بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ چنانچہ آئین وقانون کی تدوین وتشکیل کا عمل اسی بنیاد کے مرہون منت ہوتا ہے اور سزاوجزا کے پیمانے عدل وانصاف کی میزان سے گزر کر ہی معاشرہ کو گہوارۂ امن بناتے ہیں اُسے خودشناسی عطا کرتے ہیں اور جریدۂ عالم پر نقشِ دوام ثبت کرنے کا ولولۂ تازہ بھی۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب افرادِ معاشرہ فکری ونظریاتی یک جہتی اور تہذیبی وتمدنی ہم آہنگی کے ذریعہ ایک قوم کے سانچے میں ڈھل جائیں اور باہمی تعلقات ومراسم کو ایک رابطہ کی زبان کے تابع کرلیں جو اُن کی قومی شناخت بن جائے۔

۶۵ سال قبل جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے قائداعظمؒ کی مدبرانہ قیادت میں دنیا کے نقشہ کو پاکستان کی شکل میں ایک ایسی نظریاتی مملکت کے خدّوخال عطا کیے جو ایک اسلامی فلاحی معاشرہ کا گہوارہ ہو کیونکہ تحریک پاکستان کا عنوان ہی کلمۂ طیبہ کو قرار دیا گیا تھا نیز پشاور سے راس کماری تک بولی جانے والی بے شمار مقامی وعلاقائی زبانوں اور بولیوں کے باوجود اردو کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ برصغیر کے اُس وقت دس کروڑ مسلمانوں کے درمیان رابطہ کی واحد زبان بلکہ ان کی اُمنگوں اور جذبات کی ترجمان ثابت ہوئی۔ پاکستان کا قیام عالمی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ تھا اور حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر بھی جو اُس تسلسل کا نقطۂ عروج تھا جس کا آغاز مسلمانوں کے مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ ہجرت سے ہوا اور آنحضورؐ کی قیادت میں دنیا کی پہلی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جنوبی ایشیا کے حالات کے تناظر میں دوقومی نظریہ پیش کیا چنانچہ اس راہ میں جن شخصیات کو سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے ان میں حضرت شاہ والی اللہ دہلویؒ، سید جمال الدین افغانیؒ، سرسید احمد خاں، خیر برادران اور مولانا

عبیداللہ سندھیؒ جنھوں نے ۲۴ سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپسی پر اعلان فرمایا کہ:

''مسلمانوں کا قومی وجود الگ اور منفرد ہے''

اس الگ اور منفرد قومی وجود پر مُہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے آئین سازی میں بلا جواز اور غیر معمولی تاخیر سے قطع نظر، ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء، اور ۱۹۷۳ء میں جو دساتیر وضع کیے گئے ان سب میں منجملہ دیگر مشمولات‘ اسلام کو مملکت کا بنیادی نظریہ اور اردو کو قومی و سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ آخر الذکر دستور مکمل قومی اتفاق رائے (بشمول اسلامی دفعات) سے منظور کیا گیا البتہ اُس قرار دادِ مقاصد کے متن کو جسے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید ملت لیاقت علی خاں نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں ۱۹۴۹ء میں پیش کیا تھا اور جسے ایوان نے مکمل اتفاقِ رائے سے منظور کیا تھا دیباچہ یا تقریظ کے طور پر آئینی دستاویز سے وابستہ رکھا گیا اور آئین کا حصہ نہ ہونے کے سبب ملک کے ''بنیادی قانون'' کا حصہ نہ بن سکا اور آئین کی دیگر مشمولات کی طرح ''نافذ العمل'' نہ ہوسکا تاہم جنرل ضیاء الحق مرحوم کے عہدِ حکمرانی میں اسے آئین کا حصہ (آرٹیکل ۲۔ اے) بنا دیا گیا۔ اس طرح وطن عزیز میں قانون سازی کے عمل کو قرآن وسنت کے احکام کی مطابقت اور پاسداری سے مشروط کر دیا گیا۔

پاکستان کی ۶۵ سالہ تاریخ کا تاریک ترین اور شرمناک ترین عنصر وہ سیاسی منافقت رہی ہے جو عہد موجود تک پہنچتے پہنچتے طوائف الملوکی کی حدیں چھو رہی ہے جس کے نتیجہ میں ترامیم کے ذریعہ آئین کا حُلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے چنانچہ نہ کہیں آئین کی پاسداری نظر آتی ہے اور نہ قانون سازی میں اسلامی احکام کا احترام۔ گزشتہ تمام برسوں میں اردو کا بحیثیت سرکاری زبان عدم نفاذ آئین کی سنگین ترین بے حُرمتی ہے جس کی ذمہ دار حکومت ہے اس سلسلہ میں ہم متعدد بار اس موضوع کے ہر پہلو پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس تاریک ترین فضا میں روشنی کی جو ایک کرن نظر آئی ہے وہ عدالتِ عظمیٰ پاکستان کا وہ تاریخ ساز فیصلہ ہے جو پارلیمان کے ایوان زیریں کی صدر نشین اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے اختیارات سے متعلق ۳ جولائی ۲۰۱۲ کو ملک کی قومی زبان اردو میں تحریر کیا گیا۔ قومی زبان کے آئینی استحقاق کا علم بلند کرنے پر عدالتِ عظمیٰ پوری قوم

کے تحسین وتشکر کی مستحق ہے اب کسی فرد یا ادارہ کے لیے آئین کی خلاف ورزی کرنے کا عذر باقی نہیں رہتا ہم مستقبل میں محترم عدالت عظمیٰ سے یہ پُر خلوص توقع رکھتے ہیں کہ قومی زبان کی سر بلندی اور آئین کی پاسداری کے لیے اردو کے عدالتی استعمال کو ایک مستقل روایت بنالیا جائیگا اور ماتحت عدلیہ کو بھی پابند کیا جائے گا جہاں پہلے ہی بیشتر کام اردو میں ہو رہا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ غلامی اور احساسِ کمتری کے مریض افراد اور ادارے فوراً آئین کی مسلسل بے حرمتی سے احتراز برتیں ورنہ ہمیں امید واثق ہے کہ ہماری اعلیٰ عدلیہ اس ملک دشمن اور انتشار پسندانہ رویے کو مزید جاری رہنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گی کہ یہ بھی ایک ایسا ہی چیلنج ہے جیسا کہ دوسرے چلینجوں سے ہماری اعلیٰ عدلیہ آئین کی حُرمت و تقدس کی خاطر مخالف طاقتوں سے پوری جرأت و استقامت سے نمٹ رہی ہے۔ ہمیں دکھ ہے تو یہ کہ عدالت عظمیٰ کے درجِ بالا مستحسن اقدام پر دیگر حلقوں بالخصوص ابلاغِ عامہ کے اداروں کی جانب سے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

دور حاضر میں اسلام بدترین استحصالی رویوں کا شکار ہے اُن لوگوں کو جو دن رات جمہوریت کی رَٹ لگائے ہوئے ہیں کون بتائے کہ یہ وہ جمہوریت نہیں ہے جس کے لیے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا اور نہ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے یہ صریحاً اسلام کے منافی بھی ہے اور آئین سے متصادم بھی ۔ موجودہ مغربی جمہوریت کا تصور یونانی الاصل ہے جو بادشاہت اور پاپائیت کے سیاسی و مذہبی تشدّد اور محکومی و غلامی کے خلاف شدید ردعمل کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ خود سقراط نے اسے ’’مضحکہ خیز‘‘ قرار دیا۔ کارلائل نے ’’احمقوں کی حکمرانی‘‘ ٹھہرایا۔ اقبال کے نزدیک اس نظام میں حکومت کی باگ ڈور اعلیٰ دماغوں کے بجائے متوسط اور ادنیٰ ذہن رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جمہوریت شمار کرنا تو جانتی ہے لیکن وزن کرنا نہیں جانتی جس کے بغیر ہیئت اجتماعیہ میں عدل و انصاف قائم نہیں رہ سکتا۔ ’’اسلامی نظام حکومت نہ ملوکیت ہے نہ جمہوریت نہ بادشاہت بلکہ ان تمام محاسن کا امتزاج ہے‘‘ (ملفوظات)

مصوّر پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے ان ارشادات اور خود مغربی مفکرین کی انتہائی تحقیر آمیز لیکن حقیقت پر مبنی ان آراء کے باوجود ہمارے اہلِ دانش۔ اہل صحافت اور اہلِ سیاست کیوں ملک

کی سلامتی اور اسلامی تشخص کو اس جمہوریت کی بھینٹ چڑھانے پر تُلے ہوئے ہیں جو اللہ کے مقتدرِ اعلیٰ ہونے کے اسلامی تصور کے خلاف مقنّنہ کے مقتدر و برتر ہونے کے مشرکانہ تصوّر کی داعی ہے اس لیے ہمارے آئین سے بھی متصادم ہے اور نظریۂ پاکستان سے بھی۔ کاش کوئی اُٹھے اور اس اہم ترین نکتہ پر عدالتِ عظمیٰ سے فیصلہ صادر کرنے کی استدعا کرے یا محترم چیف جسٹس از خود نوٹس لیں۔

بقول علاّمہ ”خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی“ اسلامی قوانین کے مآخذ قرآن۔ سنت۔ اجماع۔ قیاس اور اجتہاد ہیں۔ اقبالؒ اجتہاد کو اجتماعی فکر و ذہانت سے مشروط کرتے ہیں۔ اجماع کے نتیجہ میں پارلیمان وجود میں آتی ہے جو قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے قانون سازی پر مکمل طور پر قادر ہے اور اجتہاد پر بھی۔ تمام دنیا کے سامنے اولین اسلامی مملکت (سٹی اسٹیٹ آف مدینہ) کی مثال موجود ہے جہاں مسلمانوں اور اقلیتوں کو مذہبی آزادی اور جان و مال کے ساتھ ساتھ سیاسی آزادی اور شہری مساوات کی مکمل ضمانت حاصل تھی۔ تاریخ ”میثاق مدینہ“ کی شکل میں اس روشن حقیقت کی گواہ ہے اور یہ شہادت مہیا کرتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماںؐ نے دنیا کو پہلی بار تحریری آئین مملکت عطا فرمایا جو آج بھی ہر نوع کے انسانی امتیازات سے ماورا ایک ابدی عالمی منشور ہے۔ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کا درج ذیل دوٹوک اعلان ہمارے قانون سازوں پر اسلامی مملکت کے حوالے سے سیاسی بصیرت کے در وا کر دینے کے لیئے کافی ہونا چاہیے۔

> ”اسلامی ریاست کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرکز ذاتِ خداوندی ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی شخص یا ادارے کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر سکتے ہیں۔“

بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔ قوم بُری طرح شکست و ریخت کے عمل سے دو چار ہو چکی ہے۔ ملک، دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی زد پر ہے۔ سیاست ایک عذاب بن چکی ہے کاش!

”مردے از غیب بروں آید و کارے بکند“

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء)

گنجینۂ معارف۔۔۔احساسِ زیاں ہے کہ نہیں!

زیرِ نظر شمارہ میں ایک مضمون بعنوان ''پاکستان میں نجی کتب خانوں کی حالتِ زار'' شریک اشاعت ہے اس تحریر نے ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل بین الاقوامی شہرت کے حامل ایک مصنف و مولف اور محقق و معلم ہیں۔ ان کی یہ تحریر کیا ہے ایک زوال آمادہ قوم کا نوحہ ہے جو اب خودکشی پر کمربستہ نظر آتی ہے۔ اس خودکشی کا اُسلوب و انداز کم و بیش وہی ہے جو خودکش دھماکوں کا ہے جن سے اس بدقسمت قوم کا جان چھڑانا سرِ دست ممکن نظر نہیں آتا کہ ملکی قیادت کا وجود عملاً عدم کا استعارہ بن چکا ہے۔

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا دل یورپ میں اپنے آباء کی کتابیں دیکھ کر 'سیپارہ' ہوتا تھا مگر ہم تو یہیں حکمت و دانش کے یہ خزانے ردّی کے مول فروخت کر کے چند ٹکوں کی خاطر اپنی ہوس زر کو پروان چڑھا رہے ہیں اور اپنے اس جہل بے خبری میں یہ نہیں جانتے کہ ہم خود اپنے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ خود تو بے بصر و بے بصیرت ہیں ہی آئندہ نسلوں کو بھی بینائی سے محروم کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ علم و حکمت کے شہ پاروں کو بیک نظر دیکھنے سے بھی محروم ہو جائیں۔ اپنی قومی شناخت کھو بیٹھیں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح صرف شکم پروری کو زندگی کا نصب العین بنالیں۔

بات ساری احساس زیاں کی ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر قوم ایک تن مردہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کیا آج ہمیں یہ احساس ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہم جس آزاد و خودمختار مملکت کے امین بنائے گئے اس نے ہمیں کس قدر عظیم الشان ورثہ عطا کیا جو علم و حکمت اور تہذیب و ثقافت کے خزینوں سے مالا مال تھا۔ ہمارے نظریۂ حیات کی جڑیں جن میں پیوست تھیں ہمیں دانش گاہیں۔ جامعات۔ کتب خانے اور تہذیب و ثقافت کے مراکز کیا کچھ نہ ملا۔ بے شک ہم نے ان میں اضافہ بھی کیا لیکن یہ سارا نظام ہماری غفلت، نااہلیت اور بے حسی کے باعث تیزی سے روبہ انحطاط ہوتا چلا گیا۔ کتابیں

رڈی میں بکنے لگیں سرقہ وخیانت کا بازار گرم ہوا تو ہمارے قومی نوادرات قیمتی مخطوطات سے وطن عزیز محروم ہوتا چلا گیا۔ درس گاہوں اور جامعات میں حصول علم نہیں بلکہ حصول روزگار کے لیے ڈگریوں کا کاروبار ہونے لگا۔ تعلیم کی مقدار نے تو چکا چوند پیدا کی لیکن اقدار کی پامالی نے ہمیں رسوا کر کے رکھ دیا۔

قیام پاکستان کے ۲۸ برس بعد پہلی بار ملک میں تاریخی دستاویزات (تحفظ اور برآمد کنٹرول) کا ایکٹ ۱۹۷۵ء نافذ ہوا لیکن گذشتہ برسوں میں سوائے دو ایک واقعاتِ دار و گیر کے نوادرات اور قیمتی دستاویزات وکتب بیرونی ممالک میں فروخت ہوتی رہیں۔ ہمارے ذاتی علم میں ہے کہ ہر چند صوبوں میں تحفظِ دستاویزات کے ادارے موجود تھے لیکن نہ اہل علم کو تحقیق کے مواقع میسر تھے اور نہ ان اداروں کے درمیان رابطہ کا کوئی نظام موجود تھا۔ البتہ مرکزی سطح پر ۱۹۵۱ء میں کراچی میں نظامتِ دستاویزات کا قیام عمل میں لایا گیا۔ لیکن یہ مرکزی تنظیم اسلام آباد منتقل ہوجانے کے بعد بھی بے عملی کا شکار رہی تا آنکہ صدر مملکت نے اُس وقت کے وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کی سربراہی میں اپریل ۱۹۸۱ء میں قومی آرکائیوز پر پالیسی تشکیل دینے کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی قائم کی جس کا ملک کے علمی حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا۔ اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار (روزنامہ مسلم مورخہ ۲ اپریل ۱۹۸۱ء) نے لکھا:

> ”قوم کی ضروریات میں یہ ضرورت انتہائی ناگزیر ہے کہ اُسے ایک ایسی صحت مند اور جامع پالیسی مہیا کی جائے جس کے تحت وہ اپنی قومی دولت کو اُس مرتبہ ومعیار کے مطابق قومی آرکائیوز کی شکل میں مجتمع ومحفوظ کر سکے اور پروان چڑھا سکے جسے قوم بجا طور پر اپنے لئے باعث فخر سمجھے“

تقریباً انھیں دنوں Mr.Morris Rieger نے جو انٹرنیشنل کونسل آف آرکائیوز کے صدر تھے اپنے ایک بیان میں ترقی پذیر ممالک میں علم وخبر کے ان ذخیروں کی زبوں حالی کی وجوہات پر روشنی ڈالی تو اہل علم کو محسوس ہوا کہ ان کا بیان حرف بہ حرف پاکستان پر صادق آیا ہے

یہ بیان بین الاقوامی کمیشن برائے فروغ قومی دستاویزات کے ماہانہ بلیٹن برائے جنوری ۱۹۸۱ء میں

شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

> ’’ میں نے گذشتہ ایک دھائی کے دوران یہ مشاہدہ کیا ہے کہ دنیا کے ابھرتے ہوئے خطوں اور اقوام میں قومی دستاویزات کے تحفظ و فروغ کے عمل میں مرکزی رکاوٹ خود اُن کی قومی انتظامیہ کی بے توجہی ہے۔ جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان اقوام بالخصوص ترقی پذیر ممالک کی سیاسی و انتظامی ہئیت مقتدرہ اس حقیقت سے نابلد ہے کہ قومی دستاویزات کا پختہ و با قاعدہ اور متحرک نظام اقوام کی تشکیل و تعمیر میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔‘‘

بلاشبہ پاکستان میں حکمرانی کے اُس عہد کو یہ کریڈٹ ملنا چاہیئے کہ علم وحکمت کے خزینوں کی داشت و پرداخت کے لیے مرکزی سطح پر مشاورتی کمیٹی (Consultative Committee) کا قیام عمل میں لایا گیا جو مشاہیر علم وتحقیق اور تمام صوبائی حکومتوں کے نمائندگان پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی نے ایک جامع رپورٹ بھی حکومت کو پیش کی جس کا آج کسی سطح پر بھی سراغ نہیں مل رہا البتہ اُس عہد کی یادگار اسلام آباد میں ’’نیشنل آرکائیوز آف پاکستان‘‘ کی ایک بلند و بالا محرابی عمارت ہے جسے بعض احوال آشنا حلقے ’’مزار علم‘‘ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ سال رواں (۲۰۱۲ء) کی تازہ ترین رپورٹ جو بین الاقوامی معروف ومعتبر ادارے ’ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل‘ نے جاری کی ہے اُس کے مطابق قانون کی حکمرانی کے حوالے سے دنیا کے ۹۷ ممالک کی صف میں پاکستان ’بدترین بدعنوان‘ ملک کی حیثیت سے ساتواں نمبر حاصل کر چکا ہے۔ جہاں یومیہ خیانت و بددیانتی (Corruption) کی شرح ۷ ارب اور سالانہ ۲۵۰ ارب روپے ہے۔ اس رجحان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں فروغ علم و ادب کتب خانوں کی داشت و پرداحت اور نوادراتِ تہذیب وثقافت کی شرح کیا ہو سکتی ہے۔ جو قومی تفاخر اور شناخت کے ضامن ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود قدیم و تاریخی دستاویزات کے محافظ خانے ہر صوبے میں موجود ہیں مگر نہایت غیر موثر۔ ان تنظیموں کے درمیان پیشہ ورانہ رابطہ کا کوئی با قاعدہ نظام نہیں حالانکہ ان اداروں کے زیر تحویل ایک عظیم الشان گنجینۂ معارف موجود ہے جن میں پنجاب آرکائیوز کو عظیم ترین کہا جا سکتا ہے بلکہ برصغیر میں دہلی کے بعد لاہور میں پنجاب آرکائیوز ہی کو سب سے بڑا ذخیرہ

دستاویزات قرار دیا گیا ہے۔ پنجاب سکریٹریٹ لائبریری میں جو صوبائی آرکائیوز کا حصہ ہے اسی ہزار (۸۰,۰۰۰) سے زیادہ کتب موجود ہیں۔ یہاں ۱۸۰۹ء تک کا تاریخی ریکارڈ موجود ہے جس میں وہ ریکارڈ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہلی ریذیڈنسی سے منتقل کیا گیا، خیبر پختون خواہ صوبے کا اس عہد کا متعلقہ تمام ریکارڈ جب وہ صوبہ پنجاب کا حصہ تھا، ۱۸۴۳ء میں انگریزوں کے زیر قبضہ آنے کے بعد صوبہ سندھ کا ریکارڈ، اس طرح بلوچستان کے قبائلی علاقوں پر انگیریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد کا تمام ریکارڈ لاہور منتقل کیا گیا، ریاست جموں و کشمیر افغانستان اور فارس (Persia) نیز مشرق وسطی کی ریاستوں کا سیاسی و تجارتی تعلقات پر مبنی قیمتی تاریخی اہمیت کا ریکارڈ اور وسط ایشیا کے ساتھ تجارت پر مبنی دستاویزات، نیپالی دستاویزات (۱۸۱۰ـ۱۸۴۶) ریاست جموں و کشمیر (۱۸۴۶ـ۱۸۸۸) اور ان سب کے علاوہ بھاولپور۔ پٹیالہ۔ نابھا اور چند ریاستوں کی اہم تاریخی دستاویزات، پنجاب آرکائیوز لائبریری میں پانچ ہزار سے زیادہ کتب سوانح، یادداشتوں اور سفرناموں پر مشتمل ہیں، نیز پنجاب بورڈ آف ریونیو لائبریری ساٹھ ہزار سے زیادہ کتب پر مشتمل ہے مگر یہ سب اب کس حال میں ہیں اس کا اندازہ شاید چشم اشکبار ہی کر سکے۔

ان سب میں اندوہ ناک ترین جو المیہ ہے اُس کا تعلق سابق ریاست بہاولپور سے ہے جس کا محافظ خانہ ڈھائی لاکھ فائلوں میں ابتک نہ جانے کتنے سرقہ و خیانت کے واقعات کا چشم دید گواہ ہے ۱۹۵۵ء میں صوبہ مغربی پاکستان کے قیام کے وقت دستاویزات کا جو انبوہ گراں لاہور منتقل کیا گیا تھا اُس کی پانچ لاکھ فائلیں آج کرم خوردگی و عدم توجہ کے سبب بربادی کے مراحل طے کر رہی ہیں۔ بہاولپور کے محافظ خانے کی شہرت تھی کہ یہاں ۱۸۷۰ء کے بعد سے قانون شریعہ، اوقاف، فتاویٰ، مذہبی امور اور محکمہ زکوٰۃ کی اہم دستاویزات کا ایک ذخیرہ تھا لیکن اب:

کس حال میں کہاں ہے یہ سرمایۂ علوم
اُن کی نظر میں ہے نہ ہماری نظر میں ہے

ڈاکٹر عقیل کے مضمون میں متعدد نجی کتب خانوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو یا تو شکست و ریخت کی نذر ہوئے یا ہو رہے ہیں۔ ہمارے علم میں بھی کچھ ایسے نجی کتب خانے ہیں شاید ان کی

طرف توجہ دلانے سے ان کی قسمت جاگ اُٹھے۔ لاہور میں سابق اٹارنی جنرل پاکستان چوہدری نذیر احمد، علامہ مشرقی، پروفیسر حمید احمد خاں، خلیل الرحمان داؤدی، محمد دین فوق، شورش کاشمیری، آقا بیدار بخت، گجرانوالہ میں مولوی نصیر الدین شاہ گردیزی، بہاولپور میں سید مخدوم جہانیاں بخاری (اوچ)، سید شمس الدین گیلانی (اوچ)، مخدوم الملک لائبیری (جمال دین والی) اور قصور میں خواجہ غلام محی الدین قصوری)

آخر میں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے نمائندہ (Dr. Frank B. Evans) کے اُس خطاب سے ایک مختصر اقتباس پیش کرنا مقصود ہے جو انھوں نے آٹھویں بین الاقوامی کانگریس برائے انتظام وانصرام دستاویزات سے کیا۔ یہی شاید ہماری قومی غیرت بیدار کرنے کا سبب بن جائے۔

> ''کسی بھی قوم کی تہذیبی حیثیت کا تعین اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دستاویزی ورثہ کو کس حد تک محفوظ رکھ سکتی ہے اور اُس سے استفادہ کر سکتی ہے۔''

(اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۲ء)

قندیلِ علم ۔۔۔ ظلمت و جہالت کے حصار میں

پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ و ارتقا کی جانب پہلا بامعنی اور موثر قدم اُس قت اٹھایا گیا جب ملک کے معروف و ممتاز ماہرین تعلیم پر مشتمل سترہ (۱۷) رکنی ایک ٹاسک فورس تشکیل دی گئی۔ جس نے پوری جاں کاہی کے ساتھ ملک میں تعلیم و تعلّم کے نظام کی بے جہتی اور زبوں حالی کا معروضی جائزہ لے کر اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں دور رس اصلاحات تجویز کیں۔ چنانچہ حکومت وقت نے سال ۲۰۰۲ء کے دوران ایک آرڈیننس کے نفاذ کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا ایک کمیشن (Higher Education Commission) قائم کیا اور وزیر اعظم کی براہِ راست نگرانی میں خودمختار ادارہ کی حیثیت سے وفاق اور صوبوں میں موجود تمام جامعات (Universities) کو ایک منضبط و مربوط نظام کار کے تحت کمیشن کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اُس وقت ترکی میں ایسے ہی ایک کمیشن کی مثال موجود تھی۔ خوش قسمتی سے ہمارے ادارہ کی بحیثیت چیرمین سربراہی کے لئے ڈاکٹر عطاالرحمٰن جیسی ماہر تعلیم، صاحب بصیرت اور مثالی متحرک شخصیت میسّر آ گئی جنھیں بیک وقت وفاقی وزیر کا منصب و اختیار بھی حاصل تھا۔ چانچہ دیکھتے ہی دیکھتے کمیشن نے اپنی کارکردگی کا سکّہ نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی جما دیا سال ۲۰۰۲ء سے سال ۲۰۰۸ء تک کا عرصہ سنہری دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کے دوران بین الاقوامی مالیاتی تعاون کرنے والی ایجنسیوں نے پورے اعتماد سے وسائل مہیا کیے۔ عالمی بینک اور یو۔ ایس۔ ایڈ نے بھرپور تعاون کیا۔ اس کے علاوہ برٹش کونسل۔ رائل سوسائٹی لندن اور یو۔ این کمیشن برائے سائنس۔ ٹیکنالوجی نے پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی کمیشن کو ترقی پذیر ممالک کے لیے نمونہ قرار دیا چنانچہ بنگلہ دیش اور سری لنکا میں بھی پاکستان کے نقشِ قدم پر چلنے کا جذبہ بیدار ہوا بلکہ ہندوستان تو اعلیٰ تعلیم کا ایک سُپر ہائر ایجوکیشن کمیشن کے قیام سے خطہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے متحرک ہو گیا۔

بدقسمتی سے مفاد پرست سیاسی اذہان اور علاقائیت گزیدہ سوچ رکھنے والے بصیرت باختہ

افراد کو ترقی اور سرفرازی کا یہ سفر ایک آنکھ نہیں بھایا چنانچہ ملک میں فکری و نظریاتی اتحاد کو جو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مرہون منت ہے پارہ پارہ کرنے کے لیے پہلا سفاکانہ وار آئین میں اٹھارویں ترمیم کے ذریعہ کیا گیا تاکہ آئندہ نسلوں کو علاقائی نظام و نصاب تعلیم کا زہر پلا کر قومی وحدت کے تصور تک کو معدوم کر کے رکھ دیا جائے۔ ابتدائی تعلیم کے شعبہ میں صوبائی حکومتوں کی کارستانی (کارکردگی کا لفظ موزوں نہیں) اس حد تک شرمناک ہے کہ تازہ ترین بین الاقوامی سطح کے جائزوں کے مطابق پاکستان اپنے بوسیدہ و شکستہ نظامِ تعلیم کے سبب دنیا کے دس بدترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۹ء سے ملک پرائیوٹ سکولوں کا ایک جنگل بن کر رہ گیا ہے۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم تجارت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس وقت ملک میں ۵۶ ہزار سے زیادہ پرائیوٹ سکول ہیں جو کُل سکولوں کا چالیس فیصد ہے۔ سال ۲۰۱۲ء کی اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں سکول سے محروم بچوں کی تعداد دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ۵۰ فیصد سرکاری اور ۲۵ فیصد پرائیوٹ سکولوں میں ٹائلٹ کی سہولتوں کا فقدان ہے۔ ۶ سے ۱۶ سال تک کے بچے جن کی شرح ۲۳ فیصد ہے۔ اسکول جانے کے تصوّر سے نا آشنا ہیں جب کہ بلوچستان میں یہ شرح ۷۸ فیصد کی خوفناک حد کو چھُو رہی ہے۔ حالانکہ اس صوبے کا تعلیمی میزانیہ تقریباً چوبیس ارب روپے ہے۔ قبل از پرائمری تعلیم سے محروم بچوں کی شرح پورے ملک میں ۶۳ فیصد ہے یہی نہیں بلکہ قومی وحدت پر اس سے زیادہ سفاکانہ وار اور کیا ہو سکتا ہے کہ تدریس کے لیے ملک بھر میں ۱۴۱ زبانوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ پشتو کی شرح ۲۷ فیصد، پنجابی ۱۹ فیصد، سندھی ۱۶ فیصد، بلوچی ۱۰ فیصد اور سرائیکی ۷ فیصد ہے۔ اب سوچیئے کہ ہم ایک قوم ہیں تو کیسے؟

اٹھارویں آئینی ترمیم کے نتیجہ میں اعلیٰ تعلیم کو سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک وفاقی ادارہ کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیمی کمیشن کو آئینی خودمختاری حاصل تھی اور اٹھارویں ترمیم کے باوجود کمیشن کی یہ حیثیت ہرگز متاثر نہیں ہوئی لیکن خیبر پختون خواہ صوبہ پہلے ہی اپنا اعلیٰ تعلیمی کمیشن بنا بیٹھا۔ پنجاب اور بلوچستان اس دوڑ میں شامل ہیں جب کہ سندھ اسمبلی ۱۹ فروری ۲۰۱۳ء کو صوبائی اعلیٰ تعلیمی کمیشن کا بل پاس کر چکی ہے۔ حالانکہ عدالت عظمیٰ پاکستان ڈاکٹر عطاالرحمٰن کی آئینی

درخواست پر اپنے فیصلہ مورخہ ۱۲ اپریل ۲۰۱۱ء میں اعلیٰ تعلیم کو وفاقی ذمہ داری قرار دے چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اور آئینی درخواست کے ذریعہ سندھ ہائی کورٹ میں ''سندھ اعلیٰ تعلیمی کمیشن ایکٹ ۲۰۱۳ء کو بھی چیلنج کر دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

رواں ۵ سالہ مدت اقتدار سے پہلے سال ۲۰۰۲ میں جو عام انتخابات منعقد کیے گئے تھے ان میں حصہ لینے کے لیے تعلیمی شرط کے طور پر امیداروں کا یونیورسٹی گریجویٹ ہونا قانوناً لازم قرار دیا گیا تھا چنانچہ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ہزاروں افراد نے جعلی ڈگریاں حاصل کیں ہر چند کہ رواں مدت کے دوران جو اب اختتام کو پہنچ چکی ہے قانون سازی کے ذریعہ اس شرط کو ختم کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جن نو ہزار افراد نے حصہ لیا تھا ان میں سے تین ہزار کی ڈگریاں جعلی تھیں۔ یہی لوگ جن کی موجودہ پارلمنٹ میں تعداد ۳۹۲ بتائی جاتی ہے اب ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے لیے کمر کسے بیٹھے ہیں حد یہ ہے کہ موجودہ وفاقی وزیر تعلیم کی ڈگری کو بھی لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا اور بعد ازآں کیمرج یونیورسٹی نے موصوف کی اے۔ لیول کی سند کے جعلی ہونے کی تصدیق کر دی جس کے بعد بیچولر لیول کی کسی بھی ڈگری کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس شرمناک صورت حال کے پیش نظر ملک کے باشعور محبّ وطن اور اہل علم حلقوں میں روز بروز اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ گزشتہ ڈھائی برسوں سے جعلی ڈگریاں موضوع بحث بنی ہوئی ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن جو اسناد کی تصدیق کا بااختیار واحد ادارہ ہے بے پناہ دباؤ میں آچکا ہے۔ اس طرح کہ:

☆ حکومتی پارٹی کی دو خاتون اراکین اسمبلی نے قائمہ کمیٹی میں ''اعلیٰ تعلیمی کمیشن ترمیمی بل ۲۰۱۲'' پیش کر دیا ہے جس پر ۲۳ جنوری ۲۰۱۳ء کو بحث بھی ہو چکی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کمیشن کو وزارت تعلیم کے ڈویژن کی حیثیت دے کر اُس کے ماتحت کر دیا جائے تا کہ خود مختاری کا خاتمہ ہو اور مالی و انتظامی اختیارات کم کیے جانے کے بعد سابقہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرح حکومت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ جائے۔ اس اقدام کو عدالتِ اعظمیٰ میں چیلنج کر دیا گیا ہے۔

☆ گذشتہ تین برسوں کے دوران وفاقی حکومت نے کمیشن کے فنڈز میں ۵۰ فیصد کی کمی کر دی ہے۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کے دور میں جو بجٹ چھ بلین تھا وہ ۲۰۰۸ء میں ہیئتِ مقتدرہ کی تبدیلی کے بعد ایک بلین کر دیا گیا تھا۔

☆ متعدد بار کوششیں کی جا چکی ہیں کہ کیبنٹ ڈویژن کے نوٹیفکیشن کے ذریعہ کمیشن کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے یا صوبوں کو منتقل کر دیا جائے۔ لیکن عدالت عظمی نے اس تجویز کو اٹھارویں آئینی ترمیم کے منافی قرار دے دیا ہے۔

☆ حالیہ برسوں میں اعلیٰ تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی پر متعدد حملے کے گئے۔ سب سے پہلے قومی کمیشن برائے بائیوٹیکنالوجی کو تباہ کیا گیا اور اس کے تمام پروگراموں کو ملک بھر سے ختم کر دیا گیا۔ پھر قومی کمیشن برائے نیوٹیکنالوجی کو بھی ختم کر دیا گیا۔

☆ وزیراعظم سکریٹریٹ کی جانب سے کمیشن کو تابع فرمان بنانے کی ایک نہایت عاقبت نااندیشانہ کوشش کی گئی تاکہ جعلی ڈگریوں کی تصدیق کی جا سکے۔ چنانچہ سکریٹری کی سطح کے عہدہ پر فائز ایک ریٹائرڈ آرمی میجر کو کمیشن کے چیف ایگزیکٹو کے عہدہ پر بیٹھا دیا گیا۔ خدا کا شکر کہ ایک بار پھر سپریم کورٹ نے اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔

☆ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ کمیشن کو وزارت تعلیم و تربیت کے ماتحت کر دیا جائے جسے عدالت عالیہ سندھ نے ناکام بنا دیا۔

اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے اکتوبر ۲۰۱۲ء تک پاکستانی جامعات کے طلباء کو ۸۱۴۲ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اسناد عطا کی ہیں۔ گذشتہ دس برسوں میں ۱۱۳۶۶ اسناد کو جعلی قرار دیا ہے اور دس لاکھ سے زیادہ اسناد کی تصدیق کی ہے کمیشن کے موجودہ چیرمین ڈاکٹر جاوید لغاری نے جنھوں نے پوری استقامت اور اخلاقی جرأت کے ساتھ کمیشن کو جاہل و بددیانت قوتوں کے تابع کر دینے کے ہر اقدام کی مزاحمت کی ہے کمیشن کے کردار کو مزید وسعت دینے اور انصاف و قانون کی برتری قائم رکھنے کے لیے یہ تجویز بھی

دی ہے کہ ۲۴ رکنی ایک ٹاسک فورس تشکیل دی جائے جو صوبوں اور وفاق کے نمائندگان پر مشتمل ہو ڈاکٹر لغاری کی سربراہی میں کمیشن نے بین الاقوامی سطح پر جو اعزاز و اعتماد حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کمیشن کے زیر اہتمام تمام اسلامی ممالک کی جامعات کے وائس چانسلرز اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے سربراہوں کا خصوصی تربیتی پروگرام زیرِ ترتیب ہے کمیشن اپنے سالانہ بجٹ سے ہر سال استحقاق کی بنیاد پر ملکی جامعات کو ۴۴ ملین روپے کی گرانٹ دیتا ہے چنانچہ ایسے تمام معاملات میں شفافیت کو یقینی بنا دو وفاقی سکریٹریوں اور چار صوبائی سکریٹریوں پر مشتمل ہے لیکن جن منفی قوتوں کی ریشہ روانیوں کا کمیشن کو سامنا ہے اُن میں صرف جعلی ڈگریوں کی تصدیق کا دباؤ ہی نہیں بلکہ جامعات کی ملکیت ہزاروں بلین روپوں کی مالیتی زمیں پر حریص و بدعنوان سیاست دانوں کی نگاہیں مرتکز ہیں اور وہ ہزاروں تعلیمی وظائف جو صرف میرٹ کی بنیاد پر دیئے جا سکتے ہیں اُن کو مقتدر شخصیتوں کے منظورِ نظر افراد کی دستبرد سے محفوظ کرنے کا جرأت مندانہ کام بھی شامل ہے، بہر حال ترمیمی بل کی تلوار بدستور کمیشن کے سر پر لٹکی ہوئی ہے ہر چند کہ اضطراب و تشویش کی ہمہ گیر فضا میں اربابِ حکومت نے چند ''طفل تسلیاں'' دینے کی زحمت فرمائی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس اقدام کے منفی مضمرات کا ذمہ دارانہ ادراک کیا جائے جو مندرجہ ذیل صورتوں میں منتج ہو سکتے ہیں۔

☆ ۷۵۰ ملین ڈالر کے بیرونی ڈونرز سے کیے ہوئے معاہدوں کی تنسیخ کا غالب امکان ''سندھ ہائر ایجوکیشن کمیشن'' کی تشکیل کے سبب پیدا ہو چکا ہے۔ ان میں ۳۰۰ ملین ڈالر کا معاہدہ عالمی بینک کے ساتھ ہوا تھا جو تین سالانہ برابر کی اقساط میں ادا ہونا تھا اور ۴۵۰ ملین ڈالر کا معاہدہ ڈونر اداروں سے کیا گیا تھا اُن میں یو۔ ایس۔ ایڈ اور برٹش کونسل کے علاوہ دیگر بیرونی ادارے اور جامعات شامل تھیں۔

☆ اعلیٰ تعلیمی کمیشن کی تقسیم یا اُس کی حیثیت (Status) میں تبدیلی اور اختیارات میں کمی کے نتیجہ میں بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند پاکستانی طلباء و طالبات کی تعلیمی اسناد کے تسلیم نہ کیے جانے کے شدید خدشات پیدا ہو چکے ہیں۔

☆ جو ادارے بیرون ملک پاکستانی طلباء وطالبات کو اعلیٰ تعلیمی وظائف دیتے ہیں جن میں منجملہ دیگر یو۔ ایس۔ ایڈ اور ورلڈ بینک شامل ہیں وہ حق بجانب ہونگے کہ معاہدہ کرنیوالے ادارے یعنی وفاقی اعلیٰ تعلیمی کمیشن میں بنیادی تبدیلیوں کے باعث وظائف منسوخ کر دیں۔

☆ مختلف شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کے ضمن میں از روئے معاہدہ ۱۲۷ملین ڈالر کی گرانٹ میں یو۔ ایس۔ ایڈ اعلیٰ تعلیمی کمیشن کا شراکت دار (Partner) ہے۔ چنانچہ کمیشن کی حیثیت میں تبدیلی آنے کے بعد یہ شراکت ختم ہو سکتی ہے۔

حکومت جانتی ہے کہ مجوزہ غیر آئینی وغیر قانونی بل کو جس پر ماہرین کی بھی ہرگز دو آراء نہیں ہیں پاکستان کی جامعات کے تمام وائس چانسلرز، فیکلٹی ایسوسی ایشنز اور متعدد پیشہ ورانہ تنظیمیں یکسر مسترد کر چکی ہیں اِن حالات میں روشنی کی واحد کرن وطنِ عزیز کی اعلیٰ عدلیہ ہے ہمیں یقین ہے کہ علم اور جہالت کے درمیان اس آویزش میں علم ہی کا علم سربلند رہے گا۔ (انشاءاللہ)

ہے اُفق سے ایک سنگِ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانندِ آئینہ بکھر جائے گی رات

(سالنامہ ۲۰۱۳ء)

تحریم وتکریم ۔۔ بنام ۔۔ تحقیر وتذلیل

مقدمہ بعنوان مندرجہ بالا بعدالت معزز قارئین پیش خدمت ہے جس میں درج ذیل دستاویزی شہادت پر انحصار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”ایوان صدر نے نومنتخب وزیر اعظم کی جانب سے حلف اردو میں لینے کی درخواست یہ عذر پیش کر کے مسترد کر دی کہ صدر زرداری قومی زبان اچھی طرح نہیں بول سکتے۔ باوثوق ذرائع کے مطابق نومنتخب وزیر اعظم نے ایوانِ صدر کو درخواست ارسال کی تھی کہ اُن کے عہدے کا حلف اردو زبان میں لیا جائے۔ تاہم ایوانِ صدر کی جانب سے اُنھیں بتایا گیا کہ ان کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کا حلف اردو میں نہیں لیا جا سکتا کیونکہ صدر زرداری اچھی طرح اردو نہیں بول سکتے۔“

(روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۶ جون ۲۰۱۳ء)

پاکستان کے ہر صوبائی دارالحکومت نیز راولپنڈی/اسلام آباد اور بیرونِ ملک سے شائع ہونیوالے اردو زبان کے ایک کثیرالاشاعت روزنامے کی اس خبر پر نہ تو تادمِ تحریر کسی بھی نوعیت کے سرکاری ردِعمل کا اظہار کیا گیا ہے اور نہ تردید ہی کی گئی ہے اس لیے اِس خبر کے معتبر و مصدقہ ہونے میں قطعاً کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال اس دستاویزی شہادت نے چند منطقی سوالات کو جنم دیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ بھی ہیں اور مملکت کے اعلیٰ ترین منصب کی آئینی حیثیت کو داغدار کرنے کے مترادف بھی۔ دنیا بھر میں کسی بھی مملکت کا آئین ایک دستورِ اساسی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لیے تحریم وتکریم کا مستوجب سمجھا جاتا ہے اور اقتدارِ اعلیٰ۔ قومی یکجہتی اور وفاق کے استحکام کا ضامن بھی۔ سربراہِ مملکت آئین کے اِن اوصاف کی علامت ہوتا ہے چنانچہ اس تناظر میں اُٹھنے والے درجِ ذیل سوالات نہایت اہم ہیں۔

۱۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۵ کے مطابق مملکت سے وفاداری اور آئین و قانون کی اطاعت مملکت کے ہر شہری کا بنیادی فرض ہے۔ صدر مملکت کو اس بنیادی فرض کی ادائیگی سے کوئی استثنیٰ حاصل نہیں۔

۲۔ ۱۹۷۳ء کے رواں آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ کے مطابق اردو پاکستان کی قومی زبان ہے (عملاً نفاذ کے لیے انتظامی اقدامات کرنے کے لیے آئین میں پندرہ سال کی مقررہ حد ۱۹۸۵ء میں گزر چکی ہے مزید دس سال کا اضافہ بھی ۱۹۹۵ء میں اختتام پذیر ہوئے اب تک ۱۸ برس گزر چکے ہیں) لہٰذا اس آرٹیکل کے منافی کوئی بھی اقدام قومی زبان کی تحقیر و تذلیل کے ساتھ ساتھ آئین شکنی قرار پاتا ہے اور قابل مواخذہ ہے خاص طور پر جب کہ اس کا ارتکاب صدرِ مملکت کی سطح پر ہو۔۔۔۔ ''چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی''

۳۔ آئین کے آرٹیکل ۴۱ کے مطابق ''صدر سربراہ مملکت ہوگا اور جمہوریہ کی یکجہتی کی نمائندگی کرنے کا پابند ہوگا'' اس تناظر میں صدر کا قومی زبان میں حلف لینے سے دوٹوک انکار اور ایک غیر ملکی زبان میں حلف لینا نہ صرف قومی یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہے بلکہ آئین شکنی کے زمرے میں بھی آتا ہے اور قابل مواخذہ ہے۔

۴۔ آئین کے آرٹیکل ۴۷ کے تحت آئین شکنی یا عملِ ناروا (Mis.conduct) کے الزام پر صدر کے خلاف تعزیری کاروائی کر کے اُس کے منصب سے برطرف کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ آئین کے آرٹیکل ۴۲ اور تیسرے شیڈول میں دیئے گئے صدر کے منصب سنبھالنے سے پہلے اُٹھائے جانے والے حلف میں درج ذیل مشمولات، منجملہ دیگر، قابل غور ہیں۔

(الف) ''یہ کہ میں مسلمان ہوں اور قادر مطلق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قرآن حکیم کے آسمانی صحیفۂ آخر ہونے، حضرت محمدؐ کے پیغمبر آخر الزمان ہونے نیز قرآن وسنت کی تمام تعلیمات ومقتضیات پر ایمان رکھتا ہوں''

(ب) ''یہ کہ بحیثیت صدر اپنے فرائض منصبی دیانتداری، وفاداری، اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اسلامی جمہوریہ کے آئین وقانون کے مطابق نیز پاکستان کے اقتدار اعلیٰ۔ سالمیت۔ استحکام۔ بہبود اور خوشحالی کے مفاد میں انجام دونگا

(ج) یہ کہ میں اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے آئین کی برقراری۔ تحفظ اور دفاع کو یقینی بناؤں گا

مزید توجہ طلب امر یہ ہے کہ آئین کے آرٹیکل ۱۷۸ اور ۱۹۴ کے مطابق تیسرے شیڈول میں چیف جسٹس آف پاکستان۔ جج صاحبان عدالت عظمیٰ۔ چیف جسٹس اور جج صاحبان عدالت ہائے عالیہ کے حلف کے متن میں، منجملہ دیگر، وہی الفاظ شامل ہیں جو صدر کے متن میں بھی موجود ہیں یعنی

''یہ کہ میں اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے آئین کی برقراری تحفظ اور دفاع کو یقینی بناؤنگا''

بہ الفاظِ دیگر قومی زبان سے متعلق آرٹیکل ۲۵۱ کے ضمن میں چیف جسٹس اور دیگر جج صاحبان عدالت ہائے عالیہ وعظمیٰ کے فرائض منصبی بھی وہی ہیں جو صدر مملکت کے ہیں یعنی آئین شکنی کا بروقت نوٹس لینا چیف جسٹس آف پاکستان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

ہم نے ایک دفعہ نہیں متعدد بار صدرِ محترم کو الیکٹرانک میڈیا پر اردو، سندھی اور انگریزی زبان میں گفتگو یا تقریر کرتے دیکھا بھی ہے اور سُنا بھی۔ ہم نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ موصوف کی اردو ماشاء اللہ اُن کی انگریزی سے بہر حال بہتر ہے کہ یہ اُن کی اپنی قومی زبان ہے جس کے عملاً استعمال کیے بغیر بحیثیت صدر پاکستان وہ تین چوتھائی سے بھی زیادہ اپنے ہم وطنوں سے براہ راست رابطہ میں نہیں رہ سکتے جب کہ ان کے آئینی مرتبہ ومقام کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی قومی زبان اور تہذیب وثقافت کے سیاق وسباق میں جس میں لباس بھی شامل ہے ایک غیر ملکی دکھائی نہ دیں اور

نہ کسی مخصوص خطّے کے نمائندہ۔ جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے ملک کی آٹھارہ کروڑ آبادی میں بمشکل چار فیصد افراد یہ زبان بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ بانی پاکستان حضرت قائد اعظمؒ کا تعلق بھی صوبۂ سندھ سے تھا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد اُن کا یہ ادراک پختہ ہو چکا تھا کہ صرف اردو زبان ہی برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے جو قرآن وسنت کے حوالے سے بیش بہا خزانوں کی امین اور اسلامی روایات کا گنج گراں مایہ ہے۔ صدرِ محترم کے مطالعہ میں یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور آئی ہوگی کہ بھارت میں آزادی کے بعد جب مرکزی اسمبلی میں رائے شماری ہوئی تو اردو اور ہندی کے لیے ووٹ برابر ڈالے گئے چنانچہ اسپیکر نے اپنا فیصلہ کن ووٹ استعمال کر کے ہندی کو بھارت کی قومی زبان بننے کا موقع فراہم کیا چنانچہ آج بھی ایک زندہ و متحرک زبان کی حیثیت سے دنیا کے ساڑھے چھ ارب نفوس کے درمیاں کم وبیش ڈیڑھ ارب افراد اردو زبان بول اور سمجھ سکتے ہیں جسے 'یونیسکو' نے 'ہندوستانی' کا نام دے کر اردو کے اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل ہونے کی راہ مسدود کی ہوئی ہے حالانکہ ہندوستان سمیت ہندوستانی نام کی زباں دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

قائد اعظمؒ کی اردو سے والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جب سر فیروز خاں نون نے انگریزی میں تقریر شروع کی تو ہر طرف سے اردو۔ اردو کا شور اُٹھا تو وہ اردو میں خطاب کرنے پر مجبور ہوئے لیکن چند منٹ بعد ہی پھر انگریزی میں بولنا شروع کیا۔ اردو کے لیے دوبارہ شور ہونے پر فرمایا کہ مسٹر جناح بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ قائدِ اعظم سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کرسی صدارت سے اُٹھ کر یہ اعلان فرمایا کہ ''فیروز خاں نون نے میرے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی ہے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی'' آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ریکارڈ اور ''قائد اعظم پیپرز'' جواب پاکستان آرکائیوز میں محفوظ کر لیے گئے ہیں گواہ ہیں کہ قائد اعظم نے اپنی اس تقریر کے اختتام پر عظیم فارسی شاعر فردوسی کا یہ شعر بھی پڑھا:

''اگر صلح خواہی نہ خواہیم جنگ   وگر جنگ جوئی نہ یابی درنگ''

اشارہ انگریز کی منافقانہ سیاست کی طرف تھا۔

''قومی زبان اچھی طرح نہ بول سکنے'' کی عذر خواہی پر ہم صدرِ گرامی کی توجہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی طرف دلانا چاہیں گے جو اُن کے مرحوم سسر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی بصیرت کے نتیجہ میں قوم کے مکمل اتفاق رائے کا نادر شاہکار ہے اور جس کے نتیجہ میں اردو کو سرکاری زبان کے منصب پر فائز کرنے کے لیے سرکاری ادارے بشمول 'مقتدرہ قومی زبان' قائم کیے گئے۔ جنھوں نے تکنیکی اعتبار سے ہماری قومی زبان کو جو اس وقت عالمی زبانوں میں سر برآوردہ حیثیت کی حامل ہے اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں قومی حمیت اور ضمیر کی آواز پر جاری کردہ ایک ہی حکم پر اُردو کا بطور سرکاری زبان فوری نفاذ عمل میں آ سکتا ہے۔ مقتدرہ کی جانب سے معتبر تحقیق شائع ہو جانے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اردو کی لسانی ہمہ گیریت کی تہہ میں پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کی جڑیں پیوست ہیں اور ان سب کا یکساں رسم الخط قومی اتحاد و سالمیت کا بھی ضامن ہے۔

ان تمام بدیہی حقائق کے باوجود ہمارے ملک کے سب سے زیادہ آبادی والے صوبے میں انگریزی زبان کو پرائمری سطح ہی سے لازمی زبان قرار دے کر نئی نسل کو بھی ذہنی غلامی میں مبتلا کر دینے کی عاقبت نا اندیشانہ کوشش کی گئی ہے ورنہ دنیا مین کہیں ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک نے اپنی قومی زبان کو پس پشت ڈال کر ترقی کی منازل طے کی ہوں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکی قیادت نے اپنی فاتحانہ ترنگ میں آ کر شہنشاہِ جاپان سے پوچھا تھا کہ ''مانگو کیا مانگتے ہو'' تو مُحبِ وطن شہنشاہ نے جواب دیا۔ ''اپنے ملک میں اپنی زبان میں تعلیم'' چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جاپان۔ چین۔ جرمنی۔ فرانس۔ روس۔ کوریا نیز دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک کو قومی زبان میں تعلیم ہی نے ہمدوشِ ثریا کر دکھایا۔ حال ہی میں عدالت عظمٰی نے ایک مستحسن فیصلہ یہ کیا ہے کہ تمام عدالتی فیصلوں کا اردو ترجمہ ویب سائٹ میں شامل کر کے اُسے عامتہ الناس کی دسترس میں دیدیا جائے لیکن یہ اقدام پھر بھی اُس وقت تک ناکافی رہے گا جب تک عدلیہ ہر سطح پر اردو میں فیصلے صادر کرنا نہ شروع کر دے یہ ایک آئینی ذمہ داری ہے جس کا صحیح ادراک چیف جسٹس آف پاکستان سے

زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ عدالتوں میں انگریزی زبان کی حکمرانی عوام الناس کے ساتھ ایک ظالمانہ مذاق ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آزادی کے بعد سے آج تک ۶۶ سال کی طویل و صبر آزما مدت گزر جانے کے باوجود ہمارا عدالتی نظام غیر ملکی حکمرانوں کے چھوڑے ہوئے نظام سے فی الفور آزادی حاصل نہ کرلے کیونکہ خود ایک امریکی ماہر قانون ڈاکٹر فریڈرک جو کینڈی اسکول آف گورنمنٹ اور یونیورسٹی آف ورجینیا میں پروفیسر کے منصب پر فائز رہا ہے اُس کی تمام تحریروں کا مرکز و محور یہی ہے کہ قانون اور صرف قانون ہی قومی اقتدار اعلیٰ کی علامت ہوتا ہے۔

قارئین گرامی! اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ جس نے حالیہ چند برسوں میں سماجی۔ اقتصادی اور انتظامی شعبوں میں شفاف انصاف مہیا کر کے تاریخ رقم کی ہے اپنی اولین آئینی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے قومی زبان کو ملک کی سرکاری و دفتری زبان قرار دے کر قوم کا سر فخر سے بلند کر دے اور جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ملک کی اعلیٰ ترین آئینی سطح پر آرٹیکل ۲۵۱ کی جس طرح تحقیر و تذلیل کی گئی ہے اُس کا فوری نوٹس لیا جائے تا کہ آئین شکنی کی آئندہ کوئی جرأت نہ کر سکے۔ اس مبارک اقدام کے لیے حالات نہایت سازگار ہیں کہ گزشتہ جون کے آخری ہفتہ میں عدالت عالیہ لاہور اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی ایک آئینی درخواست سماعت کے لیے منظور کر چکی ہے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو نوٹس بھی جاری کر دیئے گئے ہیں علاوہ ازیں ملک کے معروف قانون داں جناب محمد اسمٰعیل قریشی کی آئینی درخواست بھی کئی برسوں سے اس موضوع پر معرض التوا میں چلی آ رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری باصلاحیت انصاف پسند اور محبِّ وطن عدلیہ انصاف میں مزید تاخیر کا الزام اپنے سر نہیں لے گی۔

(جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۳ء)

مشاہیرِ ادب اور قارئین کے مراسلات سے اقتباسات

۱۔ ڈاکٹر وفا راشدی۔ کراچی

یہ ''صحیفۂ انوار'' صوری و معنوی دونوں اعتبار سے پُر مغز اور باوقار ہے۔ اداریہ میں آج کی صورت حال کے متعدد پہلوؤں کا جامع و مانع تجزیہ نہایت فکر و بصیرت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسلام اور تاریخ اسلام سے بے توجہی و عدم آگہی معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ اور علم و فکر سے دوری کا اصل سبب ہے۔ (اپریل۔ جون ۲۰۰۱ء)

۲۔ ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور

ادبی پرچہ اس کے مدیر کے ادبی نظریات اور تصورات ہی کا نقیب نہیں ہوتا بلکہ اس کے اخلاقیات کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ ''الاقرباء (۴) کا اداریہ ''مافیا'' میں آپ نے ادب پر جس ''کینسر'' کے حملے کا ذکر لگی لپٹی رکھے بغیر کیا وہ آپ کے ادبی اور اخلاقی نقطۂ نظر کی نشان دہی کرتا اور بے شمار ایسے لوگوں کی ترجمانی بھی کرتا ہے جو اس مافیا کا شکار ہیں۔ بعض تملق پرست حاشیہ نشینوں نے فیض احمد فیض کے انداز و اسلوب پر شب خون مارنے کی منافقانہ جسارت کی لیکن بقول کسے ''وہ زندگی بھر کوشش کے باوجود سگریٹ سے خاک جھٹکنے کا بھی فیض جیسا سلیقہ نہ اپنا سکے'' آپ نے تو اس تملق پرست کا نام نہیں لیا لیکن خامہ بگوش اور ساقی فاروقی اس کا نام لے کر متذکرہ سب باتیں بے نقاب کر چکے ہیں اور ادبی معاشرے کی اس کے بارے میں یہی رائے ہے جو آپ نے ظاہر کی ہے۔ آپ کا تجزیہ سو فیصد درست ہے کہ:

> ''ان پست قامتوں نے اپنا قد کاٹھ بڑھانے کے لیے سیاسی بیساکھیوں کا ضمیر فروشانہ استعمال کیا اور میڈیا کے استحصال کے ہنر میں خود کو طاق بنالیا۔ یہ جب کبھی خود پر گھیرا تنگ ہوتا دیکھتے تو وطن سے فرار اختیار کرتے اور دیار غیر میں سیاسی پناہیں مانگتے۔ یہی نہیں کہ خود کو باغیانہ شاعری کا نقیب بنا کر پیش کرتے بلکہ دشمن ملک کے سامعین و ناظرین سے وطن

مخالف ہرزہ سرائیوں پر داد و تحسین حاصل کرتے حالانکہ افلاس فکر و فن کے مارے ہوئے یہ دریوزہ گر نام نہاد شاعر سطحی جذباتیت سے بڑھ کر نوجوان نسل کو کچھ نہیں دے سکے۔‘‘

آپ کا یہ جرأت مندانہ اداریہ سیاست، صحافت اور ادب کا ایک مکروہ اور قبیح امتزاج پیدا کرنے والے مافیا کے خلاف ایک مؤثر احتجاج کی آواز ہے۔ (شمارہ ۲۔۲۰۰۵ء)

(۲) ’’الاقرباء‘‘۔ سالنامہ ۲۰۰۵ء موصول ہوا۔ میں نے سب سے پہلے آپ کا اداریہ ’’ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا‘‘ پڑھا۔ اور اس اداریئے کے تناظر میں وہ تمام ’’خبریں‘‘ بھی ذہن میں کہرام بپا کر گئیں جن میں ایک مخصوص ادبی شخصیت کو ماورائے قانون فائدہ حاصل کرنے کے لیے قانون کو پامال کیا گیا۔ آپ نے درست لکھا ہے کہ

’’حرص و ہوس کا یہ سفاکانہ انداز کسی بھی حقیقی فنکار یا اہل قلم کے شایان شان نہیں کیونکہ قلم یا فن تو صداقتوں کا امین ہوتا ہے۔‘‘ (شمارہ ۲۔۲۰۰۵ء)

(۳) ’’الاقرباء‘‘ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اداریہ میں ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ معاشرے کے درست ہونے کے آثار تو نظر نہیں آئے تاہم غنیمت نظر آتا ہے کہ آپ بعض قبیح برائیوں کی نشاندہی کر دیتے ہیں اور اگلے پرچے میں پڑھنے اور لکھنے والوں کا رد عمل بھی چھپ جاتا ہے۔ (شمارہ ۲۔۲۰۰۶ء)

(۴) محترم منصور عاقل صاحب! آپ نے نظام تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات پر اداریہ بڑی دردمندی سے لکھا ہے۔ میں آپ کے اس کرب میں شامل ہوں کہ آج کے حکمرانوں نے بانیٔ پاکستان کے طے کیے ہوئے نظام تعلیم کا سہ نکاتی منشور یکسر پس پشت ڈال دیا۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ہمیں ایسے نظام کی ضرورت ہے جو اوّل پاکستان کے ذہنی و فطری میلانات کا عکاس ہو۔ دوم: ہماری تہذیب اور تاریخ سے ہم آہنگ ہو۔ سوم: جدید اور ارتقائی عوامل سے مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اب اکیسویں صدی میں اس منشور کو مسترد کر کے مشرق کے مے کدوں کو مغرب کے مے کدوں سے مشروب فراہم کیا جا رہا ہے۔ اور اپنے قومی تشخص کو زائل کرنے کے لیے اس مشروب کو پینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ انگریزی کی تعلیم پرائمری کے

پہلے درجے سے شروع ہوگئی ہے لیکن عربی اور فارسی کو اختیاری درجہ بھی حاصل نہیں رہا ہے۔
(شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

(۵) ''فیض میزانِ عصر'' میں بظاہر سالنامہ الاقرباء ۲۰۱۰ء کا اداریہ ہے لیکن میں اسے فیض کی شاعری اور شخصیت پر ایک بھرپور مقالے کا درجہ دیتا ہوں۔ خوبی کی بات یہ کہ اس اداریے کے ایک ایک لفظ سے آپ کی ''فیض پسندی'' عیاں ہوتی ہے لیکن جانبدارانہ رویّہ کہیں محسوس نہیں ہوتا۔ کفایت لفظی سے لکھے گئے اس جامع مقالے (اداریے) کے لیے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بالخصوص اس لیے کہ اس مقالے کے بین السطور آپ کی شخصیت کے نقوش بھی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں ایک روشن زاویہ آپ کی عالی ظرفی ہے جس کی کرنیں ''الاقرباء'' کے ہر شمارے میں پھیلی نظر آتی ہیں۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

(۶) میں نے آپ کا اداریہ ''ذریعۂ تعلیم اور قومی تشخص'' متعدد مرتبہ پڑھا۔ پاکستان کا کوئی شخص بھی آپ کے اس بنیادی نکتے سے غیر متفق نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے گزشتہ ساٹھ سے زائد برسوں کے دوران ایک مستحکم اور غیر منقسم قومیت کا اجتماعی شعور بیدار نہیں ہوا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملک میں تعلیم کو اور بالخصوص ذریعۂ تعلیم کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ایک نظریاتی مملکت میں سیاسی قیادت کی اوّلین ترجیح ہونا چاہیے تھی''۔ (سالنامہ ۔ ۲۰۱۱ء)

(۷) آپ کے اداریے قومی دردمندی کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور مثبت تعمیری زاویۂ نظر کو سامنے لاتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں آپ نے ''پاکستان میں تعلیم و تحقیق کی شکست و ریخت'' پر اداریہ لکھا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے کمیشن کو سرکاری طور پر ''سبوتاژ'' کرنے کی داستان سنائی ہے کہ

> ''سیاسی قیادت کی تبدیلی کے ساتھ ہی یہ ادارہ (اعلیٰ تعلیم کا کمیشن۔ ایچ، ای، سی) مجلس قانون ساز کے ان اراکین کی نظروں میں کھٹکنے لگا جن کی جعلی ڈگریوں کی تصدیق سے اس ادارے نے معذرت کر لی تھی۔ جس کے نتیجے میں پچپن ارکان پارلیمان کی ڈگریاں جعلی قرار پائیں اور دو سو پچاس مشکوک جن میں وزرائے کرام بھی شامل تھے''۔

(شمارہ ۴۔ ۲۰۱۱ء)

۳۔ ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی۔ حیدرآباد (سندھ)

الاقرباء کا تازہ شمارہ ملا شکریہ۔ خوب بہت خوب اداریہ میں آپ نے اردو کے مخالفوں اور منافقوں کو آئینے میں ان کی شکلیں دکھائی ہیں شاید ان کی غیرت جاگ جائے زندہ اور باغیرت قومیں اپنی قومی روایات کی پاسداری کرتی ہیں اس میں نفسیات کا ٹیڑھا ہونا بھی ایک عنصر ہے قریب قریب سو سال کی ذلیل ترین غلامی نے سوچنے کا انداز اور طرز معاشرت بدل دی اب سوچنے کا معیار یہ رہ گیا ہے کہ زبان، خیال اور طرز معاشرت مغربی نہیں ہے تو یہ جہالت کی زندگی ہے۔ بااختیار حاکم جمہوریت کے نام پر جبر یہ ایمان رکھتے ہیں تاریخ شاہد ہے وہ منافقوں کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ عرصے سے چل رہا ہے۔ ذہنی غلامی اور منافقانہ روی عروج پر ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۷ء)

۲۔ آپ نے اداریہ نہیں مکمل مقالہ لکھا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی علمی ادبی حیثیت ان کے فلسفیانہ خیالات اور ان کی گراں قدر تخلیقات کی خاصی تفصیل دی ہے۔ ان کا مقام ادب میں متعین کیا ہے۔ یہ آپ کی طرف سے خراجِ تحسین کے مترادف ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۸ء)

۴۔ پروفیسر ڈاکٹر خلیل طُوق اُر۔ (صدر شعبہ اردو۔ استنبول یونیورسٹی (ترکی)

جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء کے شمارے میں موجود اداریہ ''زبانوں کا بین الاقوامی سال'' واقعتاً بڑے عالمانہ انداز میں تحریر شدہ بے حد پُر اثر نگارش ہے جس میں آج کل کی دنیا میں انگریزی کی بالادستی کا جو ناٹک کرتے ہیں اور دنیا کی دوسری زبانوں کو پیچھے دھکیل کر بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر علاقائی تہذیبوں کے خاتمہ کی جو در پردہ کوشش کی جاتی ہے وہ سب منظر عام پر لایا گیا ہے۔ (شمارہ ۱ ۲۰۰۹ء)

۲۔ الاقرباء کا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء موصول ہوا۔ اس شمارہ کے اداریہ کو پڑھا اور پڑھتے ہی مجھے بہت افسوس ہوا اور سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ انٹرویو دیتے ہوئے میرے ذہن سے کبھی بھی یہ بات نہیں گزری تھی کہ میری کسی بات کی وجہ سے میرے پاکستانی بھائیوں کو شرمندہ ہو کر دکھ بھی اُٹھانا پڑے گا۔ کبھی بھی میں نے نہیں چاہا تھا اور نہ ہی میں یہ چاہوں گا

کہ میرے کسی بھی پاکستانی بھائی کو میری وجہ سے شرمندگی محسوس ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا کبھی بھی ارادہ یہ نہیں تھا کہ پاکستانی وزارت خارجہ کے عہدہ دار یا عملے کی کسی وجہ سے نکتہ چینی کروں۔ بس بات یہ تھی کہ ایک بھائی کے دل میں سالوں سے پکتا ہوا لاوا تھا اُس کا کچھ حصہ بادل نخواستہ یا بہ الفاظ دیگر غیر اختیاری طور پر باہر نکل آیا۔ شاید گزرتے ہوئے سالوں کے بعد میرے ساتھ یہ ہوا کہ آج کل میرے دل میں جو بات ہوتی ہے اب میں اُسے چھپا نہیں پاتا۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ (سالنامہ ۔۲۰۱۲ء)

۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ لاہور

''الاقرباء'' سالنامہ ۲۰۰۹ء ملا۔ اداریہ نے غیر متوقع مسرت دی۔ آپ نے میرے حوالے سے جناب عطاالحق قاسمی کے کالم کا اقتباس درج کر کے جو عزت افزائی کی اس کے لیے ممنون ہوں۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۶۔ افتخار عارف۔ اسلام آباد

سہ ماہی ''الاقرباء'' کا سالنامہ ۲۰۱۰ء موصول ہوا۔ یاد آوری کا احسان مند ہوں۔ فیض صاحب پر آپ کا پُر مغز اور فکر انگیز اداریہ یقیناً پڑھا جائے گا اور اہل علم اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ میں تو ہمیشہ سے آپ کے وسعتِ مطالعہ کا قائل ہوں۔ اس اداریے میں بھی جس طرح آپ نے فیض کی زندگی اور شخصیت کا احاطہ کیا ہے وہ آپ کی جامعیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اداریے کے آخر میں یار عزیز پروفیسر شعیب ہاشمی کی تازہ تالیف ''آج کے نام'' کا ذکر کر کے آپ نے میرے دعوے کی تصدیق کی ہے کہ آپ انگریزی اور اردو میں چھپنے والی اہم کتابوں کی طرف سے غافل نہیں رہتے ہیں۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ کراچی

'الاقرباء کا تازہ شمارہ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء موصول ہوا۔ سارے مندرجات کا تنوع، کشش اور افادیت سب اپنی جگہ لیکن آپ کے اداریے نے اس کے ایک ایک لفظ نے، قلب ونظر کو اپنی گرفت میں ایسے سمیٹ لیا کہ اب اسی کے سحر میں ہوں اور یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ باقی سب تحریریں

پڑھتا رہوں گا۔ آپ کے اداریے سے پتا چلا کہ سپریم کورٹ نے ۱۲ جولائی کو اپنا ایک اہم فیصلہ قومی زبان میں تحریر کیا۔ یہ ایک بڑی خبر تھی لیکن مجھے یہ آپ کے اداریے سے معلوم ہوئی۔ میرے پاس دو نام نہاد قومی اور بڑے اخبار آتے ہیں اور ٹی وی کے کئی چینیلز پر خبریں دیکھتا ہوں مگر کسی جگہ کسی نے اس اہم خبر کو خود شاید قابل تحسین نہ سمجھا ہو گا تو وہ اپنے ایسے کسی احساس میں ہم وطنوں کو کیا شریک کرتے ! مقتدرہ قومی زبان کو تو اس حوالے سے بہت کچھ کرنے لکھنے کا موقع تھا اور اس واقعے کے بعد اس کے ''ترجمان'' کے دو شمارے منظر عام پر بھی آئے لیکن جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!

بہر حال جناب میں مبارکباد پیش کرتا ہوں آپ کے جذبات و احساسات اور ان کے اظہار پر اور اس امر پر کہ آپ نے قومی زبان کے تعلق سے قوم کی اکثریت کے احساس دردمندی کو اپنے اداریے میں پیش کیا۔ کسی اور کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ (شمارہ ۴ ۔۲۰۱۲ء)

۲۔ ای میل کے توسط سے ''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ (جولائی۔ دسمبر ۲۰۱۲ء) دیکھا اور نظریں بس آپ کے اداریے پر جم گئیں۔ آپ کے تحریر کردہ اداریے اپنی افکر انگیزی کے سبب بالعموم میری توجہ جذب کر لیتے ہیں۔ ایسے دیگر تمام رسائل کی طرح ادب آپ کے رسالے کا حاوی موضوع ہوتا ہے لیکن یہ ادب ہماری معاشرت، تہذیب، سیاست اور تاریخ سے الگ کب ہوتا ہے، جب عموماً رسائل کے اداریے صرف ادب اور ادبی مباحث اور مسائل کے گرد اپنا تانا بانا بنتے ہیں۔ ہماری معاشرت، سیاست اور تہذیب جن مسائل سے دوچار ہے، ان کی طرف مدیروں کی نظر کم ہی جاتی ہے۔ آپ کا پچھلا اداریہ قومی زبان کے تعلق سے بڑا حوصلہ افزا تھا۔ اس بار میری جس تحریر ''پاکستان میں ذاتی کتب خانوں کا حال زار'' کے حوالے سے یہ اداریہ آپ نے تحریر کیا ہے یہ بھی بے حد فکر انگیز اور دردمندانہ ہے اور ہم سب کو سوچنے اور کچھ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ فوری دردمندی اور فکر انگیزی آپ کے اداریے سے ظاہر ہوئی ہے اور اپنے قریبی جن مزید ذاتی کتب خانوں کے مستقبل کی جانب آپ نے تشویش کا اظہار کیا ہے وہ ہماری اور ہم سب کی توجہ چاہتی ہے۔ ارباب اختیار کو ان معاملات سے کوئی غرض نہیں۔ (سالنامہ ۲۰۱۳ء)

۸۔ امین راحت چغتائی۔ راولپنڈی

”۲۰۰۸ء زبانوں کا بین الاقوامی سال“ ایک فکر انگیز اور بروقت اداریہ زبان و بیان کے حسن سے آراستہ، دلائل کی شائستگی اور تہذیب جذبات کی عمدہ مثال۔ آیئے ہم سب اندرون و بیرون ملک اردو زبان سے محبت رکھنے والے افراد ایک بین الاقوامی تحریک کی صورت میں یونیسکو سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے ریکارڈ میں تصحیح کر کے ”ہندوستانی“ کی جگہ ”اردو“ زبان کا اندراج کرے۔ بلاشبہ ”ہندوستانی“ نام کی کوئی زبان، بھارت سمیت دنیا کے کسی خطے میں نہیں پائی جاتی۔ یونیسکو کا اندارج صحیح ہونے سے غیر منقسم ہندوستان کا وہ تعصب اور کم اندیشی کا رویہ بھی دور ہو جائے گا جس کے سائے اب تک اُردو زبان پر پڑ رہے ہیں۔ آپ کو شرح صدر کے ساتھ خراج تحسین پیش کرنا یوں بھی ضروری ہے کہ آپ برصغیر کے کسی مجلّے کے پہلے مدیر و ادیب ہیں جنہوں نے اردو کے قارئین اور ارباب فکر و دانش کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف مبذول کرائی ہے۔

(شمارہ ۲ ۲۰۰۸ء)

۲۔ آپ کا اداریہ ”فکر اقبال کی عصری معنویت“ حسب معمول آپ کے گہرے مطالعے اور منفرد طرز احساس کا حامل ہے۔ اداریے کے دو نکات بلاشبہ اہم ہیں۔ ایک تو فکر اقبال میں اجتہاد کی اہمیت اور دوسرا ”جمعیت اقوام“ کے مقابلے میں ”جمعیت آدم“ کا تصور۔ مذکورہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں ارباب دانش کو انہی نکات پر کھل کر بات کرنی چاہیے تھی۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۳۔ قومی تعلیمی پالیسی پر آپ کا اداریہ پھر سبقت لے گیا۔ آپ کی تحریر میں تحقیق، تجزیہ اور زبان کی دل آویزی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو بالعموم ادبی رسائل کے اداریوں میں کم کم پائی جاتی ہیں۔ ایسا جان دار اداریہ لکھنے پر ایک بار پھر ہدیۂ تحسین قبول فرمایئے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۱۰ء)

۴۔ فیض پر آپ کا اداریہ پڑھا۔ دھڑکتے دل سے اس لیے کہ ہمارے ادب میں فیض پر لکھے جانے والے مضامین میں ”بغضِ معاویہ“ نے بہت کام کیا۔ چند جملے اس کی مدح میں لکھنے کے بعد عصری ماہرین ادب ”مگر“ پر آجاتے ہیں اور وہ کچھ لکھ جاتے ہیں جو ان کے دل میں تو ضرور جاگزیں ہوتا ہے لیکن فیض کی تحریروں میں نہیں۔ مقام شکر کہ آپ نے فیض پر بہت متوازن اور دل

نشیں انداز میں لکھا اور بجا طور پر اُسے ''حریت سرشت'' اور عظیم محبت وطن قرار دیا۔ ورنہ آج کل ایک فکر باختہ (یہ ترکیب آپ ہی کی ہے) گروہ نے تو اقبال اور فیض دونوں کو صوفی قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

۵۔ جنوری تا جون ۲۰۱۱ء کے الاقرباء میں حاصل مطالعہ تو آپ کا اداریہ تھا اول تو اب ادبی پرچوں میں اداریہ نویسی کی رسم ہی اُٹھ گئی ہے کیونکہ اس میں محنت زیادہ پڑتی ہے اور ''آ بیل مجھے مار'' کا امکان ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ (شمارہ ۳ ۔۲۰۱۲ء)

۹۔ پروفیسر سیّد مشکور حسین یاد۔ لاہور

۱۔ آپ کا تحریر کردہ اداریہ پڑھ لیا ہے۔ آپ سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے کہ ''کوئی بھی مہذب، متمدن اور متحرک معاشرہ فرد کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔'' اسی طرح مجھے آپ کے اس ارشاد سے بھی صد فی صد اتفاق ہے کہ ''وہ معاشرے جو صرف ''ظاہر کی آنکھ'' پر انحصار کرتے ہیں سنگین ترین ناانصافیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' میں آپ کی اس عبارت کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ''افراد معاشرہ میں وہ طبقات بھی شامل ہوتے ہیں جو اپنی کاوشوں سے نہ صرف معاشرہ کے خدوخال سنوارتے ہیں بلکہ نہایت خاموشی سے ایک مسلسل و متواتر نادیدہ عمل کے ذریعہ ایسے خوبصورت رنگ بھرتے ہیں جو اس معاشرے کو وقار و تمکنت ہی نہیں لطافت و رعنائی سے ہمکنار کرتے ہیں۔' آپ نے اداریہ کا عنوان ہی اس پر رکھا ہے جو آپ کی باقی تمام عبارت سے لگا نہیں کھاتا۔ یہ لکھنے پڑھنے والے حضرات تو خود یہ چاہتے ہیں کہ پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔'' (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۴ء)

۲۔ آپ کا اداریہ اس دفعہ بھی حسب معمول غور طلب ہی نہیں عمل طلب بھی ہے۔ آپ نے مافیا کے معانی پر جس طرح خاصہ فرسائی کی ہے وہ اپنی جگہ ایک مفید عمل ہے۔ آج کل اطالوی زبان کا یہ لفظ بہت استعمال ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد آدمی کی خودغرضی اور حرص و طمع پر ہے۔ آپ کے اداریوں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ اہلِ قلم کو جاگنے کی ضرورت ہے اور ایسے افراد کو گرفت میں لانے کی ضرورت ہے۔ آپ جب اپنے اداریوں میں اس طرح ان لوگوں کو جھنجھوڑتے ہیں تو ایک جاگنے کا

عمل ظہور میں تو آتا ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۵ء)

۳۔ الاقرباء جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء میں بھی حسب معمول آپ نے اپنے اداریہ میں انسان کی آزادی رائے اور اس کے اظہار پر ایک خاص زاویہ سے روشنی ڈالی ہے اور پھر صرف روشنی ہی نہیں ڈالی انسان کی آزادیٔ رائے کی اچھی خاصی تاریخ بھی تحریر کر ڈالی ہے۔ بہر حال اپنے اداریہ میں آپ نے ایک شمع تو روشن کی ہے کون اس شمع سے کام لیتا ہے اور کس کس کی آنکھیں چندھیاتی ہیں اس پر غور کرنا آپ کا کام نہیں۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۷ء)

۴۔ ''الاقرباء'' کا تازہ شمارہ سالنامہ ۲۰۰۹ء ملا۔ آپ کا اداریہ توجہ طلب اور فکر انگیز ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ ''عالمگیریت نہایت برق رفتاری سے معاصر معاشروں کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے'' رومن رسم الخط اردو کے اپنے رسم الخط سے کسی طور بھی آگے نہیں جا سکتا۔ اردو کے لیے رومن رسم الخط کا تقاضا کمزور ذہن کے افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ ورنہ دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو کا رسم الخط اپنے طور پر جس قدر دلکش اور معنی افروز ہے یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔

(شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۵۔ اداریہ الاقرباء کی خاص خوبی ہے۔ اقبالیات میں سارے مضامین خوب سے خوب تر ہیں اور جیسا کہ آپ کے اداریہ کا عنوان ہے ''فکر اقبال کی عصری معنویت'' اس معنویت کا وضاحت کے ساتھ اظہار کرتے ہیں لیکن جناب جسٹس جاوید اقبال کا مضمون ''اجتہاد'' یوں تو بڑا واضح ہے مگر اس مقالہ کا پہلا پیراگراف پڑھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی کہ فرزند اقبال یہ فرما رہے ہیں کہ ''ہم نے اقبال کو صرف شاعر سمجھا ہے اور ان کی نثری کاوشوں کو جس توجہ کی وہ مستحق ہیں وہ انہیں نہیں دی گئی۔'' (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۶۔ آپ کا اداریہ ''اقبال کا تصورِ پاکستان اور فرزندِ اقبال کے ارشادات'' پڑھا اور بے ساختہ آپ کی تاریخ دانی کا قائل ہونا پڑا۔ نہایت معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان سے متعلق نہ ہم علامہ اقبال کے خیالات کو غور سے پڑھتے اور سمجھتے اور نہ ہی قائداعظم کے خیالات کو اس ضمن میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ یہی بات اپنے اداریوں میں اکثر سمجھانے کی کوشش کرتے

ہیں۔ (شمارہ ۴ ۔ ۲۰۱۰ء)

۱۰۔ حسن چشتی (شکاگو۔ امریکہ)

محترم آپ مجھے جانتے ہیں اور نہ میں ہی آپ سے چند ماہ پہلے تک واقف تھا۔ صورت آشنا تو اب بھی نہیں ہوں البتہ ادب کے حوالہ سے آپ کی شخصیت کا جو پہلو سامنے آیا، اسی نے یہ خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اردو ادب کے افق پر سب سے پہلے ۱۸۴۷ء کے لگ بھگ جو ستارہ نمودار ہوا وہ ماسٹر رام چندر کا ''محبِّ ہند'' تھا۔ اس کے بعد جن ستاروں کی تابناکی سے پوری ایک کہکشاں وجود میں آئی اُن غیر فانی ناموں کی فہرست بہت طویل ہے مگر جن سے آپ صرف نظر نہیں کر سکتے ان میں سر سید علیہ رحمتہ کا ''تہذیب الاخلاق'' عبدالحلیم شؔرر کا ''دلگداز'' مولانا حسرت موہانی کا ''اردوئے معلیٰ'' مولانا ظفر علی خاں کا ''ستارۂ صبح'' دارالمصنفین کا ''معارف''، چکبست کا ''صبح امید'' امتیاز علی تاج کا ''کہکشاں''، مولانا عبدالحق کا ''اردو'' شوکت علی فہؔمی کا ''دین دنیا''۔ نیاز اور فرمان فتح پوری کا ''نگار'' تاجور نجیب آبادی اور مولانا صلاح الدین احمد کا ''ادبی دنیا'' شاہد احمد دہلوی کا ''ساقی'' صہبا اکبر آبادی کا ''شاعر'' صہبا لکھنوی کا ''افکار'' ترقی پسند مصنفین کا ''سویرا'' جو بعد میں ''ادب لطیف'' کہلایا، ممتاز شیریں کا ''نیا دور'' حکومت ہند کا ''آجکل''، حکومت پاکستان کا ''ماہ نو''، محمد طفیل صاحب کا ''نقوش'' انجمن ترقی اردو کا ''قومی زبان'' احمد ندیم قاسمی کا ''فنون''، وزیر آغا کا ''اوراق''، مشفق خواجہ کا ''تخلیق ادب''، عطاالحق قاسمی کا ''معاصر''، بہاولپور اردو اکیڈمی کا ''الزّبیر'' اور شاہد احمد خاں کا ''نئی کتاب''۔ میرے نزدیک ہی نہیں بلکہ ہر اہل دل و نظر کے لیے ان اعلیٰ اور معیاری جریدوں کی کہکشاں میں سیّد منصور عاقل کے ''الاقرباء'' کی شب تابی کا مورخین ادب کے لیے اعتراف کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ لازمی ہوگا۔ گزشتہ ایک دہائی میں ''الاقرباء'' نے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے اور وہ بلاشبہ ان موقر اور ناقابل فراموش رسالوں میں شمار ہوتا ہے جو قارئین کو نثر و نظم اور تحقیقی ادب کا ایک ارفع انتخاب پیش کرتا ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۹ء)

۱۱۔ مرتضیٰ برلاس۔ لاہور

جنوری/ مارچ کے شمارے کے اداریے ''تمنا کا پہلا قدم'' میں آپ نے دشت خار میں برہنہ پا ہونے کے باوجود اس مٹی کو خون سے نمی بخش کر زرخیز بنانے کا عزم کیا ہے۔ خدا اس میں آپ کو کامیاب کرے۔ میری تمام تر نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ (شمارہ ۲ ۲۰۰۱ء)

۱۲۔ پروفیسر شوکت واسطی۔ شیفیلڈ (انگلینڈ)

میں تو جانوں کہ الاقرباء ایسے خاص سمت و جہت کے ایک غیر جانبدار جریدے کی وطن عزیز میں شدید کمی تھی منجملہ دیگر ادبیاتی اقسام جو سنجیدہ تحقیقی مساعی پر مبنی مواد کو بیش از بیش فروغ علم کے لیے پیش فرمائے۔ یہ قرینہ مرحوم نیاز فتحپوری کے ساتھ ''نگار'' پر ختم ہو گیا تھا بارے پھر احیا ہوا۔

(شمارہ ۴ ۲۰۰۱ء)

۲۔ آپ نے اس بار اداریئے میں ادب عالیہ کے حوالے سے دلچسپ اور کارآمد بحث اٹھائی ہے۔ تاہم مجھے محسوس ہوا کہیں کچھ نہ کچھ خلط مبحث ہو رہا ہے۔ ادب عالیہ یا آفاقی ادب کی اصطلاح انگریزی زبان میں کلاسک کی ہم معنی ہے۔ اردو میں اس سے مراد صرف وہ ادب لیں جو خصوصی طور ایسا معتبر ہو جسے وقت یا زمانہ کبھی رد یا فراموش نہ کر سکے، یہ ہر نسل انسانی کی دستبرد سے محفوظ یوں بھی رہ جاتا ہے کہ اس کی بقا کا انحصار کلیۃً تحریری بھی نہیں بلکہ معتد بہ صدری ہے، قلم اس کا سفینہ نہیں، یہ سینہ بہ سینہ سفر میں رہتا ہے۔ حسب معمول اس بار بھی اداریہ بجا طور پر اقدار کی پاسداری کی تکرار میں ہے اور اصرار ان باتوں پر جن سے دھیان روگرد اور رویہ سرد ہے۔

(شمارہ ۳۔۲۰۰۳ء)

۱۳۔ پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی۔ لیّہ (پنجاب)

زیر نظر الاقرباء کے شمارے میں اداریہ بعنوان ''بین المملکتی ادب'' بے حد علمی اور ادبی سوچ کا نچوڑ ہے۔ (شمارہ ۳۔۲۰۰۴ء)

۲۔ اداریہ پڑھا طبیعت زعفران زار ہو گئی۔ آپ کا اداریہ اردو کانفرنس کے انعقاد کے حوالے سے اغلاط کی نشاندہی جو ۱۳ نکات پر مشتمل ہے، بندہ ناچیز کو بیحد ملول کر گیا اور آپ کی عالمانہ بے

باکانہ جرأت وجسارت کو سلام کرنے کو جی چاہا لہٰذا میر اسلام پہنچے۔ (شمارہ ۳ ۔۲۰۰۵ء)

۳۔ سہ ماہی الاقرباء اپریل تا جون ملا۔ حسب عادت اداریہ پڑھا، آپ کے رشحات فکر ہمیشہ سے ایک مخصوص تہذیب وثقافت کے امین رہے ہیں گویا عوامی تمدن سے الاقربا کی قربت ایک مضبوط ومربوط رابطے کی محافظ ہوتی ہے۔ (شمارہ ۳۔۲۰۰۶ء)

۱۴۔ پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی۔ اسلام آباد

''ادب کا نوبل انعام'' پر اداریہ حقیقت کُشا ہے اور مغرب کے معیارات کا صحیح تجزیہ ہے۔ (شمارہ ۲ ۔۲۰۰۷ء)

۱۵۔ پروفیسر محسن احسان۔ پشاور

آپ نے اداریہ میں بڑی فکر انگیز باتیں لکھی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان نے تحریک پاکستان میں نہ صرف اہم کردار ادا کیا۔ بلکہ مسلمانان برصغیر نے اسے اپنی زبان سمجھ کر علاقائی اور نسلی تعصّبات سے بالا ہو کر اپنایا اور اس زبان نے بھی دلوں میں گھر کر لیا۔ سب سے رابطہ بڑھانے اور سب سے تعلق اور ہم دلی قائم کرنے میں اس نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا آپ ایسے ہی چونکا دینے والے اداریے تحریر کرتے رہے۔ تو شاید کچھ سرسرکار میں بھی جنبش پیدا ہو۔ (شمارہ ۱۔۲۰۰۲ء)

۲۔ ہمیشہ کی طرح اب کے پھر آپ نے اداریے میں بعض بڑی چونکا دینے والی باتیں لکھی ہیں یہ حقیقت ہے کہ امریکہ نے عراق کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے اور جس خوفناک مستقبل کی طرف ہم رواں ہیں۔ اس کے دھیان سے ہی خوف آنے لگتا ہے۔ انسانی ضمیر اور اجتماعی شعور بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔ بولنے والے بولتے ہیں۔ شور مچانے والے شور مچاتے ہیں لیکن ایک ''ذات شریف'' کہ ساری دنیا میں دندناتی پھر رہی ہے۔ مسلم امہ خواب غفلت میں ہے۔ جنگ سر پر منڈلا رہی ہے۔ وہ اپنی خوابگاہوں میں استراحت فرما رہے ہیں مجھے اس کڑے وقت سے خوف آنے لگتا ہے۔ اکیسویں صدی ہمارے لیے خصوصاً ملت اسلامیہ کے لیے آگ اور خون کا سیلاب لے کر آ رہی ہے۔ آپ ایسے اداریے لکھتے رہیں۔ لیکن ان کو پڑھنے والا کون ہے اور اگر ہے تو کتنے لوگ ہیں! یہ سوال اپنی جگہ پیچیدہ ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۳ء)

۳۔ اداریے سے بات شروع کی جائے۔ گزشتہ اداریوں کی طرح اب کے بھی آپ نے ادب اور نظریہ ضرورت کے تحت بڑی اہم باتیں چھیڑی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سیاست کی طرح نظریہ ضرورت ادب میں بھی داخل ہو گیا ہے۔ اور آپ کے اداریے کے آخری جملے نے تو چونکا دیا۔ مجھے بھی خوف آتا ہے کہ خس و خاشاک کا سیل بلاخیر کہیں ادب کے صحت مند اور توانا رجحانات کو بھی برباد نہ کر دے۔ جس شدت سے کم تر تخلیقی کتب کی بھرمار ہو رہی ہے اس نے اعلیٰ تخلیقی ادب کو کھڈے لگا دیا ہے۔ اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے اچھے معیاری ادبی رسائل کی ضرورت ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۳ء)

۴۔ اس بار آپ نے اداریے میں معاصر ادب کے حوالے سے کچھ خیال افروز باتیں تحریر کی ہیں تعلیم و تربیت اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا منظر نامہ اور اس میں نئی نسل کی ذہنی نشو و نما اور پیشرو نسل کی جبلی صلاحیتیں اور علم و حکمت سے اکتساب نے دونوں نسلوں کے درمیان بڑا نمایاں فرق پیدا کر دیا ہے۔ آپ کا موقر جریدہ یہ فکری لہر بیدار کرنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنا کام خلوص دل سے جاری رکھیے نتیجہ خدا پر چھوڑیے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۳ء)

۱۶۔ سید محمد سلیمان۔ اسلام آباد

منصور عاقل صاحب کے اداریے ادب کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ ان میں علمی اور ادبی موضوعات پر ان کے تبصرے بڑے پُرمغز ہوتے ہیں۔ الاقرباء کے تازہ شمارہ (اپریل۔ جون ۲۰۱۰ء) میں بھی ان کا اداریہ ''اقبال کا تصور پاکستان اور فرزندِ اقبال کے ارشادات'' بڑا فکر انگیز ہے۔ اسلامی ریاست میں قانون سازی اور انتظامی امور اور اسلامی فکر و فلسفہ کے ارتقاء میں جن ائمہ اور مفکرین نے حصہ لیا ان کا مختصر تعارف کرانے کے بعد موصوف نے علامہ اقبال اور بانی پاکستان کے ارشادات کی روشنی میں سیکولر ذہن رکھنے والوں کی مدلل تردید کی ہے۔ موصوف کا یہ اداریہ ایک تحقیقی شہکار ہے اور اس کے حوالہ جات جمع کرنے کے لیے موصوف نے جو محنت کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ یہ اداریہ ایک روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے اور آئندہ جو لوگ بھی اس موضوع پر قلم اٹھائیں گے ان کے لیے یہ بے مثال رہنمائی فراہم کرتا رہے گا۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۱۷۔ حبیب اللہ اوج۔ لاہور

آپ جس محنت اور مشقت سے سہ ماہی الاقرباء مرتب فرماتے ہیں۔ مضامین کا تنوع، نظم و نثر کا انتخاب اور پھر آپ کا فکر انگیز اداریہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے بھرپور فیاضی سے کام لے کر آپ کو یہ صفات ودیعت کی ہیں ورنہ اس دور پر آشوب میں جب کہ صفر Utility Bills ہی قوت لایموت کے تمام ذرائع ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اس آن بان اور شان کا رسالہ مرتب کرنا یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۳ء)

۱۸۔ ڈاکٹر غلام شبیر رانا۔ جھنگ

اپریل۔ جون ۲۰۰۴ء کے مجلّے میں آپ کا اداریہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ (شمارہ ۳ ۲۰۰۴ء)

۲۔ ”مغرب میں اردو زبان و ادب کے امکانات“ فکر انگیز اداریہ ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۴ء)

۳۔ ”مافیا“ کے عنوان سے اداریہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں مافیا کے لوگ دندناتے پھرتے ہیں۔ خدا ہم پر رحم فرمائے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۵ء)

۴۔ سہ ماہی الاقربا جون ۲۰۰۶ء موصول ہوا شکریہ۔ معاصر ادب میں فکری و نظریاتی اعتدال کی ضرورت پر اداریہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قومی دردمندی اور مثبت سوچ سے لبریز یہ تحریر فکر و نظر کو مہمیز کر رہی ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۶ء)

۵۔ مجلّہ الاقرباء (جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۷ء) موصول ہوا۔ اداریہ آپ کی حب الوطنی، خلوص اور دردمندی کا مظہر ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۷ء)

۱۹۔ خالد یوسف۔ (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

آپ کا اداریہ معاصر ادب میں فکری اور نظریاتی اعتدال کی ضرورت حسب حال اور برمحل مشورہ ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۶ء)

۲۔ اداریہ ’غزالاں تم تو واقف ہو۔۔۔“ میں احمد ندیم قاسمی مرحوم کے فن اور شخصیت کو شایان شان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۷ء)

۳۔ اداریہ ''ادب کا نوبل انعام۔ معیار و ملحوظات'' میں ترک افسانہ نگار اُرحان پاموک کو نوبل انعام سے نوازا جانا ادارے کی ان ناپسندیدہ روایات کا افسوسناک تسلسل ہے جہاں صرف مغربی پالیسیوں کے حامی افراد پر ہی ابر کرم برستا رہتا ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۷ء)

۴۔ آپ کا اداریہ ''اردو مخالفوں اور منافقوں کے درمیان'' یقیناً برمحل آوازۂ حق ہے۔

(شمارہ ۳ ۲۰۰۷ء)

۵۔ مرحومہ قرۃ العین حیدر پر اداریہ دلدوز اور برمحل ہے کہ ان کی رحلت ہم سب کا دکھ ہے اور اردو ادب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان۔ خدا انہیں جنت الفردوس نصیب کرے۔

(شمارہ ۱ ۲۰۰۸ء)

۶۔ اداریہ ''پاکستان میں اردو ادبی تحقیق کا مستقبل'' خوب اور برمحل ہے اور پاکستان یونیورسٹیوں میں تحقیق کے مائل بہ پستی معیار کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۸ء)

۷۔ اداریہ 'جو کفر از کعبہ برخیزد' وقت کی پکار ہے اور ہم سب کے جذبات کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔ اس ضمن میں خانوادۂ خیری اور محمد اسماعیل قریشی کی مساعی لائق ستائش ہیں۔

(شمارہ ۱۔ ۲۰۰۹ء)

۸۔ اداریہ رسم الخط کے مباحث اور اردو کی تہذیبی شناخت، اردو کے موجودہ رسم الخط کے دفاع میں ایک جاندار تحریر ہے۔ ویسے بھی جب تک مسلمان بچے قرآن پڑھتے رہیں گے اردو کے رسم الخط سے نابلد نہیں رہ سکتے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۲۰۔ محترمہ سعیدہ راشد۔ کراچی

اداریہ ''فکر اقبال کی عصری معنویت'' بھی مطالعے اور غور و فکر کے اجزا سے مملو ہے۔ آپ نے صحیح لکھا ہے کہ مسلم ریاستیں، غیر مسلم ریاستوں کے مسلمانوں کو دستِ اعانت فراہم کرنے میں ناکام ہوگئی ہیں۔'' (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۹ء)

۲۔ آپ کا اداریہ ہماری موجودہ حالت پر پُر درد اور پُر فکر ہے۔ دوسری غلط کاریوں کے علاوہ اردو زبان کے ساتھ ہمارا سلوک تہذیبی شناخت و احساس ملی کی راہ میں ایک پہاڑ کی طرح

ہے۔ (شمارہ ۴ ۔۲۰۱۲ء)

۲۱۔اکبر حیدر آبادی۔ (آکسفورڈ۔ برطانیہ)

اداریہ میں آپ نے الفرڈ نوبل کے نام پر دیئے جانے والے نام نہاد اعزازی انعامات کے پس پردہ ''خیانت'' کا جو مذموم رویہ کارفرما ہے اس کی برجستہ نشان دہی کی ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۷ء)

۲۔ اداریہ میں اردو کی منفرد ناول نگار قرۃ العین حیدر کو جو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ وہ بیک وقت نہایت جامع اور سیر حاصل ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۸ء)

۳۔ اداریہ میں بین الاقوامی لسانیات کے تعلق سے یونیسکو کے بظاہر امید افزا اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے پس پردہ عملِ سیاست کو فاش کیا گیا ہے جس کے تحت ایک مخصوص زبان کو لسانی فوقیت عطا کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اس میں کیا شک کہ اردو کی لسانی تشکیل پنجابی سندھی پشتو اور دیگر علاقائی زبانوں کی مرہون منت ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۸ء)

۴۔ اس مرتبہ اداریہ میں ایک اہم ادبی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پاکستان میں اردو ادبی تحقیق کے ضمن میں جو کام ہو رہا ہے اُس کو سراہتے ہوئے اُس کے منفی پہلوؤں کو بھی معرض تنقید میں لایا گیا ہے۔ لیکن جہاں خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہیں مسائل کے حل کے بارے میں بہت سی مفید اور عملی تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۸ء)

۵۔ اداریہ میں آپ نے ایک نہایت اہم عصری موضوع پر سیر حاصل روشنی ڈال کر مروجہ نظام تعلیم کے مثبت و منفی پہلوؤں کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

۶۔ اردو کے مخلص اور سچے خیر خواہ کی حیثیت سے آپ بارہا اپنے اداریوں میں حکومت اور عدلیہ کی توجہ ان دستاویزات کی جانب مرکوز کراتے رہے جن کی رو سے اردو کو دفتری سطح پر رائج کرنے کے احکام شامل رہے لیکن واقعی سخت تعجب کی بات ہے کہ کسی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگی ! تاہم اردو کو اس کے جائز حقوق دلوانے کے لیے آپ جس مستقل مزاجی سے احتجاج کیے جا رہے ہیں وہ لائق صد تحسین ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۹ء)

۷۔ اداریہ نہایت وقیع و فکر افروز ہے کہ اکیسویں صدی میں نمودار ہونے والے Globalization

کے پیدا کردہ منفی اثرات کی زد میں آنے والی لسانی تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا خوش اسلوبی سے احاطہ کرتے ہوئے رسم الخط کی اہمیت ضرورت اور افادیت کو وضاحت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۱۰۰۹ء)

۸۔ آپ کا اداریہ اہل فکر کے لیے تازیانۂ بیداری ہے۔ آپ نے ادب اور سائنس کے حوالے سے بڑے ذہن افروز تاثرات کا اظہار کیا ہے اس میں کیا شک کہ اردو کے ارباب قلم نے شعروادب کے میدان میں تو کارہائے نمایاں انجام دیئے مگر علوم وفنون جیسے حیات آفریں موضوعات سے کسی حد تک بے اعتنائی بلکہ تجاہل برتا۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۹ء)

۹۔ ''فیض میزان عصر میں'' انہماک ومحنت سے لکھا گیا اداریہ ہے جس میں ایک تازہ فکر زندہ دل عہد ساز شاعر کی سوانح حیات پر نئے زاویوں سے بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے جو بیک وقت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

۲۲۔ ڈاکٹر یوسف قدوائی۔ (اومیک، واشنگٹن، امریکہ)

اداریہ میں قومی زبان کے حوالے سے جن محیّر العقل امور کی نشاندہی کی گئی ہے وہ رہنماؤں کی ذہنی سطح تعلیم، دوراندیشی، حب الوطنی، یک جہتی اور بالغ نظری کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ ذہنی قلاش لوگ تنزلی کی سرحدوں کو امکانی حدود سے ماورا وسعت دے رہے ہیں۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔ آزمائش کی ضرورت تو جناب والا وہاں پیش آئے، جہاں عقل وتدبر کا فقدان نہ ہو آٹھ زبانوں کو قومی زبان بنانے کی تجویز دینے والوں کی ذہنی پسماندگی کی تعریف کرنے کے لیے آپ کو نئے الفاظ وضع کرنے ہونگے۔ (شمارہ ۳ ۔۲۰۱۲ء)

۲۳۔ ڈاکٹر آصف الرحمٰن طارق (امریکہ)

آپ کے اداریئے اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو ہر لحاظ سے عہد آفریں کہا جاسکتا ہے۔ یہ اداریئے مقالوں جیسا وزن اور وقار رکھتے ہیں۔ ان میں تحقیق اور تنقید کا جیسا متوازن مواد ملتا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ (شمارہ ۳ ۔۲۰۱۲ء)

۲۴۔ محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

آپ نے اپنے تازہ ترین اداریہ میں (جولائی۔ ستمبر۲۰۰۴ء) جس کاروبارِ شاعرگری کی طرف اشارہ کیا ہے، امریکہ اس کی لپیٹ میں ہے۔ یقین نہیں آتا کہ معتبر شعراء علم وفن کی سوداگری میں ملوث اور متشاعروں کی پرورش بھی کرسکتے ہیں۔ (شمارہ ۴، ۲۰۰۴ء)

۲۔ آپ کا اداریہ حسب روایت سابقہ اداریوں کی طرح جامع سفارشات کا حامل ہے۔ کیا حکومت کا کوئی ایسا شعبہ ہے جو قومی زبان کے فروغ، ادبی ورثہ کی حفاظت، تعلیم کے معیار کے متعلق اہل الرائے کی سفارشات حکمتِ عملی وضع کرنے والوں تک پہنچا سکے۔ (شمارہ ۳ ۲۰۰۸ء)

۳۔ آپ کا اداریہ ہماری معاشرتی تنزلی کے مرض کی صحیح تشخیص کرتا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں تعلیم کے ضمن میں جو خلیج واقع ہوئی ہے اس کو پُر کرنا خاکم بدہن ناممکن ہے البتہ ابتدائی تعلیم کے اور اساتذہ کی تربیت گاہوں کے نصاب میں انقلابی تبدیلیاں اگر آج بھی لائی جائیں تو اُس کے ثمرات آئندہ دس پندرہ سالوں میں مرتب ہوسکتے ہیں۔ وحی الٰہی کا آغاز ''اقراء'' سے ہوا۔ حضورؐ کی ذات اُمی لقب نے تحصیل علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم فرمایا اور تاکید فرمائی کہ علم و حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں بھی ملے اُسے اخذ کرلیا جائے۔ ان واضح ترین اشارات واحکام کے باوجود تعلیم سے صرف نظر کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے جس کی تلافی بہرحال کرنی چاہیے اور کرنی پڑے گی۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

۲۵۔ بیرسٹر سلیم قریشی۔ لندن

اس شمارہ میں آپ کا اداریہ ''ادب اور اظہار رائے کی آزادی'' حسب معمول متوازن اور دلائل سے مزین ہے جو مجھے اظہار رائے پر اکسا رہا ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۸ء)

۲۔ ۲۰۰۸ء کو زبانوں کا بین الاقوامی سال قرار دینے والی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد کے حوالے سے آپ کا اداریہ اُردو کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ اردو کی شناخت اور اس کا مقام دلانے کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر آپ کی کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔ خدا کرے یہ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۸ء)

۳۔ آپ کے اداریہ میں فیض کو ’’میزان عصر‘‘ میں دیکھنے کا موقع ملا۔ فیض پر آپ کی تحریر نہایت متوازن ہے۔ اس میں فیض کے صحیح خدوخال اُبھرتے ہیں۔ فیض کے مذہبی اور اشتراکی پس منظر میں توازن ہے تضاد نہیں۔ اس بات کو آپ نے بڑی خوبصورتی سے فیض کے مذہبی پس منظر کے حوالے سے بیان کیا ہے جس سے فیض کی روح خوش ہوئی ہوگی۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

۴۔ اپریل۔ جون کے شمارے میں آپ کا اداریہ ’’اقبال کا تصور پاکستان اور فرزند اقبال کے ارشادات‘‘ پڑھا۔ یہ اداریہ ایک تاریخی اداریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں آپ نے پورے دلائل اور مستند حوالوں کے ساتھ فرزند اقبال کے ارشادات کی نفی کی ہے یہ اداریہ لکھ کر آپ نے معنوی فرزند اقبال ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ جولائی۔ ستمبر کے مراسلات کے سیکشن میں آپ کے اداریہ کی حمایت میں متعدد خطوط پڑھ کر مجھے بھی خیال آیا کہ

نالے بُلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

(شمارہ ۴۔ ۲۰۱۰ء)

۵۔ آپ کا اداریہ ’جنوبی ایشیاء میں ادبی میلوں کی یلغار‘ نے بقول ہمدم دیرینہ محمود اختر سعید مرحوم ایک کہنہ روایت کو نئی جہت عطا کی ہے۔ تہذیبی تصادم کے پس منظر میں آپ نے جن میلے ٹھیلوں کا جائزہ لیا ہے وہ رواں تاریخ کی تلخ حقیقت ہے۔ اور آخر میں آپ نے پردہ زنگاری ہٹا کر معشوق کو بے نقاب کر دیا۔ بقول اقبال ’دستِ رُومی پردۂ محمل گرفت‘۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۱ء)

۶۔ آپ کا اداریہ پاکستان میں تعلیم و تحقیق کی شکست و ریخت‘ ہمارے ساستدانوں اور ارباب اختیار کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۱۱ء)

۷۔ قومی زبان کے حوالے سے ’’حمیت باختہ سفارت کاری‘‘ پر آپ کا اداریہ ’حمیت باختہ سفارتکاروں کے لیے ایک تازیانہ ہے بشرطیکہ ان کی موٹی چمڑیاں اس کا اثر قبول کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر طوقار کو خراج تحسین پیش کر کے ان کے مجروح احساسات کی کافی حد تک تلافی کی ہے۔ آپ نے اپنے اداریہ میں جامع کراچی کی ’غلط بخشی‘ کی بروقت نشاندہی کی ہے۔ ’’چو کفر از

کعبہ برخیزر کجا ماند مسلمانی'' (سالنامہ۔ ۲۰۱۲ء)

۸۔ آپ کا مقالہ افتتاحیہ! ''ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔ عقل وتدبر کی آزمائش'' سیاستدانوں کے دیوالیہ پن کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس بل کے پیش کرنے والے عقل وتدبر سے عاری ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے جس بل میں ہاتھ ڈالا ہے اس میں آٹھ منہ والا ناگ بیٹھا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ ناگ اپنے بل سے باہر نہیں نکل سکے گا کیونکہ آپ نے اس پر کافی مٹی ڈالی ہوئی ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۲ء)

۲۶۔ سیدّ محبوب حسن واسطی۔ کراچی

اداریہ میں پاکستان وترکی کی دو معروف جامعات میں اپریل ۲۰۰۹ء میں حضرت علامہ اقبالؒ سے منسوب بین الاقوامی کانفرنسوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فکر اقبال کی عصری معنویت کے عنوان سے صحیح ارشاد فرمایا کہ ''اسمیں کوئی شک نہیں کہ کلام اقبال علوم اسلامیہ کا اشاریہ ہے جس نے یورپ کے الحادی افکار کا طلسم توڑا'' (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۹ء)

۲۷۔ عقیل دانش۔ لندن (برطانیہ)

آپ نے ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص کو اداریے کا عنوان بنا کر ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ الاقرباء قومی مسائل پر کس عمیق اور پرتأثر سوچ کا حامل ہے۔ (سالنامہ۔ ۲۰۱۱ء)

۲۸۔ مسلم شمیم۔ کراچی

مغرب میں اردو زبان وادب کے امکانات کے زیر عنوان اداریہ پُرمغز بھی ہے اور پُرمعنی بھی۔ اردو دنیا کی وسعتوں کا بیان جن حوالوں سے کیا گیا ہے وہ خوب ہے۔ اس زبان کی پذیرائی اور لسانی عالمگیریت کے خدوخال کی ترتیب وتشکیل میں جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ وہ زبان اردو کے روشن تر اور وسیع تر مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ مغرب میں جا کر بس جانیوالے جس طرح اپنے ثقافتی ورثے یعنی اپنی زبان وادب کے لیے کوشاں ہیں وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۴ء)

۲۔ اداریہ بہ عنوان ''ادب اور اظہار رائے کی آزادی'' نے سب سے پہلے میری توجہ اور دلچسپی اپنی طرف مبذول کرائی۔ اداریہ ایک جامع (گومختصر) مضمون کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بیشتر مندرجات سے اتفاق نہ کرنا دیانتِ فکر کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ بہرحال مندرجہ ذیل جملے

جو آپ نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے کہے محل نظر ہیں۔ ''ادب میں ترقی پسند تحریک کی بنیادوں میں اگر جھانکا جائے تو ایک ایسا منظر سامنے آجاتا ہے جس نے ہمارے ادیبوں کے اذہان کو اجنبی اقدار و نظریات کی طرف راغب کیا اور ان کے شعور کو طبقاتی کشمکش کے شاخسانے سے دوچار کر دیا ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب قلم کار خود نظریاتی افلاس کا شکار ہو یا اپنی معاشرتی اقدار سے نامطمئن ہو''۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۷ء)

۲۹۔ سید حبیب اللہ بخاری۔ بہاولپور

''معاصر ادب میں فکری اور نظریاتی اعتدال کی ضرورت'' کے عنوان سے آپ کا اداریہ برمحل اور صاحبان علم و دانش کے احساسات کا ترجمان ہے' بلاشبہ اس دور میں ہر شخص حصار ذات میں محصور نظر آتا ہے۔ مادہ پرستی نے ہمارے اذہان سے علمی نقصان کے احساس کو مٹا دیا ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۶ء)

۲۔ ''تعلیم اور قومی تشخص ۔۔۔ نظام و نصاب کے مسائل'' کے عنوان پر آپ کا اداریہ ہر صاحب علم کے احساسات کا ترجمان ہے۔ کاش کہ صاحبان بست و کشاد کو اس ادراک کی توفیق نصیب ہو کہ نونہالانِ قوم کو کس نوعیت کے علمی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کی فراہمی کے لیے وہ کیا جستجو کر سکتے ہیں اس وقت اہل کلیسا کا نظام تعلیم رائج ہے۔ جس کے بارے میں شاعرِ مشرق نے فرمایا تھا کہ

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

(شمارہ ۴۔ ۲۰۰۶ء)

۳۔ اداریہ میں آپ نے نامور شاعر ادیب احمد ندیم قاسمی کو بجا طور پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ اُن کا استحقاق تھا۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۷ء)

۴۔ اداریہ ''اُردو مخالفوں اور منافقوں کے درمیان'' مبنی بر حقائق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف قومی زبان ہی نہیں بلکہ ہماری ملّی روایات، نظریاتی تصورات اور مذہبی اقدار تک منافقت کی وجہ سے پامال ہوگئی ہیں اقبالؒ اور جناحؒ مغربی تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر ابھر آئے اور نہ صرف

بسلامت ساحل تک پہنچے بلکہ اسلام کی ابدیت، آفاقیت اور علمی حقیقت پر ان کا ایمان اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ انہیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ::

طلسمِ علم حاضر را شکستم ربودم دانہ و دانش گُستم
خدا داند کہ مانند براہیم بنارِ او چہ بے پرواگُستم

(شمارہ ۳۔ ۲۰۰۷ء)

۵۔ آپ کا تجزیاتی اداریہ پاکستان میں ''اردو ادبی تحقیق کا مستقبل'' نہایت جامع ہے اور تخلیقی عمل کو مزید موثر اور سود مند بنانے کی غرض سے آپ کی تجاویز ارباب بست وکشاد کی خصوصی توجہ کی متقاضی ہیں۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

۶۔ اداریہ کے مطالعہ سے آپ کے احساسات کا اندازہ ہوا۔ زبان اردو کے سلسلہ میں صرف ہمارے ارباب اختیار نے ہی بے اعتنائی نہیں کی بلکہ ہماری عدلیہ کی بے رخی ہماری بد نصیبی کا مظہر ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۹ء)

۷۔ ''فکر اقبال کی عصری معنویت'' کے عنوان سے آپ کا اداریہ ارباب بست وکشاد کو بالخصوص دعوت فکر دیتا ہے آپ نے بجا فرمایا کہ اقبالؒ نے ہمیں عالمگیر اخوت کا جو سبق دیا تھا اس پر عمل پیرا نہ ہو کر ہم اپنی عظمت اسلامی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اور دنیوی اغراض کی تکمیل کے شوق میں یہود وہنود ونصاریٰ کی سازشوں اور چیرہ دستیوں کا شکار ہو گئے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۹ء)

۸۔ قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء پر آپ کا اداریہ نہایت جامع اور قومی احساسات کا ترجمان ہے اللہ ہمارے ارباب اختیار کو صحیح فکر عطا کرے تا کہ وہ قومی اور ملکی امور اُن نظریات کے پیش نظر مکمل کر سکیں جن کا تعین ہمارے قائد یا اکابرین نے پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے یا بعد میں کیا تھا۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۱۰ء)

۹۔ اداریہ مقصدیت کا غماز ہے۔ آپ نے نہایت مکمل اور مُدلّل انداز میں نظریات اقبال کو واضح فرمایا ہے۔ تصورِ تشکیل پاکستان کے سلسلہ میں دونوں اکابر مُتفق تھے کہ یہ ایک اسلامی فلاحی ریاست ہوگی۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۱۰۔ آپ نے اپنے اداریہ میں وطن عزیز میں تعلیم اور نظام تعلیم کی زبوں حالی کا اظہار ابتداً ان الفاظ سے کیا ہے کہ ''علم خدا آگہی اور خود آگہی کی شرطِ اوّل ہے اور یہی افراد و اقوام کی زندگی میں تعمیر و تطہیر کی ضمانت بھی''۔۔۔ بلاشبہ اس حقیقت سے اغماض ممکن نہیں ہم تقلید مغرب میں قوم رسولؐ ہاشمی کا اعزاز کھو بیٹھے ہمارا نظام تعلیم مادیّت سے اس قدر آلودہ ہو گیا کہ ہم اپنا یہ سبق فراموش کر بیٹھے ہیں کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(شمارہ ۴ ۔ ۲۰۱۰ء)

۱۱۔ آپ نے اپنے اداریہ میں جو اندوہناک انکشافات کئے ہیں خدا کرے ہمارے دانشور اور صاحبان علم و بصیرت اس کا ادراک کریں تا کہ بین الاقوامی طور پر اس خطۂ پاک کے بارے میں منفی تصوّرات کا ازالہ ہو سکے۔ (شمارہ ۳ ۔ ۲۰۱۱ء)

۱۲۔ ''الاقرباء کے حالیہ شمارہ میں آپ کا اداریہ ''پاکستان میں تعلیم و تحقیق کی شکست و ریخت'' مدبرانہ اور جرأت مندانہ احساسات کا عکاس ہے۔ اس دور میں اس نوعیت کے خیالات کا اظہار بلاشبہ جہادِ کلمۃُ الحق کے زمرہ میں آتا ہے۔ وَمَا توفیقی الا باللہ (شمارہ ۴ ۔ ۲۰۱۱ء)

۱۳۔ آپ کا اداریہ ''قومی زبان کی تذلیل۔۔۔ حمیت یاختہ سفارتکاری'' آپ کے احساسات کا صحیح ترجمان ہے۔ بقول عبدالعزیز خالد

وطن پاک میں رُسوا ہے زبان اردو   ہے یگانوں کا گلہ شکوۂ اغیار نہیں

(سالنامہ ۔ ۲۰۱۲ء)

۱۴۔ آپ کا مقالہ افتتاحیہ نہایت مدبرانہ، جرأت اظہار کا نمونہ اور قومی احساسات کا حقیقی ترجمان ہے۔ بے حسی اور بے حمیتی کے اس دور حکومت میں یہ قلمی جہاد مُبارک ہو۔ (شمارہ ۳ ۔ ۲۰۱۲ء)

۱۵۔ آپ نے اپنے ادرایہ میں عدالتِ عظمیٰ کے قابل احترام منصفین کی عادلانہ کاوشوں کی جو

تعریف و توصیف فرمائی ہے وہ بلاشبہ حقیقت کا اظہار ہے۔ جمہوریت کے علمبرداروں نے تو اس طرزِ حکومت کی اہانت و بے توقیری میں کوئی کمی نہیں کی۔ (شمارہ ۴ ۔۲۰۱۲ء)

۱۶۔ سہ ماہی 'الاقرباء' کا شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۲ء ہمدست ہوا۔ ''گنجینۂ معارف'' کے عنوان سے مقالۂ افتتاحیہ میں تاریخی دستاویزات اور سرمایۂ علم و حکمت کے ضائع ہونے کے سلسلہ میں جن حقائق کی طرف آپ نے اربابِ اختیار اور صاحبانِ علم و دانش کی توجہ مبذول کرائی ہے وہ آپ کے قلبی احساسات کی عکاس ہے۔ بلاشبہ ''قدرِ جوہر جوہری داند'' اس نوعیت کی کتنی زیاں کاریاں ہیں جو توجہ کی طالب ہیں مگر صورت حال یہ ہے کہ ''پنبہ کجا کجا نہم'' اختتام مقالہ پر آپ نے سابق ریاست بہاولپور کے محافظ خانہ میں سرقہ و خیانت کے جن واقعات کی نشاندہی کی ہے وُہ آپ کی خصوصی وابستگی و شغفِ علمی کی مظہر ہے۔ (سالنامہ ۲۰۱۳ء)

۳۰۔ محمد اسمٰعیل قریشی۔ لاہور

آپ کے اداریہ میں ''پاکستان میں اردو ادبی تحقیق کا مستقبل'' کے عنوان سے علم گریز رُجحان اور اس کے انحطاط پذیر ہونے کا بروقت تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کی ہیں وہ قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۸ء)

۳۱۔ محمد طارق غازی۔ آٹوا (کینڈا)

اس شمارہ کا اداریہ کئی جہتوں سے قابل توجہ ہے۔ بات صرف اردو کا رسم الخط بدلنے کی نہیں ہے اور اگر ہے تو یہ بدیہی بات ہے۔ ان کا مقصد جو بھی ہو کہنے والے اپنی بات کھل کر کہتے ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۳۲۔ ڈاکٹر اسلم انصاری (ملتان)

اردو کے رسم الخط کے سلسلے میں اداریے میں بیان کئے گئے خیالات سے میں کلی طور پر متفق ہوں (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۲۔ آپ کا اداریہ ''فیض میزان عصر میں'' ایک خوبصورت تحریر ہے جو خوش ذوقی اور انصاف پسندی کے ساتھ رقم کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں فیض صاحب نے عصر حاضر کی دو تین نسلوں کے

ذہن وتخیل پر گہرے اثرات مرتب کیئے ہیں، اسی طرح ان کے فکروفن نے بہت سے مباحث کو جنم دیا ہے جن میں سے بعض مباحث آج بھی زندہ ہیں لیکن اقبال کے بعد ان کے مقام کے تعین میں کسی حد تک مبالغے سے کام لیا گیا جس کا ردعمل اب سامنے آ رہا ہے۔ بہرحال آپ کا اداریہ بہت خوب ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

۳۳۔ شفق ہاشمی۔ اسلام آباد

’’اقبال کا تصور پاکستان اور فرزند اقبال کے ارشادات‘‘ کے عنوان سے محترم سید منصور عاقل صاحب کا عالمانہ مقالہ افتتاحیہ الاقرباء کے تازہ شمارے کی جان ہے سیکولرزم اور علامہ اقبال کے حوالے سے آپ نے جو کچھ کہا ہے اس کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۳۴۔ شریف فاروق۔۔ پشاور

’’تہذیب ومعاشرت علم وادب اور تعلیم وثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب الاقرباء آپ کے دعاوی کی کسوٹی پر پورا اتر رہا ہے یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے لیکن عشق میں ایسے پاپڑ خواہ وہ لوہے کے پاپڑ ہی کیوں نہ ہوں بیلنے پڑتے ہیں۔ اس پر آپ کے اداریے نہایت وقیع اور فکری قومی اضطراب کے امین ہوتے ہیں۔ اکتوبر دسمبر کے شمارے میں آپ کا اداریہ بعنوان ’’قومی پالیسی ۲۰۰۹ء۔۔۔ اہداف وترجیحات‘‘ نظر سے گزرا۔ اس اداریہ کی جامعیت سے کس کافر کو یارائے انکار ہوسکتا ہے؟ ((شمارہ ۱۔ ۲۰۱۰ء)

۳۵۔ امجد قریشی۔ بہاولپور

اداریہ میں اردو میں تراجم کے بارے میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے اردو کو ملک کی سرکاری اور قومی زبان بنانا ہے تو پھر اپنے ذہنی تحفظات کو ختم کرنا ہوگا۔ سرکاری سطح پر ایک دارالترجمہ کا قیام ضروری ہے۔ جس میں ماہرین علوم وفنوں کی کتابوں کے اردو تراجم کریں، اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ پورے ملک میں ایک نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۲ء)

۲۔ ’’ادب میں تطہیر کا عمل‘‘ کے عنوان سے اداریہ خوب تھا آپ نے بڑی فکرانگیز باتیں کی

ہیں۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۳ء)

۳۔ اس بار آپ نے اداریہ میں جو اہم نکات اٹھائے ہیں وہ انسانی ضمیر کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہیں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ آپ نے درست لکھا کہ پاکستان بھی اس تناظر سے باہر نہیں لیکن یہاں قرطاس و قلم جس طرح ایک انبوہ ناسزا کے ہاتھوں یرغمال بن کر رہ گئے ہیں اس المیہ کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں کو اس صورتحال کے تدارک کے لیے مثبت اقدامات کرنے ہونگے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۳ء)

۴۔ آپ نے گزشتہ شمارے کے اداریہ میں جو فکر انگیز نکات اٹھائے تھے ان کے تسلسل میں تازہ شمارہ کا اداریہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے بالکل درست تجزیہ کیا کہ عہد حاضر ادب میں ایسے رویوں سے مغلوب نظر آتا ہے جو تحقیق و تخلیق کی افادیت، معنویت کو پس پشت ڈال کر فکری سطحیت اور فنی و علمی سہل انگاری کے رجحانات کو پروان چڑھا رہے ہیں اسی طرح آپ نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے جو لکھا کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ادب کے علم و حکمت اور تدبر و ثقافت کے ورثہ کی نگہبانی کرنے والی اقلیت منظّم ہو کر کثرتِ کم نظراں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کو روکے اور ادبی ابلاغ کے ان گوشوں کو تقویت بہم پہنچائے جو اس ہنگام انتشار میں مقدار سے ہٹ کر اقدار کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اب ہم اہل قلم و قرطاس کا فرض بنتا ہے کہ آپ نے جو تحریک شروع کی ہے اسے کامیاب کیا جائے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۳ء)

۵۔ اس بار آپ نے محترم پروفیسر خیال امروہوی کے افکار و خیالات کے حوالے سے جو اداریہ قلم بند کیا ہے اور اس میں جو نکات اٹھائے ہیں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ ان اہم امور کی طرف کون توجہ دے گا۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۴ء)

۶۔ آپ اداریہ میں جس انداز سے تبصرہ کرتے ہیں اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس بار بھی آپ اہم مسئلہ کو زیر بحث لائے ہیں اردو کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے لیکن بدقسمتی تو یہ ہے یہ زبان جسے ہم قومی زبان کہتے ہیں اپنے ملک میں اجنبی ہے ہمارے حکمران ہوں یا مراعات یافتہ طبقہ کے لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اردو زبان بولنا

اور اسے سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنا ان کے بس میں نہیں میں تو ان لوگوں کو انگریزی کا غلام کہتا ہوں حالانکہ ملک کے دستور کے مطابق اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج ہونا چاہیے۔

(شمارہ ۴_۴_۲۰۰۴ء)

۷۔ آپ نے اداریئے میں جن نکات کو اٹھایا ہے وہ بڑے فکر انگیز اور اہمیت کے حامل ہیں، اردو زبان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس بارے میں یہی کہا سکتا ہے کہ اردو پاکستان میں ایک مظلوم زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ کے اداریئے سے شاید کسی کا ضمیر جاگ جائے میں اس سے پہلے بھی اپنے ایک مکتوب میں اس بارے میں اظہار خیال کر چکا ہوں کہ جب تک غیر ملکی سابق آقاؤں کی ذہنی غلامی سے نجات حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک اردو اپنے وطن میں غریب الوطن ہی رہے گی۔ (شمارہ ۳_۲۰۰۵ء)

۸۔ آپ کے اداریے بڑے فکر انگیز ہیں۔ آپ جن نکات کی نشاندہی کرتے ہیں ان پر ارباب اقتدار کو غور کرنا چاہیے۔ خصوصاً اردو زبان کو سرکاری قومی زبان بنانے کے لیے آپ کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔ (شمارہ ۳_۲۰۱۲ء)

۳۶۔ نوید ظفر۔ اسلام آباد

آپ کا اداریہ حسب معمول خصوصی توجہ کا متقاضی ہے، ارباب اختیار سے اردو زبان کا حق مانگتا ہے، وہ زبان جو ۱۸۶۵ء سے ۱۹۰۰ء تک بنگال سے لے کر صوبہ سرحد تک تمام ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، آج اپنے وطن میں آئینی تحفظ کے باوجود غریب الوطنی کا شکار ہے، اور تمام سیاست دان جو ۱۹۷۳ کے آئین کو من وعن نافذ کرنا چاہتے ہیں، بڑے اطمنان سے ۱۵ برس بعد (یعنی ۱۹۷۳ء کے ۱۵ برس بعد) اردو زبان کے دفتروں میں نافذ ہونے کی شق سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں۔ (شمارہ ۲_ ۲۰۰۸ء)

۳۷۔ عبدالوہاب خاں سلیم۔۔۔ (نیویارک امریکہ)

ڈاکٹر خلیل طوقار ترکی کے مایۂ ناز سپوت پر آپ کا اداریہ پڑھ کر ہر پاکستانی کا سر شرم سے جھک گیا ہوگا۔ یہ واقعہ تو صرف ''مشتے از خروارے'' ہے کلرک بادشاہ اپنے اختیارات کا ضرورت

مندوں سے کس طرح لوہا منواتے ہیں۔ اس کا حال بیرونِ ملک پاکستانیوں سے پوچھیئے۔ پروفیسر طوقار تک ہماری معذرت پہنچانے کا شکریہ۔ وزارتِ اُمور خارجہ کو اُن کی اخلاقی ذمہ داری کی غیر متوقع موت پر تعزیت بھی پہنچا دیجیئے۔ (سالنامہ۔ ۲۰۱۲ء)

۲۔ جولائی۔ ستمبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ حسب معمول حالیہ اداریہ بھی سابقہ اداریوں کے تسلسل کی ایک مضبوط کڑی ہے جو ملی تہذیب اور زبان کے پرزور وکیل کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ مفکر پاکستان کے نزدیک جمہوری نظام حکومت کی باگ ڈور اعلیٰ دماغوں کے بجائے متوسط اور ادنیٰ ذہن رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جمہوریت شمار تو کرنا جانتی ہے لیکن وزن کرنا نہیں جانتی۔ (شمارہ ۴ ۔ ۲۰۱۲ء)

۳۔ نجی کتاب خانوں کی حالت زار پر میں پہلے ہی سے بہت مغموم، دل گوفتہ اور فریاد کناں تھا، پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب اور آپ کے اداریہ کی تحریروں نے میرے زخموں پر مزید نمک پاشی کی آپ ہر دو حضرات سے میرا تعلق نیاز مندانہ اور محبت کے رشتے کی صورت میں استوار ہے۔ میں نے ایسے نجی کتب خانوں کو دیکھا بھی ہے اور ان کا احوال بھی پڑھا ہے میں لاہور کے فٹ پاتھ پر بہت سے فخر روزگار لوگوں کے نجی کتب خانوں کی نادر کتابوں کا بازار لگا دیکھ کر افسوس کرتا اور خون کے آنسو روتا تھا۔ (سالنامہ ۲۰۱۳ء)

۳۸۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ لاہور

الاقرباء کا تازہ شمارہ آپ کے فکر انگیز بلکہ درد انگیز اداریے سے شروع ہوا۔ آپ کی تعمیری سوچ میں تقابلی مطالعے اور اس کے نتیجے میں مختلف اضاف نظم ونثر میں انحطاط کے واضح اشارے موجود ہیں۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۶ء)

۲۔ آپ نے بھی اپنے اداریے کے آخر میں پتے کی بات لکھی کہ ادب کو تنوعات فکر سے محروم کر کے یکسانیت کا شکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ مدعا یہ ہے کہ جس طرح فن کے سانچوں میں ڈھل کر کوئی بھی شے حسن صورت کا شہکار بن جاتی ہے۔ اسی طرح اظہار رائے کی آزادی کو اخلاقی، نظریاتی اور معاشرتی مبادیات سے مشروط کر کے ادب کو نئے اُفق کی وسعتوں سے ہمکنار کیا

جائے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۷ء)

۳۔ اداریہ ''زبانوں کا بین الاقوامی سال'' میں آپ نے اردو زبان سے متعلق جو گفتگو فرمائی مجھے بھی آپ کی طرح اس کا مستقبل روشن نظر آتا ہے یقیناً آپ کے بقول ''اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سندھ بلوچستان، پنجاب، کشمیر اور شمالی علاقہ جات اردو کے حوالے سے تاسیسی اہمیت کے حامل ہیں۔'' (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۸ء)

۴۔ ''قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء۔۔۔اہداف وترجیحات'' سے متعلق آپ کا اداریہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ عہد موجود میں جب کہ اس کرۂ ارض پر آباد ہر ملک اپنے قومی تشخص کو یقینی بنانے کی خاطر تعلیمی حکمت عملی واضح اور نصاب تعلیم کو طبقاتی ناہمواری سے پاک دیکھنا چاہتا ہے لیکن پاکستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے، ہم آج تک پاکستانی ثقافت کا مسئلہ حل نہ کر سکے۔ ہم نے قومی زبان کو سرکاری زبان بنانے سے گریز کیا۔ آئین کی کھلی خلاف ورزی کے مرتکب ٹھہرے۔ آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ'' کی بصیرت نے اردو کو قومی زبان کا منصب اسی لیے عطا فرمایا تھا کہ یہی قومی اتحاد کا طاقت ور وسیلہ ہے اور ملک کے مختلف لسانی علاقوں کے درمیان مربوط تعلق اور افہام وتفہیم کی ضمانت بھی''۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۱۰ء)

۵۔ نظام تعلیم کی زبوں حالی سے متعلق اداریہ پڑھ کر عالمگیر ادارے یونیسکو کی رپورٹ بابت سال ۲۰۱۰ء سے آگہی حاصل ہوئی اور آپ کی ناقدانہ تحریر سے استفادہ کیا کہ ہم بحیثیت قوم ترقی معکوس کے ناگوار مراحل طے کر رہے ہیں۔ آپ نے بجا فرمایا ''ملک میں اعلیٰ تعلیم سے متعلق بھی حالات خاصے ناگفتہ بہ ہیں، حکومت کے تازہ ترین شاہکار کارنامے کے نتیجے میں اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے تحت چھ ارب روپے سے مختص ۲۲ منصوبوں کی بساط لپیٹ دی گئی ہے۔ (شمارہ ۴ ۔۲۰۱۰ء)

۶۔ الاقرباء جولائی۔ستمبر ۲۰۱۱ء کا اداریہ پاکستان میں تعلیم وتحقیق کی شکست وریخت پڑھ کر دل کا رنجیدہ ہونا فطری امر ہے آپ نے بجا لکھا کہ ہماری بصیرت باختہ قیادتوں نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم کی حکمت عملی سے انحراف برتا یہاں تک کہ چھ دہائیوں سے زیادہ مدت گزر جانے اور متعدد تعلیمی پالیسیاں وضع کرنے کے باوجود ہم اپنی سمت کا تعین نہ کر سکے'' عہد موجود میں دنیا

کے دوسرے ممالک نے اپنی اپنی زبان میں فنی اور سائنسی علوم کی تعلیم کا اہتمام کیا مگر ایک ہم ہیں کہ ہماری سمت ہی معین نہیں۔ (شمارہ ۴ ۔۲۰۱۱ء)

۷۔ آپ کا فکر انگیز اداریہ۔۔ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔۔عقل وتدبر کی آزمائش“ پوری توجہ سے پڑھا اس سے پہلے بھی آپ نے اردو کا مقدمہ نذرِ قارئین کیا اور حکومت کی بے حسی پر درد مندی کے ساتھ اظہار خیال کیا مگر سوائے کڑھنے اور خون اُگلنے کے کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا۔ ہم نے قائداعظم بانی پاکستان کے ارشادات کو پس پشت ڈال کر اپنی کم مائیگی اور کم ظرفی کا ثبوت پیش کیا۔ (شمارہ ۳ ۔۲۰۱۲ء)

۳۹۔ پروفیسر سیّدہ نغمہ زیدی۔ پشاور یونیورسٹی۔ پشاور

اداریہ حقیقت کی نشان دہی کررہا ہے۔ حقیقی اہل قلم کا استحصال اور خون جگر سے چمن ادب کی آبیاری کرنے والوں کی حق تلفی ایک قومی المیہ ہے۔ کاش ارباب اختیار علم وادب کی قرار واقعی سرپرستی کرسکیں۔ (شمارہ ۲ ۲۰۰۲ء)

۲۔ اداریہ فکر انگیز ہے۔ خاص طور پر اردو زبان کے عملی نفاذ کے لیے جو تجویز ہے۔ کاش اس پر عمل درآمد ہوسکے اور ہمارا ایک بہت بڑا قومی مسئلہ حل ہوسکے۔ کیونکہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر ہی ہم ترقی کرسکتے ہیں۔ ((شمارہ ۴ ۲۰۰۲ء)

۳۔ اداریہ انتہائی فکر انگیز تھا۔ قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء کے حوالے سے کیے گئے انکشافات اور حکومتی دعوؤں کی قلعی کھولنے میں آپ نے جس چشم بصیرت سے کام لیا ہے قابل تحسین ہے۔ حقیقت حال یہی ہے کہ ہماری قومی ترجیحات میں تعلیم شامل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یکساں نظام تعلیم نافذ کردیا گیا۔ تو لیڈروں کو اُن کے سیاسی جلسوں میں زندہ باد کے نعرے لگانے والے ان پڑھ اور بے شعور سامعین نہ مل سکیں گے۔ سیاسی آزادی حاصل کیے بغیر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا محض ایک خواب ہی ہے۔ خدا کرے کے ذہنی پستی اور غُلامی کا یہ دور جلد از جلد ختم ہو۔ اور ہماری قوم بھی علم سے بہرہ مند ہوسکے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۱۰ء)

۴۔ اداریے کی خوشبو سے رسالہ مہک رہا ہے۔ خدا ہمیں فیض احمد فیض جیسے ادبی سرمائے سے

مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۱۰ء)

۵۔ اداریہ کی جامعیت اور فکر انگیزی اہلِ نظر کو جگانے کے لیے کافی ہے۔ محترم جاوید اقبال کا یہ شکوہ کہ ”ترک اپنے سیاسی نظام کو سیکولر جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔ صرف پاکستان نے اپنے آئین کو اسلامی جمہوریہ کا نام دے رکھا ہے۔“ پاکستانی دانشوروں اور سچے مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ آپ نے اداریہ میں جو تاریخی حوالہ جات پیش کیے ہیں وہ نئی نسل کی رہنمائی کے لیے چراغ راہ ہیں۔ یقیناً اِن سے ڈاکٹر جاوید اقبال کے لیکچر پر پیدا ہونے والے تحفظات اور شکوک و شبہات کو دُور کرنے میں مدد ملے گی۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۶۔ حسب سابق اداریہ ذریعہ تعلیم اور قومی تشخص اذہان کو دعوت فکر و تدبر دے رہا ہے۔ مگر اس دورِ انتشار میں یہ تو بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔ جب تک ملک و ملت کے مفاد میں فیصلے کرنے والا کوئی درویش مسندِ حکومت پر جلوہ افروز نہ ہوگا۔ زبان و تعلیم کے مسائل حل نہ ہونگے۔ (سالنامہ ۔۲۰۱۱ء)

۷۔ قومی زبان پر آپ کا مقالہ افتتاحیہ آپ کی وطن سے محبت، قومی زبان کی بے قدری پر درد مندی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ قومی زبان کے مقدمے میں آپ نے جس طرح دلائل و براہین کے ساتھ بات کی ہے اُس سے ہر محبّ وطن شہری کو ادراک حاصل ہوا ہے۔ آئین و قانون کی رُد سے قومی زبان کا نفاذ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہو جانا چاہیے۔ مگر کیا کیجیے کہ اس مملکت خداداد میں قومی زبان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس محنت شاقہ کا اجر عطا فرمائے۔ اور مقتدرہ قومی زبان کو اس سلسلے میں اہم قدامات کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(شمارہ۳ ۔۲۰۱۲ء)

۴۰۔ ثناء اللہ اختر۔ راولپنڈی

الاقرباء کے شمارہ نمبر۴ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء میں سید منصور عاقل صاحب نے ادرایہ میں ادبی دنیا میں ”مافیا“ کے بڑھتے ہوئے عمل دخل واثر ورسوخ کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ ان طاقت ور عناصر کے باعث مختلف قومی اعزازات دیئے جانے یا علوم و فنون کے فروغ کے لیے قائم

اداروں میں تقرریوں میں من پسند افراد کو نوازا جا رہا ہے اور اس طرح سرکاری عہدوں کے حامل افراد ہی مذکورہ اعزازات حاصل کرنے کے مستحق اور مناصب پر فائز ہونے کے اہل قرار پاتے ہیں۔ منصور عاقل صاحب نے جن امور کی نشاندہی کی ہے اس طرف ارباب اقتدار کو سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے اور علمی و ادبی کاوشوں کی پذیرائی کرنے کے لئے پورے حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جو صاف ''شفاف'' منصفانہ اور کسی شک و شبہ سے بالا ہو۔ ان کا فرض ہے کہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ تحقیق اور تخلیق کے معیار پر اترنے والی کتابوں کے موئف اور مصنف ہی قومی اعزازات حاصل کر سکیں اور صرف باصلاحیت اور اہلیت کے حامل اور علم و ادب کی خدمت سرانجام دینے والے ہی علمی اداروں کے سربراہ بن سکیں۔ (شمارہ ۲۰۰۵۱ء)

۲۔ سہ ماہی ''الاقرباء'' اسلام آباد کے شمارہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۷ء میں الاقرباء کے صدر نشیں منصور عاقل صاحب کا اداریہ جس میں انہوں نے معروف قلمکار قرۃ العین حیدر کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے ادبی اور علمی خدمات کا تذکرہ کیا ہے اپنی جامعیت اور تجزیاتی معیار سے متصف ہونے کے علاوہ فکر انگیز ہے تحقیق و تدقیق کی دعوت بھی دیتا ہے، وہ بجا طور پر پُر امید ہیں کہ نسل نو کے اہلِ قلم روشنیوں کے اُس ورثہ کو جو قرۃ العین انہیں سپرد کر گئی ہیں سنبھالتے ہوئے تسلسل کے ساتھ آگے بڑھ کر نئی وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار کرینگے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۸ء)

۴۱۔ پروفیسر ڈاکٹر سیّد محمد عارف۔ بہاولپور

اداریے میں آپ نے ادبی تحقیق کے معیار و مسائل پر بڑی غور طلب باتیں کی ہیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کو سائنس کے علاوہ ادبی تحقیق کو لائق توجہ سمجھنا چاہیئے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۸ء)

۲۔ آپ کے اداریے مجلّے کی روح ہوتے ہیں اور اردو اور نظریہ پاکستان کے لیے آپ کے دردِ دل کے عکاس۔ اب جناب جسٹس جاوید اقبال نے نظریۂ پاکستان کے متعلق جو طرزِ فکر اختیار کیا ہے اس کا آپ نے نہایت جامع اور مدلل جواب دیا ہے کہ اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ عظیم لوگوں کی اولادیں بعض اوقات احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان کے فکر و فلسفہ کی عظمت تک نہیں پہنچ سکتیں تو ان کی مخالفت شروع کر دیتی ہیں کہ شاید اس طرح ان کا قد بڑھ

جائے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۴۲۔ پروفیسر پروین طارق۔ راولپنڈی

اداریہ میں بیان کردہ پُر مغز خیالات کو میں نے اپنے دل کی آواز سمجھا ہے۔ کاش ’’فکر اقبال کی عصری معنویت‘‘ کے تحت بیان کردہ خیالات جو آج وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ نہ صرف پاکستان میں بسنے والوں کے لیے بلکہ دیار غیر میں مقیم مسلمانوں کی بھی دل کی آواز بن جائیں اور ہم سب متفقہ طور پر عمل پیرا ہو جائیں۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۹ء)

۴۳۔ پروفیسر قدرت اللہ شہزاد۔ بہاولپور

’’قرطاس وقلم کی آزمائش‘‘ نہایت عمدہ اداریہ ہی نہیں بلکہ اعلیٰ تنقیدی نثر پارہ بھی ہے۔ اس کے بعض مندرجات سے مجھے کامل اتفاق ہے۔ (شمارہ ۳ ۲۰۰۱ء)

۴۴۔ آغا نور محمد پٹھان۔ کراچی

میں خاص طور پر آپ کے لکھے اداریے کی تعریف ضرور کروں گا۔ ’’ادب میں سرقہ وخیانت کے مسائل‘‘ میں آپ نے جو ملک میں کاپی رائٹ ایکٹ کی اہمیت اور موجودہ حالت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس دور میں جب دنیا میں صرف ٹریڈ مارک کے ایک چھوٹے سے نشان یا کمپنی کا صرف نام دوسری جگہ استعمال کرنے سے بڑے بڑے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اور جرمانے کی رقم کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے وہاں اس بیچارے ادیب کے لئے کوئی داد فریاد تک بھی نہیں ہوتی جس کی پوری عمر کی ادبی جمع پونجی کوئی چرا کے لے جائے۔ آپ نے سچ کہا ہے کہ ۱۹۶۲ء کا کاپی رائٹ قانون آج بھی اپنی تمام تر بے حرمتی کے باوجود باقی وقائم ہے قلم کی حرمت برقرار رکھنی چاہیئے اور کاپی رائٹ ایکٹ کو زیادہ فعال اور طاقت کے ساتھ قابل اطلاق بنایا جائے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۲ء)

۴۵۔ مضطر اکبر آبادی۔ راولپنڈی

اردو میں غیر ملکی زبانوں سے تراجم ’’اداریہ‘‘ وقت کی اہم ضرورت کا تقاضا پورا کرتا ہے۔

(شمارہ ۴ ۲۰۰۲ء)

۲۔ مغرب میں اردو زبان وادب کے امکانات پر اداریہ اردو کی ترویج وترقی کا صحیح معنوں میں

عکاس و آئینہ دار ہے۔ (شمارہ ۴۔۲۰۰۴ء)

۳۔ آپ نے اداریہ میں جو نکتہ اٹھایا ہے۔ وہ فی الواقع لائق توجہ ہے۔ آج کے دور میں ہمارا ادب انحطاط کے جس مرحلہ سے گزر رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نثری ادب کا جو حال ہے وہ تو ہے ہی لیکن شعری ادب کی صورت حال بھی خاصی تشویشناک اور مایوس کُن ہے اور اس کی نمایاں وجہ ہماری علمی و فنی کم مائیگی ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال بہت کم حضرات کو آتا ہے قواعد سے عدم واقفیت کا سلسلہ عام ہے۔ تذکیرو تانیث کا معاملہ بھی دگرگوں ہے، ناموزوں اور وزن سے گرے ہوئے اشعار اکثر رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ اول تو رسائل و جرائد ہیں بہت کم اور جو ہیں ان میں اجارہ داری کا سلسلہ قائم ہے کسی تحریر کو شائع کرتے وقت معیار کی طرف توجہ کم دی جاتی ہے شخصیت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور ہم سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ہمیں زیب نہیں دیتا۔ (شمارہ ۳۔۲۰۰۶ء)

۴۶۔ سلطان صبروانی۔ راولپنڈی

آپ کا اداریہ حسب معمول پھر توجہ طلب ہے۔ ادب اور نظریہ ضرورت کے عنوان سے آپ نے جس ادبی منظر سے نقاب اٹھایا ہے اور صورت حال کو نہایت واضح طور پر جس طرح بے حجاب کیا ہے واقعی یہ ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ خداوند عظیم آپ کے ذہن و قلم کو جرأت عطا فرماتا رہے اور آپ اردو ادب کے متعلق مزید تاریک گوشوں کو اہل علم و ذی شعور صاحبان قلم کے سامنے لاتے رہیں۔ اور صاحبان اقتدار بھی اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں۔ (شمارہ ۳۔۲۰۰۳ء)

۴۷۔ محمود رحیم۔ اسلام آباد

موجودہ شمارے میں آپ کا تحریر کردہ اداریہ ''ادب اور نظریہ ضرورت'' بڑی اہم تحریر ہے جس میں آپ نے ان سچائیوں اور حقیقتوں کا ذکر کیا ہے جنہیں آج کل گوشۂ لب پر لانے کی بجائے اکثر مصلحت کی صلیب پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ عہد کا تخلیق کار بھی خود غرضی، لالچ، ہوس اور ترغیب کا شکار ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانیت کی بنیادی قدریں جن کا تحفظ ادب کا وظیفہ ہے، خود تخلیق کاروں کے کردار میں مفقود ہیں۔ (شمارہ ۳۔۲۰۰۳ء)

۲۔ اس دفعہ بھی آپ نے اداریہ ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں'' لکھ کر فکر کے بہت سے گوشے وا کئے ہیں جن پر تخلیق کاروں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ آپ کا ہر اداریہ آپ کی کمال ژرف نگاہی اور فکری عمق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ (شمارہ ۴۔۳۔۲۰۰۳ء)

۳۔ الاقرباء کا شمارہ برائے جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۸ء موصول ہوا۔ اس دفعہ کا اداریہ ''نظام تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات'' نہایت قابل توجہ ہے، خصوصاً موجودہ نظام تعلیم کے حوالے سے کہ جس کے نتائج نے ہمیں ۶۱ سال میں ثمر مند کرنے کی بجائے مزید لاچار و غریب کر دیا ہے۔

(شمارہ ۴ ۲۰۰۸ء)

۴۸۔ سرور انبالوی۔ راولپنڈی

''مافیا'' کے عنوان سے اس مرتبہ کا اشاریہ یا اداریہ اتنا فکر انگیز اور حقیقت کا صاف و شفاف آئینہ ہے کہ اس میں ہماری قومی و ملی ستاون سالہ تاریخ اپنی تمام تر لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ جلوہ گری کرتی نظر آتی ہے۔ آپ نے اس ''نوحہ'' میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کی توفیق آج تک ہمارے کسی قومی قلمکار کو نہیں ہوئی۔ (شمارہ ۱۔۲۰۰۵ء)

۴۹۔ پروفیسر سہیل اختر۔ بہاولپور

جنوری ۲۰۰۶ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اداریئے کے لیے غالب کے اس مصرعے سے بہتر عنوان نہیں ہو سکتا تھا۔ ''کہ ہو گئے مرے دیوار و در درودیوار'' اس مصرعے کا انتخاب آپ کی وسعت مطالعہ اور حسنِ تعقل کی دلیل ہے۔

۲۔ اپریل۔ جون ۲۰۰۷ء کا موقر ''الاقرباء'' پیش نظر ہے۔ نفاذ اردو کے سلسلہ میں آپ کا اداریہ ''اردو۔۔۔ مخالفوں منافقوں کے درمیان'' آپ کی بصیرت اور جرأت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۷ء)

۳۔ اداریے میں آپ کی تجاویز نمبر ۳ اور ۴ نہایت مناسب اور بروقت ہیں۔ بین السطور ان تجاویز کی شانِ نزول شاید وہ افسانے ہیں جو وطنِ عزیز میں پی ایچ ڈی مافیا کے باعث گردش کر رہے ہیں۔ یہ تاثر عام ہے کہ بڑے شہروں میں پی ایچ ڈی کے امیدوار لاکھ ڈیڑھ لاکھ خرچ کر کے

ماہرین ادب سے مقالے لکھوا کر اپنے سینے پر ڈاکٹر کا تمغہ سجا لیتے ہیں۔ میں نے جس مافیا کا اوپر ذکر کیا ہے، یہ وبا ہندوستان میں بھی خاصی عام ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۰۸ء)

۴۔ ہر شمارے کی طرح اس بار بھی آپ کا اداریہ نہایت مناسب بروقت اور ظلم و جبر کے خلاف ایک احتجاج خفی کا درجہ رکھتا ہے۔ جس خوبصورتی اور سلیقے سے آپ نے اردو کا مقدمہ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اللہ آپ کو اس کی جزا دے۔ پاکستان میں اردو کے متعدد رسالے شائع ہو رہے ہیں لیکن بہت کم مدیران کرام نے اس موضوع کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۹ء)

۵۰۔ عرش ہاشمی۔ اسلام آباد

سالنامے کے آغاز میں آپ کا تحریر کردہ اداریہ بعنوان ''کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار'' تاریخی زلزلے کی تباہ کاریوں کے تناظر میں نہایت پُر اثر تحریر ہے اور اس خوبصورت مجلّے کا نہایت حسین آغاز بھی۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۶ء)

۵۱۔ سید انتخاب علی کمال۔ کراچی

اداریہ ''تعلیم اور نظام و نصاب کے مسائل'' میں آپ کا ارشاد بجا ہے کہ اردو زبان کے بارے میں ہمیں اپنا رویہ بہتر کرنا چاہیے۔ انگریزی کو اختیاری اور اردو کو سرکاری و قومی زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۶ء)

۲۔ اداریہ ''زبانوں کا بین الاقوامی سال ۲۰۰۸ء'' اداریہ کا لب و لہجہ نہایت مؤثر اور اندازِ تحریر ستھرا ہے۔ اداریہ میں دل نشین صدائے احتجاج احسن قدم ہے اردو علمی و فنی اعتبارات سے اس پورے خطہ کی ممتاز اور شیریں زبان ہے جس کو اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو نے ''ہندوستانی'' لکھ کر اردو بولنے اور لکھنے والی اقوام کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ اردو کو محض ہندوستان کے حوالے سے ''ہندوستانی'' یا پاکستان کے حوالے سے ''پاکستانی'' لکھنے کے بجائے صرف ''اردو'' لکھنا درست قدم ہوگا۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۸ء)

۵۲۔ مشتاق شبنم۔ کراچی

اداریہ ''ادب کا نوبل انعام۔ معیار اور ملحوظات'' پر جس وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے وہ

ایک حقیقت ہی نہیں یورپ کے تنگنائے ذہن کی تفصیلات بھی فراہم کرتی ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۷ء)

۵۳۔ غالب عرفان۔ کراچی

"ادب اور اظہار رائے کی آزادی" میں جن نکات پر بحث کی گئی ہے انہیں میں "الاقرباء" کے منشور کے نکات کہوں تو شاید بے جا نہیں۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۸ء)

۵۴۔ ناصر زیدی۔ لاہور

سب سے پہلے میں نے پوری توجہ اور خصوصی دلچسپی کے ساتھ اداریہ پڑھا کہ اداریہ ہی کسی مدیر کا اصل چہرہ ہوتا ہے۔ آپ کا اداریہ اردو، ناول و افسانہ کی "لیجنڈ" قرۃ العین حیدر پر ایک جامع مضمون لگا۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۰۸ء)

۵۵۔ مہناز خالد۔ (یونیورسٹی آف الاباما، امریکہ)

آپ کا اداریہ اُردو کا پرچم سر بلند کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہند میں تقریباً ۷/۸۰ فیصد اردو بولی جاتی ہے مگر اُسے ہندی کا لبادہ اُڑھا دیا گیا ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۸ء)

۵۶۔ عزیز احسن۔ اسلام آباد

اداریہ حسب معمول فکر انگیز بھی ہے اور آپ کی لسانیاتی باخبری کا آئینہ دار بھی، کاش ارباب بست و کشاد اس خاص مسئلے پر سنجیدہ ہو سکیں۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۸ء)

۵۷۔ جمیل یوسف۔ مری

الاقرباء کے اداریے، الاقرباء کی ایک اور نمایاں امتیازی خصوصیت ہیں۔ میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ قومی اہمیت کے یہ شذرے الاقرباء سے پہلے کسی ادبی جریدے میں نظر نہیں آئے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

۵۸۔ ناصر شمسی۔ اقبال اکیڈمی منرو، نیوجرسی (امریکہ)

آپ کا اداریہ "نظام تعلیم کے تہذیبی و ثقافتی مضمرات" وطن عزیز میں تعلیمی نظام کی بدحالی

و پژمردگی اور ارباب اقتدار کی بے حسی و بے بضاعتی کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ نے بجا فرمایا ہے کہ نظام تعلیم کی جامعیت ہی افراد کی صلاحیتوں کو نشو ونما اور متوازن ارتقاء کی سمت مہیا کرتی ہے۔ قومی تاریخ کے خدوخال سنوارتی ہے بلکہ تہذیبی وثقافتی ورثے کو بھی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

۵۹۔ پروفیسر ڈاکٹر جمیل احمد۔ (صدر شعبۂ اردو۔ یونیوسٹی آف واشنگٹن (امریکہ)

الاقربا کے اداریے سب سے پہلے متوجہ کرتے ہیں ان کے خیالات بلند، موضوعات برمحل اور زبان معیاری ہوتی ہے۔ رسالے کے تحقیقی مضامین میں حواشی اور حوالے دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۰۸ء)

۶۰۔ عبدالقادر حکیم۔ بیلویو، واشنگٹن (امریکہ)

میں مجلّہ کے اداریوں کا اس لیے معترف ہوں کہ وہ انتہائی اہم موضوعات پر جامع، وزنی، جاذب توجہ اور شعور کو جھنجوڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور میں انہیں ملی اصلاحی تحریک کی ایک نمایاں کڑی تصور کرتا ہوں۔ آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ ذمہ دار طبقہ آپ کے اداریوں کی روشنی میں ایک ایسا لائحہ عمل ترتیب دے جس پر گامزن ہو کر زبان، تعلیم اور ثقافت کو وہ مقام عطا کر سکے جو ملک وقوم کی ترقی اور تشخص کے لیے لازمی ہے۔ (شمارہ ۲۰۴۔ ۲۰۰۸ء)

۶۱۔ حمیدہ معین رضوی۔ سرے (برطانیہ)

رسم الخط کے موضوع پر اداریے سے پورا اتفاق ہے۔ دو سال قبل لندن میں رسم الخط کے حوالے سے جو بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی اس میں میں نے مقالہ پڑھا تھا اور مثال دی تھی کہ تُرکوں سے رسم الخط چھین کر انہیں صدیوں پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ (شمارہ ۲۔ ۲۰۰۹ء)

۶۲۔ دُردانہ ثاقب۔ سڈنی۔ آسٹریلیا

زیر نظر شمارہ میں قومی تعلیمی پالیسی پر آپ کا اداریہ ہماری قومی بے حسی کی ایک طویل داستان کی نشاندہی کرتا ہے۔ (شمارہ ۱۔ ۲۰۱۰ء)

۶۳۔ نوید سروش۔ میرپورخاص (سندھ)

اداریہ (قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۰۹ء۔ اہداف و ترجیحات) ایک علم سے محبت کرنے والے دردمند پاکستانی کی آواز ہے۔ اس ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کی تعلیمی حکمت عملی ایسے افراد مرتب کرتے ہیں جو نہ خود اس ملک کے سرکاری تعلیمی اداروں میں پڑھے ہیں اور نہ اُن کی اُولاد۔ کراچی کے کچھ علاقوں کے علاوہ پورے سندھ میں تعلیم کی زبوں حالی دیکھ کر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تعلیمی پالیسی سے اچھے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ نیتوں میں اخلاص شامل ہو۔ (شمارہ ا۔ ۲۰۱۰ء)

۶۴۔ انور معین زبیری مجدّدی۔ ملتان

جناب والا اس حقیقت سے قطع نظر کہ فرزند اقبال نے کیا کہا۔ یہ بھی ایک اس سے بڑی حقیقت ہے کہ آپ نے جس محنت اور لگن کے ساتھ یہ اداریہ لکھا ہے اور اس اداریے میں جو معتبر حوالے یک جا کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اداریے کو لکھنے کے لے آپ کو کتنا پڑھنا پڑا ہوگا۔ کتنے جریدے اور مقالے کھنگالے ہونگے۔ خیر اس طرح یہ تو ہوا کہ فرزندِ اقبال کے ''فرمودات'' کے رد کے حوالے سے ایک بہت نادر دستاویز مرتب ہوگئی جس میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے بہت سے اہم حوالے یک جا کر دیئے گئے۔ یہ آپ کی قومی حمیت کی دلیل ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کارخیر کا اجرِ عظیم عطا فرمائے کہ آپ نے آنے والے دور میں بہتوں کے لیے آسانیاں فراہم کر دیں۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۶۵۔ منظور جونیجو (سیاٹل۔ امریکہ)

آپ کا اداریہ پڑھ کر تصدیق ہوئی اور بہت قلق ہوا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی فکر منفی ہی نہیں تخریبی بھی ہے۔ شاید انھیں اندازہ نہیں کہ یہ اُن کی اپنی شخصیت کے لیے کس قدر ضرر رساں ہے۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۲۔ حاصل انتظار تازہ شمارہ کسی قدر تاخیر سے پہنچا۔ اداریہ حسب معمول ایک کرب کی داستان ہے، آپ اسے مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک تازیانہ بھی۔ اگر میرا بس چلتا اور میں اس کا متحمل ہو

سکتا تو ملک کے مشہور اخباروں میں الاقربا کے اداریوں کو اُجرت دے کر شائع کراتا، تاکہ کثیر لوگ اس درد کو محسوس کر سکیں جو صرف الاقربا کے قارئین کے علاوہ کچھ محبّ وطن اشخاص تک محدود ہے۔

آپ کا اداریہ اس مصرع پر ختم ہوا ہے ”مردے از غیب بروں آید و کارے بکند“ آمین ثمہ آمین۔

ہماری تاریخ گواہ ہے اور یہ سنتے آئے ہیں کہ جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی مصلح اور مرد میداں نمودار ہوتا ہے اور ملت کو شکست و ریخت سے بچاتا ہے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۱۲ء)

۳۔ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ وصول ہوا، شکریہ۔ پروفیسر معین الدین عقیل کے مضمون اور آپ کے اداریہ کو کتب خانوں کی شکل میں علم و ادب کی ناقدری پر مرثیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے غریب الذّہن رہنماؤں کو سیاسی مہم جوئی سے فرصت ملے اور اپنی علمی میراث کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو تو اب بھی نجی کتب خانوں کے تحفظ سے قوم کو مزید نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔ (سالنامہ ۲۰۱۳ء)

۶۶۔ شجاع طلعت۔ بیلی ویو۔ واشنگٹن (امریکہ)

آپ کے اداریے نے ممکن ہے بہت سے قارئین کو چونکا دیا ہو۔ میں نے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کو پڑھا ہے میں جب اُن کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب ”زندہ رود“ پڑھ رہا تھا تو بعض انکشافات پر طبیعت بہت مکدر اور ملول ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی جو قدر و منزلت بھی ہے وہ صرف اور صرف علامہ اقبال سے نسبت کی وجہ سے ہے اگر اس نسبت کو اُن کی شخصیت سے خارج کر دیا جائے تو اُن کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ امید ہے کہ وہ آپ کے اداریہ کو نہ صرف پڑھیں گے بلکہ اس کا خاطر خواہ جواب دیکر اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

(۲) اس شمارہ میں جس موضوع پر اداریہ اور پروفیسر معین الدین عقیل صاحب نے مضمون لکھا ہے میرے نزدیک ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لیے اہمیت رکھتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیثِ مبارکہ پر یقین رکھتا اور عمل کرتا ہے جس کے مطابق علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ (سالنامہ ۲۰۱۳ء)

۶۷۔ محمد طارق علی۔ راولپنڈی کینٹ

اس بار اداریے میں محترم منصور عاقل نے فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کے ان دو حالیہ خطبات کا بڑی ژرف نگاہی سے جائزہ لیا ہے جو ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسلام آباد کی دو معروف جامعات میں ارشاد فرمائے اور جو براہ راست مصور پاکستان حضرت علامہ اقبال کے علاوہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ارشادات اور نظریۂ پاکستان کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہیں بلکہ خود ڈاکٹر موصوف کے اُن مندرجات کی بھی نفی کرتے ہیں جو ان کی کتاب ”آئیڈیالوجی آف پاکستان“ (۱۹۵۹ء) میں شامل ہیں۔

جناب منصور عاقل نے مستند تاریخی حوالے دے کر ان ارشادات کا تجزیہ کیا ہے کہ حضرت علامہ اقبال سرمایہ دارانہ، قومی اور سیکولر جمہوریت کے خلاف تھے کیوں کہ اس تصوّر نے ملوکیت کو جنم دیا تھا جو مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی استحصال کا بنیادی سبب بنا۔ اسی طرح حضرت قائد اعظم نے بھی اپنی کی ایک تقریر میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا تھا کہ ”پاکستان کا آئین قرآن وسنت ہوگا“ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۰ء)

۶۸۔ صابر عظیم آبادی۔ کراچی

زیرِ نظر شمارے میں آپ کا اداریہ ”وطن عزیز میں تعلیم اور نظام تعلیم کی زبوں حالی“ بہت موثر اور پُر درد ہے۔ کاش حکومت وقت اس کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائے۔ (شمارہ ۴۔ ۲۰۱۰ء)

۲۔ آپ کا اداریہ بہت ہی بر مغز اور مربوط ہے۔ قومی زبان کے خلاف سازش ہو رہی ہے اس کا پردہ آپ نے بڑے اچھوتے اور ٹھوس انداز میں چاک کیا ہے۔ اس سازش میں صوبے اور مرکز دونوں شامل ہیں۔ (شمارہ ۳۔ ۲۰۱۲ء)

۶۹۔ مشتاق احمد چوہان۔ (نیویارک۔ امریکہ)

آپ کے اداریے ہمیشہ ہی اہم ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر اداریہ بھی فکر انگیز ہے۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے کہ ”قومیت کے اجزائے ترکیبی میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔“

(سالنامہ۔ ۲۰۱۱ء)

۲۔ تعلیم اور قومی زبان پر الاقرباء کے تمام اداریئے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر میں بااختیار ہوتا تو نہ صرف وزارت تعلیم کے خواجگان بلکہ صدر اور وزیر اعظم جیسے جلیل القدر حضرات کے لیے ان دستاویزات کا مطالعہ لازمی قرار دیتا۔ کیا عنوان ہے جس میں ''شکست و ریخت'' کلیدی الفاظ اس لیے ہیں کہ یہ ہماری قومی حمیت پر مسلسل محیط ہیں اور ہماری قومی حکمت عملی کا ہر شعبہ ان کی زد میں ہے۔ (شمارہ ۴ ۔۲۰۱۱ء)

۷۰۔ منیر الدّین۔ نیویارک (امریکہ)

پروفیسر خلیل طوقّار کا مضمون اور اُن کی کتاب پر تبصرہ پڑھنے کے بعد آپ کا اداریہ پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔ اگر آپ گہری نظر سے جائزہ لیں تو 'حمیت باختہ سفارت کاری' کی جڑیں نوکر شاہی کی اُس تخلیق سے ملتی ہیں جو انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا اقتدار مسلط رکھنے کے لیے کی تھی۔ (سالنامہ۔۲۰۱۲ء)

۷۱۔ قاضی ظہیر محسن اختر گورکھپوری (کراچی)

ادارتی مضمون قومی زبان کی تذلیل ۔۔۔ پڑھ کر بے حد دُکھ ہوا۔ جب ہم خود اپنی زبان کی تحقیر کرینگے تو پھر کون اس کی بقا اور ترویج کا ضامن ہوگا۔

۷۲۔ منیر قریشی۔ (سیاٹل واشنگٹن، امریکہ)

اس مرتبہ سالنامہ کا انتظار کافی صبر آزما رہا۔ مجھ تک پہنچنے میں ایک ماہ لگا۔ پہلی نظر اداریہ پر پڑی اور یہ جان کر بہت حیرت اور اپنی کوتاہ علمی پر افسوس بھی ہوا کہ آج تک مجھے یہ علم ہی نہیں تھا کہ ''بلوچی، پنجابی، شنا/ بلتی، سندھی، سرائیکی، اور اردو پاکستان کی قومی زبانیں ہیں۔'' میں تو آج تک صرف اردو ہی کو قومی زبان تصور کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہمارے عظیم روشن دماغ راہنماؤں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ ہماری علاقائی زبانوں کا لب ولہجہ، تلفظ اور کسی حد تک ہیئت بھی کچھ فاصلہ کے بعد بدل جاتی ہے تو انھیں مجوزہ تعداد میں اضافہ کرنا ہوگا۔ دوراندیشی کا تقاضہ ہے کہ ابھی سے ان سب زبانوں کو قومی زبان تسلیم کر لیا جائے اور ایوان بالا اور ایوان زیریں میں ہر نمائندہ ''اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ'' الاپ کر ملک وقوم کے وقار میں اضافہ فرمائے۔ یوں ہی پاکستان کا نام چہار

دانگ عالم میں گونج رہا ہے۔ اس کے تاج میں سرخاب کا ایک پر اور سہی۔ (شمارہ ۳ ۔ ۲۰۱۲ء)

۷۳۔ عبدالسلام المکی (نگارڈ، اوریگون، امریکہ)

حاصل انتظار سالنامہ بہ ادائے باد بہاری وصول ہوا، شکریہ۔ کاش آپ کا خامۂ آتش بجاں جو اداریوں میں محبانِ وطن کو دعوت فکر و عمل دینے اور بے حس معاشرہ کے ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کے لئے وقف ہے، زبان و تہذیب دشمن عناصر کو جلا کر خاکستر کر دے اور اس خاک کے بطن سے ایسے انسان پیدا ہوں جو قوم و ملک کو شناخت عطا کر سکیں۔

اللہ آپ اور آپ کے قبیلہ کی ہمت، استقلال اور حریت فکر و نظر کو دوام بخشے، اور آپ کی کوششوں کو بار آور فرمائے۔ آمین۔ جو لوگ حکومت کے ایوانوں میں غلط انگریزی میں خطاب کرتے ہیں انہیں اتنی اردو کب آتی ہوگی کہ وہ آپ کے اداریوں کو سمجھ سکیں۔ بالفرض اگر وہ سمجھ بھی رکھتے ہوں تو بچاروں کے پاس تخریب کاری سے وقت ہی کہاں بچتا ہوگا۔

۷۴۔ محمد رفیع اللہ۔ (نیو جرسی۔ امریکہ)

''ایک یا آٹھ قومی زبانیں'' پر اداریہ نے چونکا دیا۔ بدقسمتی سے وطن عزیز سے المناک خبروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ Information Age کی بدولت ہر بُری خبر پلک جھپکنے میں ہم تک پہنچتی ہے اور دل کو دکھی کر جاتی ہے۔ لیکن آئین میں اس (مجوزہ) اہم تبدیلی کے بارے میں نہ کوئی خبر سنی اور نہ ہی کوئی گفتگو۔ دعا ہے کہ ہمارے حکمران اس تبدیلی کے منفی اثرات کو جانیں اور اس اقدام سے باز رہیں۔ (شمارہ ۳ ۔ ۲۰۱۲ء)

۷۵۔ جمشید اقبال۔ بہاولپور

سالنامہ ۲۰۱۲ء میں اداریہ ''ایک یا آٹھ قومی زبانیں۔۔ عقل و تدبّر کی آزمائش۔۔۔ دل کی آواز ثابت ہوا۔ (شمارہ ۴ ۔ ۲۰۱۲ء)

ڈاکٹر انور سدید

”کئی برس پہلے کی بات ہے، اسلام آباد میں چند اہل درد نے قوم کی تہذیبی، تمدنی اور علمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ایک فکری ادارہ ”الاقرباء فاؤنڈیشن“ کے نام سے قائم کیا جس کے اراکین نے تعاون باہمی کے تحت اشتراک عمل کا ثبوت دیا اور کئی مثبت منصوبوں پر کسی نمود و نمائش کو خاطر میں لائے بغیر کام شروع کر دیا۔ الاقرباء فاؤنڈیشن کے صدر سید منصور عاقل حکومت پاکستان میں متعدد اونچے عہدوں پر اعلیٰ خدمات انجام دے چکے ہیں۔ لیکن ان کا بنیادی تشخص ان کی شاعری سے قائم ہوا ہے۔ نظم و نثر کی مختلف اصناف میں ان کی انفرادیت تسلیم کی جاتی ہے۔ گیارہ سال قبل جناب منصور عاقل نے اردو ادب کی خدمت اور قومی زبان کی توسیع و ترقی کے علاوہ سرکاری سطح پر اس کے نفاذ کے لیے ایک سہ ماہی رسالہ ”الاقرباء“ جاری کیا۔ جس کا نصب العین تو فاؤنڈیشن کے بنیادی مقاصد میں کامیابی کا حصول ہی تھا لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے ”ادب“ کو ایک فعال وسیلے کے طور پر قبول کیا گیا اور سہ ماہی ”الاقرباء“ کو تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب قرار دیا گیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دنیا کے بے شمار ادیبوں نے سید منصور عاقل کے ساتھ تعاون کیا اور ”الاقرباء“ کو اپنی ایسی تخلیقات سے سرفراز کیا جو اس فاؤنڈیشن کے مقاصد میں کامیابی کی راہ ہموار کر سکتی تھیں اور ان کی اشاعت سے اردو ادب کے فروغ و ارتقاء کا فریضہ بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔“ (ماخوذ)

مصنف کی دیگر مطبوعہ کتب و تحقیقی مقالات

۱۔ ’حرف بہ حرف‘ (تنقیدی و تحقیقی مضامین) ۱۹۸۱ء
۲۔ ’برگ سبز‘ (ادبی تحقیق و سوانح) ۱۹۹۲ء
۳۔ ’گہوارۂ سخن‘ (شعری مجموعہ) ۱۹۹۳ء
۴۔ ’حرفِ محرمانہ‘ (شخصیت فکر و فن) ۱۹۹۴ء
۵۔ ’گلاؤٹھی‘ (دوآبۂ گنگ و جمن میں واقع بستی کے اہلیان کا ۱۹۹۸ء
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مزاحمتی کردار۔ تحقیق)
۶۔ ’دبستانِ قابل‘ (سوانح۔ انتخابِ کلام۔ تنقید) ۲۰۰۰ء
۷۔ ’مبارک نامہ‘ (راولپنڈی ڈویژن میں فارسی گو شعراء کا انتخاب کلام) ۱۹۷۲ء
۸۔ ’خامہ خونچکاں اپنا‘ (راولپنڈی ڈویژن کے شعراء کا رزمیہ کلام) ۱۹۶۶ء

مقالات (اردو)

۹۔ شہاب دہلوی۔ شخصیت اور فن (تحقیق و تنقید)
۱۰۔ ’قومی تعمیرِ نو میں اخبارات کا کردار‘
۱۱۔ ’قومیت اور بین الاقوامیت‘
۱۲۔ ’پاکستان میں ثقافتی یک جہتی کے مسائل‘
۱۳۔ ’برصغیر میں مغل عہد کے دوران ثقافتی ترقی‘

مقالات (انگریزی)

۱۴۔ **Role of Public Relations in a Democratic State**
۱۵۔ **Archival Management in Pakistan**
۱۶۔ **Literature and Journalism- A comparative Study**
۱۷۔ **Constitutional Evolution in Pakistan**
۱۸۔ **Democracy and Electroral System in Pakistan**
۱۹۔ **Sir Syed as Leader of Yesterday and Today**
۲۰۔ **Allama Shibli Nomani**